''چہارسُو''

...... نجات دہندہ ......

(ناول)

'نجات دہندہ' کا کلیدی موضوع ہندوسماج میں ہزاروں سالوں سے چلی آ رہی ذات پات کی تفریق ہے جس نے دیش کو کھوکھلا کر رکھا ہے، سماج کو بانٹا ہے اور ایک انسان کو دوسرے انسان سے جدا کر دیا ہے۔ یہ ناول قدیم متبرک شہر بنارس کے تناظر میں قلمبند کیا گیا ہے جہاں ہر ہندو مرنے کی تمنّا کرتا ہے۔ روایت ہے کہ مرکر یہاں جلائے جانے سے انسان کے لیے سورگ کے دروازے کھلتے ہیں۔ جنت کے دروازے کی کنجی ڈوم قبیلے کے ہاتھ میں رہتی ہے جو مُردوں کو جلاتی ہے مگر خود اس قبیلے کے افراد کو چمار سے بھی کم پایہ اور قابل نفرین سمجھا جاتا ہے۔ اس ناول کا اُولوالعزم ہیرو دیواکر بھی عمر بھر اسی برائت کا شکار ہوتا ہے، سکول اور سماج میں طعنے مہنے سہتا ہے مگر تعلیم حاصل کرنے کی اس کی لگن کو کوئی کم نہیں کر پاتا۔ اس کی خوش نصیبی یہ ہے کہ اسے ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی مربّی مل جاتا ہے جو اس کی زندگی سنوارنے میں مدد کرتا ہے جب تک وہ انجینئر نہیں بن جاتا اور ایک اچھی کمپنی میں ملازمت نہیں پاتا۔ اس کی ترقی میں سب سے زیادہ یوگدان اس کے بڑے بھائی بھاسکر کا ہوتا ہے جو والد کی عدم موجودگی میں رات دن جھلس کر مردہ جلانے کے کام میں جٹا رہتا ہے مگر اپنے چھوٹے بھائی کو اس حبس زدہ ماحول سے دور رکھتا ہے یہاں تک کہ وہ کڑی محنت، آلودہ دھوئیں دار فضا اور مسلسل تپن کی وجہ سے جوانی ہی میں راہِ عدم اختیار کرتا ہے۔ اپنے خاندان کو بچانے، ان کو بنارس سے باہر نکالنے اور ان کی زندگی سنوارنے کی دیواکر کی کوشش کچھ حد تک کامیاب تو ہوتی ہے مگر وہ اپنے بڑے بھائی کو نہیں بچا پاتا۔ ناول کا ایک المناک پہلو یہ بھی ہے کہ چنڈی گڑھ میں جہاں دیواکر اپنی شناخت کو چھپا کر انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرتا ہے، ایک اونچی ذات کی لڑکی یامنی اسے بہت چاہتی ہے لیکن جب اسے دیواکر کی اصلیت معلوم ہوتی ہے تو مخمصے میں پڑ جاتی ہے اور پھر دونوں زندگی کا سفر اکیلے ہی طے کرنے کا عزم کر لیتے ہیں۔ ناول میں موڈرن شہر چنڈی گڑھ اور اس کے آس پاس کی منظر نگاری بھی بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔ شہر، جھیل، یونیورسٹی کیمپس، روز گارڈن اور پی جی آئی ہسپتال وغیرہ کی باریک بینی سے تفصیل دی گئی ہے۔ پاس پڑوس میں واقع پنجور گارڈن اور کسولی کا ذکر بھی آچکا ہے۔

ناول کا دوسرا قطب ہزاروں سال پرانا بنارس کا شہر ہے جس کے چپے چپے کی جانکاری دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ کاشی میں بہہ رہی گنگا اور اس کے گھاٹ، بنارس کی صبح اور شام اور گھاٹ پر منعقدہ آرتی کا سماں بڑی دقیقہ ریزی سے بیان کیا گیا ہے۔ لاشوں کا کاروبار، مُردوں کے جلانے کے منظر، کریا کرم کے لیے منہ مانگے دام وصول کرنا، غریبوں کی ادھ جلی لاشوں کو گنگا میں پھینک دینا نیز گنگا کو آلودہ کرنا قاری کے دل کو دہلانے کے لیے کافی ہیں۔ بنارس کے ڈوم قبیلے کو خصوصاً مرتکز کیا گیا ہے۔ ان کے رہن سہن، سماجی برائت، مندروں میں ان کے داخلے پر پابندی، ان کے راجہ کی ٹھاٹ باٹ، عام ڈوموں کا استحصال، ان کے روزمرہ کام کا جوکھم، ضعیف الاعتقادی، شراب نوشی اور منشیات کا عام استعمال، ناخواندگی، لڑکیوں کی تعلیم کی فراموشی اور بچپن میں ہی ان کی شادی کرنا، عورتوں کو کسی محرم کے بغیر گھر سے باہر جانے پر پابندی، بیوگی اور جسم فروشی، ان سب پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قاری حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی ہمارے ملک میں ایسے جزیرے ہیں جہاں قدامت پرستی اور توہم پرستی کا بول بالا ہے۔ ناول میں سارناتھ اور بنارس ہندو یونیورسٹی کا بھی ذکر آیا ہے۔ 'نجات دہندہ' میں کچھ ضمنی موضوعات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جیسے سوچھ بھارت ابھیان، کسانوں کی خودکشی، لَو جہاد، تعلیمی پروجیکٹس کا دھندا اور جسم فروشی وغیرہ۔

ناول کی زبان سادہ اور سلیس ہے، بعضے طنزیہ لہجے کا استعمال بھی ہوا ہے۔ پلاٹ کی بُنت میں کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتی، مکالمے چست اور برمحل ہیں اور سب سے بڑھ کر منظر نگاری بڑی ہنروری سے کی گئی ہے۔ مختلف مقامات کے بارے میں پڑھتے پڑھتے قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود یہ منظر دیکھ رہا ہے۔ جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے مرکزی کردار دیواکر اپنی فہم و فراست، دانائی اور مضبوط ارادے کے باعث نمایاں طور پر ابھرتا ہے البتہ بھاسکر کی قربانی کا بھی کوئی جواب نہیں۔ یامنی کو ایک طرف اپنی محبت پر پوری طرح اعتماد ہے جس کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہوتی ہے مگر دوسری طرف وہ زمینی حقیقت سے آنکھیں چُرا نہیں پاتی اور اپنے والدین سے بغاوت کرنے سے گریز کرتی ہے گو پھر اس بارے میں بیچ کا راستہ نکالتی ہے کہ دیواکر کی طرح وہ بھی ناکتخدا رہنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ دیگر کردار بھی ناول کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں۔

دیپک بُدکی

اشاعت: ۲۰۲۰، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویرالحق

☆

اتنا آساں نہیں مسند پہ بٹھایا گیا میں
شہرِ تہمت تری گلیوں میں پھرایا گیا میں

انہیں پتہ بھی نہیں وہ تمام ہو گئے ہیں
ترے فقیر کا قصہ تمام کرتے ہوئے

میں اس لیئے بھی بہت چیختا کراہتا ہوں
کہ تھک نہ جائے کوئی مجھ پہ ظلم ڈھاتے ہوئے

لگے ہوئے ہیں مجھے توڑنے بنانے میں
مجھی پہ کیوں ہوس کوزہ گر نکالتے ہیں

کچھ اس لیئے بھی ہمارا نشانہ بنتا ہے
ہمارے سامنے آکر زمانہ بنتا ہے

ہمارے جسموں کی اینٹیں لگائی جاتی ہیں
ہمیں ٹھکانے لگا کر ٹھکانہ بنتا ہے
مری سزا بھی یہی ہے مری جزا بھی یہی ہے
دکھی نہ ہو کہ مرا دل دکھانا بنتا ہے

ہمیں اجاڑنے والوں کو یہ نہیں معلوم
کہ اپنے کام پہ نشوونما لگی ہوئی ہے

مرا چہرہ نہ ہوتا تو یہ خلقت
کہاں ملتی سیاہی قبلہ گاہی

یہ ہم کو کوئے ملامت میں کھینچنے والے
ہمارے ساتھ محبت زیادہ رکھتے ہیں

میسر آئی اسے ایک لفظ کی کالک
مجھے مٹا کے زمانے کے ہاتھ کیا آیا

یہاں کے تہمتیوں کو یقیں دلاتا چل
میاں یہ کوئے ملامت ہے لڑکھڑاتا چل
قدیم سے ہے یہی سلسلہ فقیری کا
کوئی سنے نہ سنے توصدا لگاتا چل

فقیہہِ شہر کو معلوم ہونا چاہئے تھا
کہ داؤ پیچ نہیں جانتی طریقتِ عشق

سگِ آواہ کی آواز میں آواز ملا
رات کو رات سمجھ وقت گزاری نہ سمجھ

اب رکھنا ہو گا ہاتھ پہ دل کی بجائے سر
اتنا سمجھ چکا ہے یہ مولائی کم سے کم

ہم فقیروں کے ہیں آدابِ تکلم ہی کچھ اور
جب ہمیں بولنا ہو رقص کناں بولتے ہیں

اپنے غصے کو اگر ضبط کر لوں تابش
میری مٹھی میں جو پتھر ہے وہ نیلم ہو جائے

ناطہ توڑنے والو تم سے جنگ نہیں کرنے کے ہم
تم بیٹھو ہم شعبِ ابی طالب سے ہو کر آتے ہیں

دنیا تو اپنے ہونے کی جو بھی دلیل دے
ہم لوگ اس کو غیر ضروری سمجھتے ہیں

قرطاسِ اعزاز
عباس تابش
کے نام

ترے سوا کوئی ہوتا تو اس سے کہتے ہم
ہمارا کام ہے تجھ سے لہذا تو کرے گا

کھڑا ہوا تھا مرے سامنے سگِ درویش
خیال آیا مجھے ایک دم یہ میں تو نہیں
یہ کون ڈھونڈتا پھرتا ہے سبز چڑیوں کو
فنا کے باغ بتا صبحدم یہ میں تو نہیں

عطا ہے جس کی وہی مجھ میں بولتا ہے
سو میں بھی میں نہیں ہوتا غزل سناتے ہوئے

دعائیں مانگنے والو ہمارے ساتھ چلو
ہم آج رات ندی میں چراغ چھوڑیں گے

میری تنہائی مکمل ہو گئی
اندرونے میں خدا ہے اور میں

تو خدا ہونے کی کوشش تو کرے گا لیکن
ہم تجھے آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیں

یہ جو چہرے ہیں یہاں چاند سے چہرے تابش
یہ مرا عشق مکمل نہیں ہونے دیں گے
عشق نے ظلم کمانے کی اجازت ہی نہ دی
ورنہ یہ شہر ستم ایک نوالہ تھا مرا

چھکتے پاؤں سے چلتے ہوئے یہ روشن لوگ
گزر رہے ہیں محبت کو عام کرتے ہوئے

نئے سرے سے تعلق نہیں بنائیں گے ہم
جہاں سے ٹوٹ گیا تھا وہیں سے جوڑیں گے

میں جس کے ہجر سے محظوظ ہونا چاہتا ہوں
مجھے وہ شخص میسر ہے کیا کیا جائے

زندگی بھر میں ہمیں اک عشق کرنا تھا کیا
زندگی بھر میں ہمیں اک بار ہونا تھا ہوئے

یہ کوئی پھول نہیں ہے کہ شاخ پر آئے
میاں یہ ہجر ہے رخسار میں نمو کرے گا
یہی تو مجھ سے غلط ہو گیا محبت میں
بنی نہ بات تو میں اہتمام کرنے لگا

کیا ہمارے عشق کی کچھ قدر کر پائے گا تو
سوچتے ہیں ہم تجھے اپنا خدا دیتے ہوئے

بچھڑ کے تم سے کسی شاخ پر بھی پھول نہ تھا
ہم اصل سے تو گئے تھے مثال سے بھی گئے

میں نے تو رکھ دیا ہے ہتھیلی پہ اپنا دل
اب اس سے آگے یار ترا کام رہ گیا

کسی کے ہجر میں مرنا عجیب مرنا ہے
کہ جس کا موت پہ الزام بھی نہیں آتا

میں کبھی زندگی کہہ کر نہ پکاروں گا تجھے
زندگی کہتے ہیں اس کو جو بسر ہو جائے

سخن سرائے سے ایک خط

عباس تابش

میں تمہارے بعد ایک طویل خود کلامی میں کھو گیا تھا۔ نہ میرا آئینے سے ربط رہا نہ مینا سے گفتگو۔ ایک دن میں نے سوچا کہ محبت محض ناکامی کا نام تو نہیں۔ اس سے ملنے والے دکھ کبھی دنیاداری بھی سکھا دیا کرتے ہیں۔ مجھے دعویٰ تو نہیں لیکن میں نے بساط بھر دکھوں سے جینے کا حوصلہ حاصل کیا۔ ایک موقع پر میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر تلخی پیدا ہو گئی ہے۔ اور میں منفی سوچ کا حامل ہوتا جا رہا ہوں۔ یوں لگا جیسے محبت کی نارسائیاں دنیا سے ناراضگی کا سبب بن گئی ہیں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ تم سے قطع تعلق کر لوں اور پوری طرح عارف دنیا بن جاؤں۔ یہ کیفیت طویل تر انتظار کے دوران پیدا ہوئی۔ اس کے زیر اثر میں نے تمہارے متعلق نہ جانے کیا کیا سوچا۔ تم سے جتنی محبت تھی اس سے بڑھ کر نفرت کی لیکن جب تمہیں سامنے پایا تو نہ تم سے شکوہ تھا نہ شکایت۔ مجھ میں جس قدر تلخی تھی وہ تمہارے انتظار نے پیدا کی اور تم نے ختم کر دی۔ یہ تلخی بھی شاید محبت کی کوئی جہت تھی۔ تلخی کا ذکر اس لیے ابتدا میں آ گیا کہ میں آج کل اسی کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ ہر چند میں نے تمہارے انتظار کی شدت کو کم کرنے کے لیے اوروں سے پیار کیا۔ لیکن پس عمر رواں جو غم ٹھہر گیا ہے وہ مہ و سال زندگانی کے ساتھ کسی طور جانے کو تیار نہیں۔ یہ غم روز سورج کی طرح طلوع ہوتا ہے اور اپنی تمازت سے ویرانہ جاں میں وہ کشش پیدا کرتا ہے جو مجھے مجھ سے دور نہیں ہونے دیتی۔ میں جس غم کی بات کر رہا ہوں یہ شاید میرا بنیادی موضوع ہے۔ اس غم نے سماجی عمل کے اتار چڑھاؤ خود میں ڈھال لیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہر واقعے کو ایک جیسی شدت سے محسوس کرنے لگا ہوں۔

تمہیں شاید یاد ہو کہ یہ غم تم نے مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں کیفے ٹیریا کے ساتھ گراؤنڈ میں سرما کی دھوپ سینکتے ہوئے کسی بے خیالی کے لمحے میں دیا تھا یہ ایک لمحہ میری زندگی پر محیط ہو گیا ہے۔ یہ لمحہ نہ میرا ماضی ہے نہ حال نہ مستقبل۔ یہ کوئی اور زمانہ ہے جو کئی زمانوں سے میرے ساتھ ہے۔ اسی کے زیر اثر میں شعر کہتا ہوں۔ اس لمحے سے پہلے تک میں نے جو شاعری کی وہ حاصل مطالعہ تھی جس میں کہیں کہیں میں خود بھی تھا۔ لیکن بعد میں، میں بھی بدل گیا اور میری شاعری بھی۔۔۔ تجربہ میرے سامنے آ گیا۔ اب میں قافیے کا امکان اپنی کیفیات کے جھاڑ جھنکار سے ڈھونڈنے لگا۔ کچھ عرصہ تک تو مجھے یوں لگا جیسے میں اظہار سخن میں فوری ردعمل کا شکار ہوں۔ جو مجھ پر گزرتی ہے کہہ دیتا ہوں۔ جی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے یا تمہیں سنانے کے لیے۔۔۔ آخر تم سے باتیں بھی تو کرنا تھیں کیونکہ میرے نزدیک محبت کا جذبہ بھی روحانی تجربے کی طرح یا تو نگاہوں سے عیاں ہوتا ہے یا شاعری کی زبان میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ میں شاعر تھا اس لیے سخن کی زبان میں تم سے تکلم کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن کہیں کہیں سکوت کا وقفہ آیا۔ اس دوران میں نے زبردستی شعر کہنے کی بجائے شاعرانہ کیفیت کو انجوائے کیا۔

اب تم سے بچھڑے زمانہ ہو گیا ہے جو باتیں میں تم سے کیا کرتا تھا اب خود سے کر رہا ہوں یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں خود کلامی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس خود کلامی نے مجھے روحانی مطالبات پر توجہ کا متحمل بنایا۔ اب یہ عالم ہے کہ خود سے کبھی اپنی باتیں کرتا ہوں اور کبھی تمہاری۔۔۔ یہی سلسلہ میری شاعری کا سفر قرار پاتا ہے۔ اس میں کہیں کہیں دنیا اور اس کے غم بھی در آتے ہیں لیکن اسی طرح جیسے تم اور تمہارا غم۔۔۔!

تمہیں علم ہے کہ ہماری محبت میں موضوعی فقدان کبھی نہیں رہا تم نے کبھی کسی اور موضوع کو محبت سے فرار نہیں سمجھا۔ ویسے بھی محبت کرنے والے لوگ دیگر معاملات پر محبت کے نقطہ نظر ہی سے بات کرتے ہیں اس لیے دنیا کے غم کو ’’کسی‘‘ کا غم بنا لیتے ہیں۔ یہ بہت پرانی بات ہے لیکن ہے سچ! میں نے دنیا سے معاملات میں بہت دھوکے کھائے ہیں جب مجھے کوئی دست مہربان نہ ملا تو میں نے درختوں کو دست مہرباں سمجھنا شروع کر دیا اور ان سے ایسوسی ایشن قائم کی۔ تم نے ایک دفعہ کہا تھا کہ میری شاعری میں پرندے، درخت، ہوا، چاند اور صبح کا ذکر تم سے زیادہ ہے۔ معلوم نہیں تم نے ان لفظوں کی تہہ میں میرے غم مستقل تک کیوں نہ رسائی حاصل کی۔۔۔ یہ لفظ تمہارے رقیب نہیں ہیں۔ یہ لفظ وہ رنگ ہیں جن سے میں اپنی کیفیت کو پینٹ کرتا ہوں اور محبت کے فرض سے عہدہ برآ ہوتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں اوّل و آخر محبت کرنے والا ہوں۔ محبت میری زندگی ہے اور زندگی کو پیش کرنا شاعری! میرے نقادوں نے مجھے محبت کی شاعری کرنے سے روکا۔ کہا کہ اس پر بہت شاعری ہو چکی ہے اب اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ سچ کہتے ہوں لیکن میں اپنی ذات کے سچ (محبت) کو موضوع بنانے سے کیسے باز رہ سکتا ہوں بعض اوقات تو مجھے یوں لگتا ہے میں نے شاعری میں محبت کی اور محبت میں شاعری۔

تم سے بچھڑے زمانہ ہو گیا ہے لیکن آج تم سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ دوستوں کا کہنا ہے کہ میری شاعری میں ہجر کا مسئلہ نہیں آتا۔ میں نے اس پر بہت غور کیا کہ تم نہیں ہو لیکن تمہاری کمی مجھے محسوس نہیں ہوتی۔ شاید میں نے تمہیں کبھی خود سے جدا نہیں سمجھا۔ چائے کو موڈ کرے تو دو کپ بناتا ہوں ایک اپنے لیے، دوسرا تمہارے لیے۔ میں نہیں چاہتا کہ وصال کا موسم گزر جائے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے قرب کا دن ڈھل جائے اور میری زندگی میں وقفہ شام و سحر آ جائے آج کل تو یہ کیفیت ہے کہ جب بھی تم سے ملنے کو جی کرتا ہے شعر کہنے لگتا ہوں۔ اسی لیے غزل میں تخاطب کا انداز پیدا ہوتا ہے کبھی تم سے مکالمہ کرتا ہوں اور کبھی خود سے۔۔۔ جس طرح محبت کار مسلسل ہے اسی طرح شاعری بھی ایک مسلسل عمل ہے۔ اس کا بھی ’’جو دم غافل سو دم کافر‘‘ والا معاملہ ہے میں ان دونوں کے سلسلے میں

کبھی غافل نہیں ہوا۔۔۔یار لوگ مجھے زود گو کہہ کر میری محنت یعنی محبت کو اکارت کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں کیسے بتاؤں کہ محبت اور شاعری دونوں میرے سانس کی طرح ہیں۔ میں سانس آخر کب تک روک سکتا ہوں؟۔۔۔زود گوئی کی مخالفت کرنے والے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس سے یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے میرے ہاں یہ معاملہ نہیں اس لیے میں کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ میری ہر تازہ غزل اتنی مختلف ضرور ہوتی ہے کہ اس پر سنی ہوئی غزل کا گماں نہیں گزرتا۔ جیسے تم سے ہر ملاقات اجنبیت سے شروع ہوتی ہے اسی طرح ہر نئی غزل کے دوران مری نو آموزی جاگ اٹھتی ہے۔ یوں لگتا ہے پہلی بار غزل کہہ رہا ہوں۔ تم نے ایک دفعہ میری روایت پسندی کے بارے میں بات کی تھی اور ادھر ادھر کے اعتراضات پر استفسار کیا تھا۔ تم نے پوچھا تھا کہ میں محبت اور شاعری دونوں میں روایت پسند کیوں واقع ہوا ہوں۔ اس وقت تو میں نے کوئی جواب نہ دیا تھا لیکن اب مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہارے اس سوال کا جواب بھی دیتا چلوں۔ میرے نزدیک شاعری خود رو پودا نہیں۔ کیا تم نے کوئی ایسا خود رو پودا دیکھا ہے جو قد آور ہوا اور کوئی قابلِ ذکر پھل بھی دیتا ہو پھلدار درخت زیادہ تر پیوند کے محتاج ہوتے ہیں۔ پھلوں کی مٹھاس میں اضافے کے لیے پیوند کاری کی جاتی ہے۔ میں شاعری میں اسی کا قائل ہوں جب میں پیوند لگا رہا تھا لوگوں نے مجھ پر روایتی ہونے کا الزام لگایا۔ لیکن جب پھل آنے لگا تو وہی لوگ اپنی رائے بدلتے نظر آئے۔ میں بھی چاہتا تو بحور میں زحافات کی کمی بیشی اور مخصوص شعری لغت سے اپنی محدود انفرادیت قائم کرتا لیکن میں نے ایسا نہ کیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے کچھ نوجوان سامنے آئے۔ انہوں نے اپنی انفرادیت کے زیرِ اثر دو چار چونکا دینے والی غزلیں کہیں اور چلتے بنے اب تم خود فیصلہ کرو کہ کیا فرق ہے ان نوجوان اور خود رو پودوں میں۔

میرے خیال میں غزل کی شاعری روایت اور تجربے کے توازن کا نام ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ''آسان'' کی شاعری میں یہ کام کر پایا ہوں لیکن ایسا کرنے کی حتی المقدور کوشش ضرور کی ہے۔ پس عمرِ رواں ٹھہرے ہوئے غم میں مجھے اتنی پرتیں نظر آ رہی ہیں کہ اس کو سخن میں ڈھالنے کے لیے ایک عمر شاید کم ہو۔ میں نے اس غم کی صداقت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ میں نے اس پر غیر موزوں لفظوں کی ملمع کاری کر کے اپنے قاری کو خواہ مخواہ مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میرے ایج گروپ سے قبل کے شعراء نے لفظی بازی گری میں خود کو خرچ کیا خود بھی گمراہ ہوئے اور ہمارا بھی وقت ضائع کیا۔ ان شعراء نے محض لہجے کا لطف پیدا کرنے پر توجہ دی۔ نفسِ مضمون سے گریز کرتے رہے۔ اس دورخی نے انہیں الجھا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک آدھ کتاب کے بعد ان کی ہمت جواب دے گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اساطیری علامتوں کا جواز اپنی زندگیوں میں ڈھونڈے بغیر انہیں استعمال کیا اس لیے وہ اپنی مخصوص اور منفرد شعری لغت سے زیادہ کام نہ لے سکے۔ ان میں سے کچھ شعراء نثری نظم کی طرف نکل گئے اور کچھ نے غزل میں کافی آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کی اور کچھ بحور میں توڑ پھوڑ تک محدود ہو گئے ان شعراء پر لکھی جانے والی تنقید بھی ٹائپ فقروں سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں بھول کے کسی اور طرف نکل گیا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ ''گفتگو کسی سے ہو دھیان تیرا رہتا ہے'' یہ دھیان ہی ایسی متاع ہے جس پر میری نسل کے شعراء کا اعتماد ہے۔ وہ اس دھیان سے اپنے سخن کا چراغ جلاتے ہیں۔ وہ تہ در تہ زندگی کو تہ در تہ انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں کچھ نوجوان شعراء ایسے تھے جو اساطیری علامت کے تجربے میں گھر گئے۔ لیکن انہیں بھی جلد احساس ہو گیا۔ شاعری میں یہ نیا تجربہ ناکام ہو گیا ہے۔ اس طرح غزل بھی جدید افسانے کی طرح تجریدیت سے نکل آئی۔ اب غزل میری نسل کے شعراء کے ہاتھ میں ہے۔ جن کے ہاں اظہار کی سادگی اور موضوعات کا تنوع ہے، وہ ذوق کی طرح مصرع کی صفائی ستھرائی پر ہی خرچ نہیں ہوتے بلکہ غالب کی پیروی میں مضمون آفرینی کا ڈول بھی ڈالتے ہیں۔

میں پھر اپنی خود کلامی کی طرف لوٹتا ہوں۔ تم میری کتاب پڑھو اور دیکھو کہ میں نے تمہیں اور تمہارے دیئے ہوئے غم کو کیسا کتاب کیا ہے۔ اچھا لگے تو ضرور داد دینا کہ تم وہ ''شاعر گو'' ہو جسے سخن شناسی میں بھی کمال حاصل ہے۔ اسی لیے تو تم سے مخاطب ہونا اچھا لگتا ہے۔

تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے جب اپنی نئی کتاب کا نام ''آسان'' تجویز کیا تو تم نے کہا ''تمہید'' کے بعد ''آسان'' کیوں؟ آسان تمہارا نام تھا۔ جو میں نے اپنی کتاب کو دے دیا۔ آسان تم ہو۔۔۔آسان نارسائی کا استعارہ ہے۔۔۔ آسان کی طرف دیکھنا یعنی تمہاری طرف دیکھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں تمہارے لیے بہت سا سفر طے کر چکا ہوں لیکن تم ابھی تک تغافل کی بلندی پر ہو۔ چلے آؤ کہ میں نے نئے مکان میں تمہارے لیے در انتظار رکھ دیا ہے۔ اس مکان کو گھر بنا دو کہ مکان اپنے مکین کی وجہ سے گھر بنتا ہے۔ مجھے بارش اور تازہ غزل کی طرح تمہارا انتظار رہے گا۔

قوتِ مخیلہ

پاکستان میں اس وقت مستند شعراء میں عباس تابش کا نام ایک روشن ستارے کی طرح تابندہ ہے۔ نت نئے مضامین سے سجے اور سوچ کی عمیق گہرائیوں سے ابھرتی ذہین لہریں عباس تابش کی شاعری کو ہم عصر شاعروں سے ممتاز بنا دیتی ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا کہ عباس تابش کے کلام پر کوئی رائے زنی کر سکوں لیکن ان کی جرأت، قوت مخیلہ، سوچ انداز، زباں، بیان، کیفیت، اظہار، چبھن، دھوپ چھاؤں، گرم سرد، مٹھاس، ترشی، تلخی، اعتماد، ذوق، پسند، استعارے، مثالیں، بندشیں، مضامین، تجربات، روایات، تمازت، موضوعات، نظریات، وضاحت، بلاغت اور بہت کچھ ایسا ہے جس سے متاثر ہو کر کلام کو اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے۔

جاوید اختر پاشا

براہِ راست

عباس تابش ہمارے عصر کے ایسے با ہنر اور باصلاحیت سخن ساز ہیں جنہوں نے قدرت کی صنّاعی کو ہمہ رنگ طریق پر کچھ اس طور سنوارا اور نکھارا ہے کہ اُن کی شاعری کا ہر لفظ باآوازِ بلند عباس تابش کے منفرد و مہذب اسلوب کی گواہی دے رہا ہے!

آج کی محفل عباس تابش کے ہم نوا اور ہم آواز احباب کی مدد و تعاون سے کچھ اس طور آراستہ کی گئی ہے جس میں ہر ہر صفحہ، سطر اور لفظ عباس تابش کے منفرد آہنگ کو اُجال رہا ہے۔ آپ کی سندِ اعتراف آج کے ممتاز و منفرد آواز کو وقار بھی بخش سکتی ہے اور اعتماد بھی!!

آیئے احبابِ تابش کے ہم آواز ہو کر اپنے عصر کے بلند آہنگ شاعر عباس تابش کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں!!!

گلزار جاوید

☆ پہلا اور روایتی سوال:

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تُو

☆☆ ۱۹۷۵ء میں مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میرے اندر شاعر چھپا ہوا ہے۔ میں رات کے وقت کتاب کی ورق گردانی کر رہا ہے کہ میرے کانوں میں کچھ آوازیں آئیں۔ غور کرنے پر محسوس ہوا کہ یہ آواز مسجد کی آواز سے کچھ مختلف ہے۔ میں اُس آواز کے تعاقب میں بلدیہ کے گراؤنڈ میں پہنچ گیا جہاں کچھ احباب اکٹھے تھے اور ایک صاحب کچھ پڑھ رہے تھے۔ جوں جوں وہ صاحب بلند آواز سے پڑھنے کے بعد وقفہ کرتے، باقی کے لوگ واہ واہ کی آوازیں بلند کرنے لگتے۔ معلوم کرنے پر علم ہوا کہ محفلِ مشاعرہ ہو رہی ہے اور جو صاحب پڑھ رہے ہیں وہ شاعر ہیں۔ میرے دل سے آواز آئی کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں چنانچہ کچھ نہ کچھ کہنے اور لکھنے کی تڑپ دل میں گھر کرنے لگی۔ دو سال بعد والد محترم کا انتقال ہوا تو رنج و ملال کی کیفیت نے میرے جذبات و احساسات کو مہمیز دی اور بہت دن تک میں انہیں منظوم کرتا رہا۔ ڈائری کے بہت سے اوراق جب میری تحریر سے پُر ہو گئے تو ایک دن میں اپنے شہر کے مشہور شاعر نذیر اظفر کی خدمت میں رہنمائی کے لیے حاضر ہوا۔ یاد رہے نذیر اظفر صاحب وہی شاعر ہیں جو اُس روز مشاعرے میں داد سمیٹ رہے تھے۔

☆ غالب کے لیے شاعری باعثِ عزت نہ ہوتے ہوئے بھی اُن کے طواف میں رہی، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعری نے آپ کا یا آپ نے شاعری کا تعاقب کب، کہاں، کن اسباب کی بنا پر کیا؟

☆☆ دیکھئے غالب نے جو فرمایا ہے:

کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

ہم اس کے معنی نہیں سمجھ سکے۔ کچھ سے مراد تھوڑی سی شاعری میرے لیے باعث عزت نہیں ہے۔ کم از کم میرے لیے اس بات سے اتفاق کرنا ممکن نہیں۔ جہاں تک سوال کے دوسرے حصے کی بات ہے تو اُس کا جواب میں پہلے سوال کے جواب میں دے چکا ہوں۔

☆ آپ نے ابتدائی سفر میں جن بلند قامت سخن سازوں کا اختصاص سے ذکر اور اُن کے تجربات کو نمایاں کیا ہے اُن کی بابت آج آپ کے احساسات کیا ہیں؟

☆☆ ایک نوجوان جب شاعری کا آغاز کرتا ہے تو اُس کے کچھ آئیڈیل اُس عمر کے اعتبار سے ہوتے ہیں۔ آغاز میں ظفر اقبال میرے آئیڈیل تھے یہ ۱۹۷۸ اور ۱۹۷۹ کی بات ہے۔ ۱۹۸۲ سے ۱۹۸۳ تک مختلف کتب اور شعراء کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ظفر اقبال کی شاعری کا خمیر روایتی شاعری سے نہیں اٹھا بلکہ لمحۂ موجود میں جو شاعری ہو رہی تھی اُس میں ان کے پیش رو شہزاد احمد کو اپنی شاعری میں آئیڈیالائز کیا۔ کھڑے کھڑے لانگ یا ہائی جمپ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ ظفر اقبال کی شاعری زیادہ دیر تک میرا ساتھ نہ دے پائے گی لہٰذا میں روایت کی طرف پلٹ گیا۔ تو روایت میں میں نے مختلف شعراء کو پڑھا بھی اور بسر بھی کیا وہ ایک لمبی فہرست ہے۔

☆ آج کی نشست میں اُس گھر کی وضاحت کر ہی دیجیے جو عرصے سے آپ کے اعصاب پر چھایا ہوا ہے؟

☆☆ میں ایک ایسے گھر میں جنم لیا جو ہمارا موروثی گھر نہیں ہے۔ آج بھی اُس گھر میں تیسری نسل پروان چڑھ رہی ہے لیکن گھر کی ملکیت ہمارے نام نہیں ہے۔ وہ متروکہ پراپرٹی ہے جو قیامِ پاکستان کے وقت ہندو چھوڑ گئے تھے اُس کے حوالے سے کئی طرح کے مقدمات عدالتوں میں زیرِ سماعت ہیں۔ اس گھر میں رہ کر گھر سے محبت اپنی جگہ مگر مجھے ایسا لگا کہ میرا کوئی گھر نہیں ہے اور بے گھری کے احساس نے میرے اندر گھر کر لیا۔ آج بھی الحمدللہ میں اپنے گھر میں رہتا ہوں مگر بے گھری کے احساس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔

☆ سُنا ہے کچھ آوازیں بھی آپ کا تعاقب کیا کرتی ہیں؟

☆☆ قطعاً نہیں، کوئی آواز میرا تعاقب نہیں کرتی۔ ہاں شاعری میں ایسا

ضرور ہوتا ہے کہ ہم احساس کی سطح پر کچھ محسوس ضرور کرتے ہیں:

میں جب بھی کہیں راہ میں گرنے لگا تابش
آواز سی آئی میرے قدم رکھ

تو یہ احساس کی سطح پر سنی ہوئی آوازیں ہیں جن کا تخلیق کی دنیا سے باہر قطعاً کوئی وجود نہیں۔

☆ کچھ وضاحت عصری اشاروں کی ہوجائے تو گفتگو درست سمت میں رواں ہوجائے گی؟

☆☆ عصری اشاروں سے مراد اگر لمحۂ موجود کا طرزِ احساس ہے تو اس پر بات کرنا میرے لیے آسان ہوگا کیونکہ لمحۂ موجود میں سب سے بڑا مسئلہ عدم تحفظ کا ہے۔ معاشیات کا مسئلہ ہمیشہ سے رہا ہے مگر اس وقت شدید تر ہوگیا ہے۔ غربت بہت زیادہ ہوگئی ہے، تعلیم کے لیے جو وسائل حکومت کی طرف سے مہیا ہیں وہ ناکافی ہیں۔ ان تمام مسائل کے سبب آج کا انسان مستقبل کی نسبت مایوسی کا شکار ہے۔ میں ذاتی طور پر مایوس انسان نہیں ہوں مگر کیا جائے۔ بقول غالب:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں ساغر و پیالہ نہیں ہوں میں

☆ نئی زمینوں کی تلاش کچھ ایسی نئی بات بھی نہیں مگر آپ کی نسبت جس شدت سے اس کا ذکر کیا گیا ہے اُس کے باعث اشتیاق دوچند ہوا جاتا ہے؟

☆☆ غزل میں زمین کا تعین کرنا میرے خیال میں مسئلہ بنا دیا گیا ہے حالانکہ یہ مسئلہ ہے نہیں۔ غالب کی ستر فیصد شاعری پرانی زمینوں میں ہے۔ وہی ردیف وقوافی ہیں جو صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔ آج بھی بہت سی زمینیں ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتیں جن میں ہم غزل کہتے ہیں اور بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ فلاں استاد کی زمین ہے۔ میرے خیال میں غزل کا جو میکانزم ہے جو نسل در نسل ہم تک پہنچا ہے اور ہماری ذات کا حصہ بنا ہے یہ اصل میں اُس کا مسئلہ ہے کہ ہمیں انہی زمینوں میں گھوم پھر کر سیر سماوات کرنی ہوتی ہے۔ میں دانستہ کسی کی زمین میں شعر نہیں کہتا لیکن اگر زمینیں کہیں سے لاشعوری طور پر آجاتی ہیں میرے مزاج کا حصہ بن کر تو اُس میں شعر کہنا پڑتا ہے۔ ہاں جن دنوں شعر نہیں ہوتے تو اُن دنوں میں اس کا التزام کرتا ہوں کہ غالب کی زمینوں میں اشعار کہوں تو اس میں رب اظہار کوئی شعر عطا کر دیتا ہے۔

☆ اکثر شعراء کے ہاں نئے مضامین کے دعوے کیے جاتے ہیں آپ کی نسبت احباب بھی کچھ اس قسم کی رائے کا اظہار خاصی شدومد سے کرتے نظر آرہے ہیں؟

☆☆ میں نئے مضامین کا دعوی دار کبھی نہیں رہا۔ بقول سیف الدین سیف:

سیف اندازِ بیاں رنگ بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

یہاں تھوڑا سا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ صرف اندازِ بیاں نہیں بلکہ مضمون میں نیا گوشہ تلاش کرنا بھی ضروری ہے۔ نئے مضامین کا دعوی کرنے والوں کے ہاں کوزہ گری کا مضمون نہیں ہے، کیا اُن کے ہاں بے گھری یا ہجر و وصال کا مضمون نہیں ہے۔ یہ سب کے ہاں موجود ہے۔ میں روایت کا آدمی ہوں اور روایت کو ساتھ لے کر چلتا ہوں اگر کسی کو گمان ہے کہ یہ مضامین مستعار ہیں اور وہ غزل کے میکانزم کو نہیں سمجھتے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے جو مضامین استعمال کیے ہیں اُن کو پرسنلائز کیا ہے اور کچھ الگ گوشے تلاش کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔

☆ یہ لفظی بازیگری اور ترکیب سازی کی اصطلاح آپ جیسے جینوئن اور محنتی شاعر کے لیے مناسب ہے کیا؟

☆☆ میں نہیں جانتا کہ کس نے کہا اور کب کہا اور کہنا مناسب بھی ہے یا نہیں۔

☆ ہر تخلیق کار کسی نہ کسی شکل میں اپنے عصر کے شعور کا بکھان کرتا ہے مگر کچھ لوگ اس حوالے سے آپ کی کاوشات کو زیادہ اہمیت کیوں دیا کرتے ہیں؟

☆☆ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوال مجھ سے متعلق نہیں ہے۔ جو لوگ اس طرح کے شغل میں مصروف ہیں یہ سوال اُن سے کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ میں اپنے تئیں کوشش کرتا ہوں کہ شعر کہنے کی اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔

☆ آپ کے باب میں یہ بھی رقم کیا جاتا ہے کہ آپ کی شاعری عمر سے آگے کی چیز ہے؟

☆☆ شاعر ہوتا وہی ہے جو اپنی عمر سے آگے کی بات کرے اور عمر سے آگے بات کرنے کا مطلب آنے والے زمانے کی نسبت بات کرنا ہے۔ ایک بشارت کا عنصر شاعر میں ہونا چاہیے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ وصف میری شاعری میں پایا جاتا ہے میں اُن کی محبت کا شکر گزار ہوں۔

☆ کوئی شاعر، ادیب یا تخلیق کار خود بنانے، سنوارنے کی تراکیب اور جستجو کس طرح کرسکتا ہے۔ اگر آپ نے اس طرح کی کوئی کاوش کی ہو تو اُس میں ہمیں ضرور شریک کیجیے؟

☆☆ میرے خیال میں شاعر پیدائشی طور پر شاعر ہوتا ہے۔ ایلیٹ نے بھی کہا ہے کہ کسی میں ایک فیصد بھی ٹیلنٹ ہوتا ہے اور ننانوے فیصد اپنی محنت سے اُسے ڈویلپ کرتا ہے۔ میں اس کو ریاضت کا نام دیتا ہوں کہ آپ میں اگر کسی کام کا امکان ہے اور آپ اُسے نکھارنے، سنوارنے اور بڑھاوا دینے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بہت ضروری چیز ہے۔ کوئی بھی ریاضت کے بغیر ممکن نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ کسی کی آواز بہت اچھی ہو اور وہ اس بنیاد پر بڑے غلام علی خاں بن جائے یا مہدی حسن بن جائے اس کے پیچھے طویل راتوں کی ریاضت بہت ضروری ہے۔

☆ پھول پودے، پرندوں، چراغوں، دشت اور تسبیح کے استعاروں کو

جس کثرت سے برتا گیا ہے وہ قاری کے اشتیاق کو مہمیز دے رہا ہے؟

☆☆ میں سمجھتا ہوں کہ شاعر کا اپنا ایک مکمل موسم ہونا چاہیے، ایک مکمل فضا ہونی چاہیے۔ میری جو فضا ہے اس میں جو استعارے آپ نے بیان کیے ہیں وہ بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ ان استعاروں کی تکرار معنوی تکرار کے ساتھ نہیں ہے بلکہ میں جہاں بھی پرندہ استعمال کیا تو میں نے کوشش کی کہ اس میں نئے معنی کا اضافہ کروں اور پرندے کو مختلف انداز میں پیش کروں۔ تو اس کام کا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے اپنا موسم بنانے اپنے تئیں کوشش کی ہے اس میں میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں اس کا فیصلہ قاری بہتر طور پر کر سکتا ہے۔

☆ بے پناہ سماجی، سیاسی، معاشی مسائل کی موجودگی میں کسی تخلیق کار کی ذاتی واردات کیونکر دخیل ہو سکتی ہے؟

☆☆ شاعری بنیادی طور پر داخل سے خارج کا سفر ہے اور معاشرے میں رہنا زندگی گزارنا یہ خارج سے باطن کا سفر ہے کہ ہم معاشرتی مسائل کا سامنا کرتے ہیں اور یہ ساری چیزیں کہیں ہمارے اندر جمع ہوتی رہتی ہیں لیکن جب ہم تخلیقی لمحے میں داخل ہوتے ہیں تو اُس وقت ہماری داخلیت خارجیت کی طرف جانا شروع ہو جاتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اپنے عہد کو بیان کرنے کے لیے داخلیت پسند ہونا ضروری ہے اور اگر آپ داخل سے باہر کی جانب نظر دوڑاتے ہیں تو آپ اپنا حق اور تخلیقی سطح پر معاشرے کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔

☆ تمہیدی غزلوں کو آپ کی شاعری کی اساس بتلانے والے آپ کے مزاج کی نشان دہی کر رہے ہیں یا آپ کے انداز کو حصار میں مقید کر رہے ہیں؟

☆☆ روحِ سخن میرے پہلے مجموعے کی جانب ہے۔ پہلا مجموعہ تخلیق کار کی اساس ہوتا ہے۔ وہ میری اساس ہے، میری بنیاد ہے، میرا تعارف ہے اور یہ میرا اعزاز ہے کہ اُس میں میرے مرشد خالد احمد کا لکھا دیباچہ موجود ہے۔ جو اسے میری اساس گردانتے ہیں میرے خیال میں وہ درست ہیں اگر آپ کے سوال کا مطلب ہے یہ کہ میں تمہید تک محدود ہوں تو میرے خیال میں ایسا نہیں ہے کیونکہ میں نے ایک ہی ڈھب کی شاعری نہیں کی۔ تمہید تک میری شاعری اور ہے اور اس کے بعد جب گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا تو آسمان کی شاعری وہ ایک محبت کے گہرے تجربے کی شاعری ہے۔ طالب علمی کے یوٹیوپیا سے نکلنے کے بعد ''مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا'' اس کے بعد ''پروں میں شام ڈھلتی ہے'' اور تجربات ہیں، اور مزاج ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرا مزاج بدلتا رہا ہے البتہ یہ بات ضرور ہے کہ میرے ہر مجموعے کے ساتھ کچھ لوگ جڑ گئے اور وہیں ٹھہر گئے، میرے ساتھ چل نہیں پائے۔ بہت سے لوگ اب بھی سمجھتے ہیں کہ تمہید میرا پہلا اور آخری اور مضبوط کام ہے، کچھ لوگ ''آسمان'' کے بارے بڑی مثبت رائے رکھتے ہیں اسی طرح کچھ لوگ دیگر مجموعوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کچھ مختلف اور منفرد کام ہونا چاہیے۔ اظہار کی سطح پر وقت کے ساتھ ساتھ میں بہت سہل ہوتا گیا ہوں اور اب معاملہ یہی ہے کہ ''تمہید'' میں تراکیب بہت تھیں اور آج کل میری شاعری میں تراکیب نہیں ہیں اگر تراکیب کو پسند کرنے والے لوگ میری شاعری کو آسان سمجھتے ہیں تو میرے خیال میں انہیں سہل ممتنع کے معنی اور تشریح ضرور پڑھنی چاہیے۔

☆ کوئی بھی تخلیق کار جب مکالمے کی جانب رجوع ہوتا ہے تو اُسے بھانت بھانت کی بولیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ آپ ہمیں اپنے تجربات کی نوعیت سے آگاہ کیجیے؟

☆☆ مجھے ہمیشہ سے دو طرح کے لوگوں کا سامنا رہا ہے۔ ایک وہ ہیں جو مجھے بہت بڑا شاعر سمجھتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو مجھے بالکل شاعر نہیں سمجھتے۔ میرے خیال میں یہ دونوں باتیں سچ پر مبنی نہیں ہیں۔ سچ ان کے درمیان Exist کرتا ہے اور سچ بھی واضح نہیں ہے میں اُسی کی تلاش میں ہوں اور مجھے یہ سہولت حاصل ہے کہ میں اپنی کبھی Rating نہیں کی جیسے ہر شاعر اپنا مقام متعین کرتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اس عمل سے پرہیز کیا ہے اور اپنے مرشد خالد احمد سے عاجزی سیکھی ہے اور آج تک اُسی پر عمل پیرا ہوں۔ کہیں داد ملتی ہے کہیں بے داد کا سامنا ہوتا ہے مگر اُس سے بے جا خوشی یا ناواجب حزن و ملال کے بجائے ہمیشہ سیکھنے کا عمل جاری رکھا ہے۔

☆ فطرت کی زبانی آپ کی ذات کا اثبات کب تک اور کس شکل میں ہونے کے امکانات ہیں؟

☆☆ -----

☆ اردو غزل میں ترقی پسندی کے اثرات فلسفہ، سائنس اور اساطیری علامات کا استعمال کس طرح کے رجحان اور اثرات کا حامل رہا۔ آپ کی رائے کے ساتھ پوزیشن کی وضاحت بھی ضروری ہے؟

☆☆ -----

☆ آپ کے ہاں مغل مصوری اور پینٹنگز کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے؟

☆☆ -----

☆ عشق و محبت میں اُکتاہٹ بجائے خود حیرت و استعجاب کی بات ہے کُجا ایک شاعر کی جانب سے اس طرح کا تصور پیش کیا جائے؟

☆☆ میں نے کبھی عشق کو اکتاہٹ کے معنوں میں لکھا نہ بیان کیا یہ ایک Misperception ہے۔ اکتاہٹ کا کیا سوال ؟ عشق زندگی ہے اور میں اسے شوق سے بسر کر رہا ہوں۔

☆ محبت کے باب میں ناصر کاظمی پر آپ کو فوقیت دینا کس چیز کی نشاندہی کر رہا ہے؟

☆☆ میری معلومات کے مطابق محبت کے حوالے سے کبھی کسی نے مجھے ناصر کاظمی پر فوقیت نہیں دی۔ محبت ایسا عمل ہے جس میں موازنہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیا محبت کرنے والے دو افراد بڑے نہیں ہو سکتے ؟ محبت فرد نہیں پورا معاشرہ کرتا

ہے۔سب کی اپنی فضا اوراپنا موسم ہوتا ہے جس میں وہ رہتے ہیں۔محبت کے حوالے سے نہ کوئی بڑا ہے نہ کوئی چھوٹا۔

☆ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے کہ جدید اردو غزل کسی فارمولے کے تحت لکھی جاتی ہے اگر اس خیال سے اتفاق کرلیا جائے تو مذکورہ فارمولے سے آگاہی خالی ازعلت نہ ہوگی؟

☆☆ غزل کے رد میں جوسب سے بڑی دلیل دی جاتی ہے وہ یہی ہے کہ یہ ایک فارمولا ہے جس کے تحت غزل لکھی جاتی ہے۔بظاہر قافیہ پیمائی موجود ہے جسے آپ فارمولا کہہ سکتے ہیں۔لیکن ناصر کاظمی کے بقول:

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصر
یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو

قافیہ ایک دروازہ ہے اور اس دروازے کے پیچھے بے شمار امکانات ہیں۔ہر شاعر اس دروازے کو کھول کر اپنے حصے کا امکان حاصل کرتا ہے اور غزل میں اپنا حصہ ڈالتا ہے۔غزل واقعی فارمولا شاعری ہوتی تو اتنی مخالفتوں کے باوجود ہر زمانے کا ساتھ دیا ہے اور اُس عصر کی حسیت کو بہت خوبی اور اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔

☆ آنے والے زمانوں کا ذکر کثرت سے کیا جائے تو قاری اُس کاوش کو کیا نام دے یا کس مفہوم کے کھاتے میں شمار کرے؟

☆☆ -----

☆ یہ ولایت کا معمہ اکثر شعراء کے لیے کسی نہ کسی شکل میں استعمال ضرور کیا جاتا ہے۔آپ کی ذات بھی اس سے محفوظ نہیں؟

☆☆ -----

☆ قدامت پسندی کی بساط اُلٹنے کا عمل کس چیز کا ردِعمل تھا؟

☆☆ پہلی بات تو یہ ہے کہ قدامت پسندی کو سمجھا جائے۔ جو آدمی واقعی جدید کہلانے کا حق دار ہے وہ جتنا زیادہ جدید ہے اپنی روح میں اتنا ہی زیادہ قدیم ہوتا ہے اور اگر کوئی سوچتا ہے کہ وہ قدامت پسندی کی بساط الٹ سکتا ہے تو وہ غلطی پر ہے۔ میں قدامت پسندی کو ہمیشہ روایت کے معنوں میں لیتا ہوں کیونکہ میں روایت کا بہت قائل ہوں ۔میرے خیال میں قدامت پسندی کا ایک پہلو اور بھی ہے وہ یہ کہ بہت سے شعراء روایت میں چلے جاتے ہیں،اساتذہ کو پڑھتے ہیں اور روایت ایک ایسا پُر اسرار جنگل ہے کہ اس میں جا کر واپسی مشکل ہو جاتی ہے۔ وہیں رہ کر اُسی انداز میں شعر کہتے رہتے ہیں اور اُن کی شاعری پر قدامت پسندی اور کہنگی کا ہمیشہ گمان گزرتا ہے۔میرے خیال میں یہ مستحسن عمل نہیں ۔میرے خیال میں روایت کے جنگل میں جانا بُری بات نہیں لیکن وہاں سے واپسی بہت ضروری ہے۔غزل کی تازہ کاری کے لیے یہ عمل لازمی بھی ہے اور ضروری بھی۔

☆ محمود درویش، میر، غالب، اقبال اور عبدالرحمان چغتائی اپنا ذہنی قرب ادوار اور اسباب کے ساتھ بیان کیجیے؟

☆☆ سوال اچھا ہے مگر یہاں تفصیل میں جانا ممکن نہ ہوگا۔محمود درویش کی شاعری مجھے بہت پسند ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نظار کبانی، معین بسیسو اور عربی کے دیگر شعرا کی شاعری بھی میں بہت پسند کرتا ہوں۔عبدالرحمٰن چغتائی کا آرٹ مجھے بے حد پسند ہے ۔اقبال ہر عہد کا سب سے بڑا شاعر ہے ۔اقبال جیسا کرافٹ پوری اردو شاعری میں دستیاب نہیں ہے۔اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میں میر یا غالب کی نفی کا مرتکب ہو رہا ہوں۔میر اپنی Domain کا بڑا شاعر ہے اور غالب اپنی Domain کا۔ جہاں تک کرافٹ کا تعلق ہے یعنی شعر بنانے کا آرٹ، اقبال چٹانوں سے بڑے بڑے اہرام تعمیر کرتا ہے ایسا لگتا ہے کہ اس نے مصرع میں لفظ نہیں رکھے بلکہ چٹانوں سے مصرع تراشا ہے:

لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

لعل بدخشاں، ڈھیر، آفتاب یعنی یہ ایسے ایسے لفظ ہیں جو اپنی ذات میں بہت وزن رکھتے ہیں۔ یہ بات میں صوتی اعتبار سے کر رہا ہوں۔اقبال تو صوتیات کا بہت بڑا آدمی ہے۔میں تو ہمیشہ اقبال کو بسر کرتا ہوں اور فخر کرتا ہوں کہ اقبال پاکستان کا قومی شاعر ہے اور ساری دنیا میں ہم اقبال کی بدولت پہچانے جاتے ہیں۔

☆ فراق صاحب سے آپ کے رومان کو احباب اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہیں؟

☆☆ فراق صاحب سے میری محبت ایک حقیقت ہے۔میں نے فراق کو بہت پڑھا اور اُن کی کلیات بھی مرتب کی ہے۔ ہرچند اُن کا پورا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ہندوستان کے ہر سفر میں میں نے کوشش کی کہ جہاں سے بھی اُن کا کلام دستیاب ہو وہاں وہاں دستک دی جائے۔فراق اردو غزل کا ایک بڑا استون ہے جو میرے دل کے بہت قریب ہے۔اکثر لوگ فراق کی مخالفت بشری کمزوریوں اور کوتاہی کے پس منظر میں کرتے ہیں۔میرے خیال میں بعض ازمرگ بڑے تخلیق کاروں کی شخصیت اُن کے فن سے الگ ہو جاتی ہے۔فراق بڑا شاعر ہے جس پر مزید کام ہونا چاہیے اور تندہی سے ہونا چاہیے۔

☆ مرتضٰی برلاس کے نزدیک آپ اُن کے عزیز دوست اور شاگرد کے مقام پر فائز ہیں پھر کیا وجہ تھی کہ آپ نے برلاس صاحب کو غالب کی زمین میں غزل لکھ کر پیغام بھیجنا مناسب سمجھا؟

☆☆ -----

☆ اردو ادب کی تاریخ میں محبوب کی نسبت مذکر کے صیغے کا استعمال بلاسبب نہیں کیا آپ اس معمہ کو حل کرنے میں ہماری مدد فرمانا پسند کریں گے؟

☆☆ -----

☆ صنفِ نازک بالخصوص خوش شکل کے حوالے سے خفیہ ہاتھ کی نشان دہی کثرت سے کی جاتی ہے جبکہ حضرات بھی اس کارِخیر میں کسی سے پیچھے نہیں؟

☆☆ -----

☆ اصلاح یا کلام تک بات ہوتی تو شاید برداشت جواب نہ دیتی نوبت ہے؟ پورے کا پورا دیوان لکھ اور چھاپ کر ہوم ڈیلوری کی سہولت کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے؟

☆☆ -----

☆ اردو شاعری میں جس تعداد میں شعراء پائے جاتے ہیں اُس سے زیادہ تعداد متشاعروں کی نظر آتی ہے۔ کون لوگ ہیں جو اردو شاعری سے نابلد لوگوں کو آگے لا رہے ہیں اور کیوں لا رہے ہیں؟

☆☆ -----

☆ مشاعروں کی مقبولیت میں آپ کا کردار بہت اہم گردانا جاتا ہے پھر یہ گویئے آپ کے بیچ جگہ کس طرح پا رہے ہیں؟

☆☆ آپ کی محبت ہے کہ آپ مجھے مشاعروں کی مقبولیت کا ذمہ دار گردان رہے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ مشاعروں کی مقبولیت کو جگر مرادآبادی کا مرہون منت گردانا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ جس شہر میں مشاعرہ پڑھنے جاتے وہاں کے نظام الاقات ہی تبدیل جاتے۔ اس کے بعد خمار صاحب، بشیر بدر، احمد فراز، پروین شاکر، احمد ندیم قاسمی ہمارے عہد میں امجد اسلام امجد۔ تو جناب اور بھی بے شمار نام ایسے ہیں جنہوں نے مشاعروں کی مقبولیت کو بامِ عروج تک پہنچایا۔

اگلی بات کہ میری موجودگی میں گویئے کیونکر جگہ پا رہے ہیں تو گویئے کو داخل کرنا یا نکالنا میرے دائرہ اختیار میں نہیں آتا، یہ منتظمین کا کام ہے۔

☆ آپ کے باب میں ایک بات جو شدت سے محسوس کی گئی وہ یہ کہ ناقدینِ ادب نے آپ کا محاکمہ کرنے کے بجائے تعریف میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے؟

☆☆ میرے خیال میں یہ تاثر حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ جتنا محاکمہ میرا ہوا ہے شاید ہی کسی دوسرے شاعر کا ہوا ہو۔ میری شاعری پر تعریف سے زیادہ تنقید ہوئی ہے جس میں فن کے بجائے میری شخصیت پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ شاید میں انہیں اچھا نہیں لگتا خدا کرے کہ میری شخصیت میں وہ خوبیاں شامل ہو جائیں جو انہیں اچھی لگتی ہوں۔

☆ پچھلے دنوں کسی صاحب نے بے پَر کی اڑائی کہ آپ اور امجد اسلام امجد نے احمد فراز اور منیر نیازی کا خلا پُر کر دیا ہے؟

☆☆ یہ ایک بے معنی گفتگو ہے کہ کسی فنکار کی موت کے بعد دوسرے فنکار نے اُس کا خلاء پُر کر دیا ایسا نہیں ہوتا۔ کسی بھی بڑے آدمی کا خلاء کبھی پُر نہیں ہوتا بعد میں آنے والا اپنی جگہ خود بناتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی، احمد فراز اور پروین شاکر کا اپنا مقام ہے جن کا خلاء پُر کرنا کسی طور ممکن نہیں۔

☆ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی تشویش میں تو آپ یقیناً شریک ہوں گے۔ آج کے ملکی اور غیر ملکی منظر نامے میں شاعر یا ادیب کا کردار کس حد تک باقی بچا ہے؟

☆☆ اگر ہم سیاسی منظر کی طرح اس پر بھی نظر ڈالیں تو کوئی کردار نہیں ہے اگر ہم ادب کی Domain میں رہ کر سوچیں تو اس سے بڑا کردار کیا ہو سکتا ہے کہ شاعری لوگوں کو ریلیف پہنچا رہی ہے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی مایوس اور بددل کیوں نہ ہو اگر وہ اپنی پسند کا شعر پڑھ یا سن لے تو اُس کی اداسی Settle ہو جاتی ہے۔ کیا آپ کے خیال میں شاعری کا یہ Contribution معاشرے کی خدمت کے حوالے سے کم ہے۔

☆ لوٹ مار، منافع خوری اور قتل و غارت گری کے دور میں ''اسمائے معرفہ'' کی اصطلاح برتنا یا معنی و مفہوم بیان کرنا کارِ دارد نہیں؟

☆☆ -----

☆ ماں بولی سے آپ کی عدم توجہ کی وجوہات اور اسباب جاننا آپ کے قاری کا حق تو بنتا ہے؟

☆☆ آپ نے بہت عمدہ سوال اٹھایا۔ میں چاہتا بھی تھا کہ کسی گفتگو میں یہ سوال مجھ سے دریافت کیا جائے۔ جب میں نے شاعری کا آغاز کیا تو میلسی میں اُس زمانے میں اردو شعراء کی تعداد اسّی (۸۰) کے قریب تھی۔ تمام شعراء اردو میں شاعری کرتے تھے۔ میری مادری زبان سرائیکی ہے لیکن جب میں نے شاعری شروع کی، پڑھی، سیکھی تو اردو ہی زیادہ مجھے سُننے اور سیکھنے کو ملی۔ میری state of Mind کی تعمیر اس طرح ہو چکی ہے کہ میں کوشش کے باوجود بھی سرائیکی میں نہیں لکھ سکتا۔ میں نے چند چیزیں سرائیکی زبان میں لکھی ہیں مگر سوچتا پہلے اردو میں ہوں پھر سرائیکی میں تحریر کرتا ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ میں ماں بولی کا حق ادا نہیں کر سکا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ مجھے اس کی توفیقات عطا فرمائے۔

☆ آپ اپنی کامیابی کو کن حوالوں سے جانچنا اور پرکھنا پسند کرتے ہیں؟

☆☆ سچی اور کھری کامیابی میں آدمی کا اپنا زور نہیں چلتا یہ سب کچھ میرے رب کی دین ہے۔ بقول میاں محمد بخش:

مالی دا کم پانی دینا بھر بھر مشکاں پاوے
مالک دا کم پھل پھُل لانا لاوے یا نہ لاوے

اللہ کا کرم، ماں، بہن بھائیوں کی دعا، میرے مرشد کی خاص محبت اور ہمارے محسن اس عہد کے بڑے شاعر مرتضیٰ برلاس کا میری کامیابیوں میں بڑا حصہ ہے اسی طرح احمد ندیم قاسمی اور میری شریک حیات کے ایثار کا میری کامیابی میں بڑا حصہ ہے۔ میرے دوست بھی ہمیشہ میرے سہارا رہے ہیں جن میں سرفہرست شکیل جاذب، شوکت فہمی، احسان الحق مظہر، رحمان فارس، قمر رضا شہزاد اور شعراء کا ایک وسیع حلقہ اس پُر تشدد دور میں بھی قدم قدم پر میرے لیے آسانیاں پیدا کرتا رہا۔ میں ان دوستوں کے ساتھ سانس لیتا ہوں انہی کے ساتھ میں سانس لیتا ہوں یہی میری کامیابی کا حوالہ ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔

باقی صفحہ ۳۷ پر ملاحظہ کیجیے

''مہتاب کی رات''

(عباس تابش کے سخن نایاب سے کشید)

ثاقب تبسم ثاقب (لاہور)

پانی آنکھ میں بھر کر لایا جا سکتا ہے — اب بھی جلتا شہر بچایا جا سکتا ہے
ایک محبت اور وہ بھی ناکام محبت — لیکن اس سے کام چلایا جا سکتا ہے
دل پر پانی پینے آتی ہیں امیدیں — اس چشمے میں زہر ملایا جا سکتا ہے
مجھ گمنام سے پوچھتے ہیں فرہاد و مجنوں — عشق میں کتنا نام کمایا جا سکتا ہے
یہ مہتاب یہ رات کی پیشانی کا گھاؤ — ایسا زخم تو دل پر کھایا جا سکتا ہے
پھٹا پرانا خواب ہے میرا پھر بھی تابشؔ — اس میں اپنا آپ چھپایا جا سکتا ہے

……O……

☆

میری تنہائی بڑھاتے ہیں چلے جاتے ہیں
ہنس تالاب پہ آتے ہیں چلے جاتے ہیں
اس لئے اب میں کسی کو نہیں جانے دیتا
جو مجھے چھوڑ کے جاتے ہیں چلے جاتے ہیں
میری آنکھوں سے بہا کرتی ہے ان کی خوشبو
رفتگاں خواب میں آتے ہیں چلے جاتے ہیں
شادیء مرگ کا ماحول بنا رہتا ہے
آپ آتے ہیں رلاتے ہیں چلے جاتے ہیں
کب تمھیں عشق پہ مجبور کیا ہے ہم نے
ہم تو بس یاد دلاتے ہیں چلے جاتے ہیں
آپ کو کون تماشائی سمجھتا ہے یہاں
آپ تو آگ لگاتے ہیں چلے جاتے ہیں

O

☆

یہ جو اس سے مجھے محبت ہے
اک ضرورت بلا ضرورت ہے
اپنی تعریف سن نہیں سکتا
خود سے مجھ کو بلا کی وحشت ہے
یہ مرا یوں ہی بولتے رہنا
ان کہی بات کی وضاحت ہے
اپنی تلوار تیز رکھتا ہوں
جانے کس سے مجھے عداوت ہے
دکھ ہوا آج دیکھ کر اس کو
وہ تو ویسا ہی خوبصورت ہے
بات ابھی کی ابھی نہیں ہے یاد
ایک لمحے میں کتنی وسعت ہے

O

☆

کوئی ٹکرا کے سُبک سر بھی تو ہو سکتا ہے — میری تعمیر میں پتھر بھی تو ہو سکتا ہے
کیوں نہ اے شخص! تجھے ہاتھ لگا کر دیکھوں — تُو مرے وہم سے بڑھ کر بھی تو ہو سکتا ہے
تُو ہی تُو ہے تو پھر اے جملہ جمالِ دنیا! — تیرا شک اور کسی پر بھی تو ہو سکتا ہے
یہ جو ہے پھول ہتھیلی پہ اسے پھول نہ جان — میرا دل جسم سے باہر بھی تو ہو سکتا ہے
شاخ پر بیٹھے پرندے کو اُڑانے والے — پیڑ کے ہاتھ میں پتھر بھی تو ہو سکتا ہے
کیا ضروری ہے کہ باہر ہی نمو ہو میری — میرا کھلنا مرے اندر بھی تو ہو سکتا ہے
یہ جو ہے ریت کا ٹیلہ مرے قدموں کے تلے — کوئی دم میں مرے اوپر بھی تو ہو سکتا ہے
کیا ضروری ہے کہ ہم ہار کے جیتیں تابش — عشق کا کھیل برابر بھی تو ہو سکتا ہے

...... O ......

☆

میری تنہائی بڑھاتے ہیں چلے جاتے ہیں
ہنس تالاب پہ آتے ہیں چلے جاتے ہیں
اس لئے اب میں کسی کو نہیں جانے دیتا
جو مجھے چھوڑ کے جاتے ہیں چلے جاتے ہیں
میری آنکھوں سے بہا کرتی ہے اُن کی خوشبو
رفتگاں خواب میں آتے ہیں چلے جاتے ہیں
شادیِ مرگ کا ماحول بنا رہتا ہے
آپ آتے ہیں رُلاتے ہیں چلے جاتے ہیں
کب تمھیں عشق پہ مجبور کیا ہے ہم نے؟
ہم تو بس یاد دلاتے ہیں چلے جاتے ہیں
آپ کو کون تماشائی سمجھتا ہے یہاں؟
آپ تو آگ لگاتے ہیں چلے جاتے ہیں

O

☆

دی ہے وحشت تو یہ وحشت ہی مسلسل ہو جائے
رقص کرتے ہوئے اطراف میں جنگل ہو جائے
اے مرے دشت مزاجو! یہ مری آنکھیں ہیں
اِن سے رومال بھی چھو جائے تو بادل ہو جائے
چلتا رہنے دو میاں سلسلہ دل داری کا
عاشقی دین نہیں ہے کہ مکمل ہو جائے
حالتِ ہجر میں جو رقص نہیں کر سکتا
اُس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ پاگل ہو جائے
میرا دل بھی کسی آسیب زدہ گھر کی طرح
خود بخود کھلنے لگے خود ہی مقفل ہو جائے
ڈوبتی ناؤ میں سب چیخ رہے ہیں تابش
اور مجھے فکر غزل میری مکمل ہو جائے

O

☆

اتنا آساں نہیں مسند پہ بٹھایا گیا میں — شہرِ تہمت تیری گلیوں میں پھرایا گیا میں
یہ تو اب عشق میں جی لگنے لگا ہے کچھ کچھ — اس طرف پہلے پہل گھیر کے لایا گیا میں
خوف اتنا تھا کہ دیوار پکڑ کر نکلا — اس سے ملنے کے لئے صورتِ سایہ گیا میں
تجھ سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں تھی ورنہ — ایک مدّت تری دہلیز تک آیا گیا میں
خلوتِ خاص میں بُلوانے سے پہلے تابش — عام لوگوں میں بہت دیر بٹھایا گیا میں

...... O ......

☆

عشق زادوں کے لہو کا یہ اثر لگتا ہے
آج بھی دشت میں نیزے کو ثمر لگتا ہے

کوفہ و شام مراحل ہیں گزر جائیں گے
یہ مدینے سے مدینے کا سفر لگتا ہے

اس زمانے میں غنیمت ہے غنیمت ہے میاں
کوئی باہر سے بھی درویش اگر لگتا ہے

ہمکو دل نے نہیں حالات نے نزدیک کیا
دھوپ میں دور سے ہر شخص شجر لگتا ہے

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اِک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

O

☆

دشت میں پیاس بجھاتے ہوئے مرجاتے ہیں
ہم پرندے کہیں جاتے ہوئے مرجاتے ہیں

کس طرح لوگ چلے جاتے ہیں چپ چاپ
ہم تو یہ دھیان میں لاتے ہوئے مرجاتے ہیں

گھر پہنچتا ہے کوئی اور ہمارے جیسا
ہم ترے شہر سے جاتے ہوئے مرجاتے ہیں

یہ محبت کی کہانی نہیں مرتی لیکن
لوگ کردار نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہم ہیں وہ ٹوٹی ہوئی کشتیوں والے تابش
جو کناروں کو ملاتے ہوئے مر جاتے ہیں

O

☆

میرے اعصاب معطل نہیں ہونے دیں گے | یہ پرندے مجھے پاگل نہیں ہونے دیں گے
تُو خدا ہونے کی کوشش تو کرے گا لیکن | ہم تجھے آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیں گے
یہ جو اک بیل اداسی کی اُگی ہے گھر میں | ہم اسے پھیل کے جنگل نہیں ہونے دیں گے
یار! اک بار پرندوں کو حکومت دے دو | یہ کسی شہر کو مقتل نہیں ہونے دیں گے
یہ جو چہرے ہیں یہاں چاند سے چہرے تابش | یہ مرا عشق مکمل نہیں ہونے دیں گے

...... ○ ......

☆

تجھ جیسا ہر طرف نظر آنا تو ہے نہیں
دل آئینہ ہے آئینہ خانہ تو ہے نہیں

اے ہجر! تُو ہی کر لے کوئی شکل اختیار
بچھڑے ہوؤں نے لوٹ کے آنا تو ہے نہیں

کیوں خواب اور سانپ میں رہتی ہے کشمکش
آنکھوں کی تہہ میں کوئی خزانہ تو ہے نہیں

تُو نے بھی تو اس بلندی سے مہتاب کی طرح
آتے دکھائی دینا ہے، آنا تو ہے نہیں

تجھ سے معاملہ تو ہے خود سے معاملہ
تُو زندگی ہے دوست، زمانہ تو ہے نہیں

○

☆

یار کے غم کو عجب نقش گری آتی ہے
پور پور آنکھ کے مانند بھری آتی ہے

بے تعلق ہمیں نہ جان کہ ہم جانتے ہیں
کتنا کچھ جان کے یہ بے خبری آتی ہے

اس قدر گوندھنا پڑتی ہے لہو سے مٹی
ہاتھ گھل جاتے ہیں تب کوزہ گری آتی ہے

کتنا رکھتے ہیں وہ اس شہرِ خموشاں کا خیال
روز اک ناؤ گلابوں سے بھری آتی ہے

زندگی کیسے بسر ہو گی کہ ہم کو تابش
صبر آتا ہے نہ آشفتہ سری آتی ہے

○

☆

کھا کے سوکھی روٹیاں پانی کلے ساتھ　　جی رہا تھا کتنی آسانی کے ساتھ
یوں بھی منظر کو نیا کرتا ہوں میں　　دیکھتا ہوں اس کو حیرانی کے ساتھ
گھر میں اک تصویر جنگل کی بھی ہے　　رابطہ رہتا ہے ویرانی کے ساتھ
آنکھ کی تہہ میں کوئی صحرا نہ ہو　　آ رہی ہے ریت بھی پانی کے ساتھ
زندگی کا مسئلہ کچھ اور ہے　　شعر کہہ لیتا ہوں آسانی کے ساتھ

...... O ......

☆

میں اس پہ سوچنے بیٹھوں تو حیرانی نہیں جاتی
پرندے گھر میں ہیں اور گھر سے ویرانی نہیں جاتی

وہ اکثر خواب میں آ کر مری حالت پہ روتی ہے
کہ زیرِ خاک بھی ماں کی پریشانی نہیں جاتی

کلاہ تخت سے شہزادگی بالکل نہیں مشروط
کہ جب تک ماں ہو زندہ بوئے سلطانی نہیں جاتی

عدالت سے بری ہونا بری ہونا نہیں ہوتا
معافی مل بھی جائے تو پشیمانی نہیں جاتی

O

☆

اے دوست دعا اور مسافت کو بہم رکھ
یہ میری ہتھیلی ہے یہاں پہلا قدم رکھ

ایسے تو زمانہ مجھے جینے نہیں دے گا
میں کچھ بھی نہیں تیرا مگر میرا بھرم رکھ

اس بات پہ دُنیا سے میری بنتی ہی نہیں ہے
کہتی ہے کہ تلوار اُٹھا اور قلم رکھ

میں جب بھی کہیں راہ میں گرنے لگا تابش
آواز سی آئی مرے قدموں پہ قدم رکھ

O

"عشق نے سونپی ہیں شہرتیں"

خالد احمد

(●)

کوئی تہذیب محض اپنے شاندار ماضی کے ناتے ایک بڑی تہذیب کے درجے پر فائز نہیں رہ پاتی تاوقتیکہ متعلقہ عظیم تہذیب کے ورثاء ایک زندہ تر حال میں اپنے شاندار ماضی کو ایک شاندار مستقبل سے منسلک کرنے کے عمل میں مصروف نہ ہوں۔

ہر تہذیب کا سب سے توانا اور موثر مظہر اس تہذیب کا ادب ہوتا ہے۔ پاکستانی تہذیب اپنی قدامت کے حوالے سے اور پاکستانی ادب اس قدامت کا مظہر ہونے کے ناتے ایک عظیم تر ماضی کا امین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم تر حال کا بھی حامل ہے۔ اقبالؒ، فیضؔ اور ندیم اس عظیم تر حال کے تین بڑے اہم نمائندے ہیں۔

پاکستانی ادب بہت بڑی روایات فکر وفن کے تسلسل کا منظر نامہ ہے۔ پاکستانی ادباء کی موجودہ نوجوان نسل پاکستانی روایات فکر وفن کی پاسدار ہی نہیں بلکہ نئی نویلی روایات فکر وفن کی بانی بھی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قلم اور اہل قلم دونوں کی قسم کھائی ہے اور یہ قسم قلم اور تحریر دونوں کی حرمت کی عظیم ترین شہادت ہے۔ ہم جو اہل قلم گردانے جاتے ہیں اپنے آپ سے ایک سوال ضرور کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ آیا ہمارا قلم دلوں کو گداز آشنا اور طبائع کو نیاز آشنا کر رہا ہے یا نہیں، میرا کہنا صرف اتنا ہے کہ ہمارا قلم دلوں میں گداز پیدا کرنے کی کوشش تو ضرور کرتا ہے مگر طبائع میں نیاز پیدا کرنے کی کسی کاوش کو نہ جانے کیوں اپنے دائرہ اختیار سے باہر گردانتا ہے حالانکہ طبیعت نیاز سے عاری ہو تو دل کا گداز کس کام کا؟

پروین شاکر، نجیب احمد، ایوب خاور، عباس تابش اور شوکت علی پاکستانی ادباء کی اس نوجوان نسل کے نمائندہ شعراء ہیں جس نے نہ صرف یہ کہ پاکستانی ادب کی آفاق گیر روایات کو اپنی روح میں سمویا بلکہ اپنی جرأت مندانہ ہنر مندی کا بدن بھی عطا کیا۔

نوجوان نسل کے ان نمائندہ شعراء میں عباس تابش اپنی ہنر آفرینی کے حوالے سے اپنے ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہم عصروں سے منسلک ہوتے ہوئے بھی منفرد نظر آتا ہے۔ آنکھ بدن کا چراغ ہے اور عباس تابش پاکستانی ادب کے ہرے بھرے بدن کا تازگی آفریں چراغ ہونے کے ناتے اس جسد کا نور ہے۔

پچیس برس کے عباس تابش کا نور شعور، تمہید کے نام سے طلوع ہو رہا ہے اور میں یہ سوچ کر پشیمان ہو جاتا ہوں کہ جب میں پچیس برس کا تھا تو میرے دامن میں کیا تھا؟ میرا اپنا تشخص بھی نہیں! جبکہ عباس تابش پاکستانی ادب کی بیکرانی میں "زمزمہ انا البحر" کے ساتھ "ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟" کہتا ہوا پاکستانی تشخص کی چمک بن کر شامل ہو چکا ہے۔ کسی منزل شناس کے لیے منزل کنار ہونے سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی ہے۔

عباس تابش کے فکر وفن کا تلون، اصلاً مہتاب غزل کے پیدا کردہ مدوجزر سے عبارت ہے۔ اس کی خلاق طبیعت کا مواج سمندر ہمیشہ مہتاب غزل کے کامل ہونے کے انتظار میں رہتا ہے تاکہ جوار بھاٹا جنم لے سکے جو ان گنت صدف ساحل آشنا کرنے پر قادر ہوتا ہے اور جن میں سے بیشتر انمول سطروں کے گہر اس کے دست ہنر کے لمس سے کسی اچھوتی نظم کے سلک میں پروئے جانے کے لیے سینہ کشا ہوتے ہیں۔

تمہید کی غزلیں عباس تابش کے فن کی جذبی اساس ہیں۔ اگر ایک انسان محبت کے الاؤ میں جل رہا ہو اور اس کا محبوب اس الاؤ کی بھڑک سے آشنا ہی نہ ہو تو انسان سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کتنا بے مایہ ہوتا ہے۔ اس کا ادراک صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس آگ میں جھلس چکے ہوں اگر یہ محبت "شاعری کی محبت ہو" اور یہ الاؤ "ہنر پر گرفت" کی خواہش سے بھڑکا رکھا ہو تو اس آگ میں جھلسنے والے کا حال اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جان سکتا کہ دنیا تعلقات عامہ کی تپش کے سوا کسی اور آگ سے آشنا نظر نہیں آتی۔ تمہید اسی تپش کے درمیان ایک ایسے آتش کدے کی مثال ہے جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے عباس تابش کے لیے گلزار کر دیا۔ اس کی سطروں میں گلوں کی مہک، اس اندرونی کرب کا پتہ دیتی ہے جسے گرمئ تعلقات عامہ سے نغمہ سنج افراد سمجھ ہی نہیں سکتے۔

چراغ صبح جلا کوئے ناشناسی میں
اک اور دن کا اضافہ ہوا اداسی میں

عباس تابش کے نزدیک شعر ایک ذاتی واردات کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ اسے کوئی نظریہ یا کوئی فلسفہ نہیں سمجھتا۔ اگر اس کے اشعار پڑھتے ہوئے آپ پر بھی وہی کیفیات وارد ہوتی چلی جائیں تو ٹھیک ہے ورنہ دوسری صورت میں عباس تابش آپ کو مجبور تامل نہیں کرے گا کہ یہ اس کا مسلک نہیں۔ وہ تو اپنی بات اپنے انداز میں کرتا چلا جاتا ہے۔ کوئی اس کے تجربے کا حصہ دار ٹھہرتا ہے تو ٹھیک ہے اور اگر کوئی اس کے تجربے کا حصہ دار نہیں بن پاتا تو بھی ٹھیک ہے کہ عباس تابش اپنی طبیعت میں نیاز رکھتے ہوئے بھی ذرا ہٹ دھرم واقع ہوا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ایک صاحب اسلوب فن کار کا ذرا سا ضدی ہونا فطری طور پر ضروری ہوتا ہے کیونکہ سمجھوتے کا رویہ ایک شاعر کو "مقبول شاعر" کے درجے پر تو فائز کر سکتا ہے "صاحب اسلوب شاعر" ہرگز نہیں بننے دیتا۔ وہ شعراء جو اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ مقبول بھی ٹھہریں ان کے معاملے میں سمجھوتہ قاری کی طرف سے ہوتا ہے۔ غالب ایک ایسی ہی مثال ہے۔

تمہید کو پڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ تمہید کا قاری بالآخر عباس

تابش سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جائے گا کیونکہ اس کی غزلوں میں نمایاں جذبی اساس پر استوار ہونے والے شہرِ سخن کے فکر بوس بلند و بالا میناروں کا پہلا رو پہلا منظر، تمہید میں شامل نظموں کے چمکیلے پیش منظر پر مشتمل ہے۔

یہ مجموعہ کلام غزل پرستوں کے لیے ایک تازہ تر برگ سبز کا درجہ رکھتا ہے تو نظم پرستوں کے لیے مستقبل کی دھند کے پیچھے ایک جھلمل شہر کے بس چکنے کی نوید ہے۔ تمہید کے پہلے مطالعے نے مجھے ایک آوارہ بادل کے سنہری کناروں کی یاد دلائی۔ اس آوارہ بادل کے پیچھے روشن سورج کی نورانی تپش کا اندازہ وہی لوگ کر سکیں گے جو ایک بار پلٹ کر یہ دیکھنا پسند کر لیں گے کہ جب وہ پچیس برس کے تھے تو ان کے دامن میں کیا تھا؟

تمہید میں عباس تابش نے بنیادی بات کیا کی ہے؟ تمہید میں در آنے والا بنیادی سوال کیا ہے؟ آپ مجھ سے یہ بات پوچھنے کا حق رکھتے ہیں، اور میں اس سوال کا جواب ضرور دوں گا۔ عباس تابش کہتا ہے:

تجھے قریب سمجھتے تھے گھر میں بیٹھے ہوئے
تری تلاش میں نکلے تو شہر پھیل گیا

چیز دونوں کو حسب ہنر چاہیے
اس کو دیوار دے، مجھے کو سر چاہیے
چند لمحوں کی شوریدگی کیا کروں
یہ تسلسل مجھے عمر بھر چاہیے

کف خیال پہ عکس نشاط رنگ ترا
نہیں بنانے کا یارا، مگر بناتے ہیں

یوں تو سبھی کو عشق نے سونپی ہیں شہرتیں
لیکن کبھی کبھی کوئی گمنام ہی سہی
گر کر ہی ٹوٹنا ہے تو اے پیکر غبار
بام بلند و زینہ ایام ہی سہی
کوئی تو ہو کہ جس سے گلے مل کے روئیں ہم
گر تم نہیں تو گھر کے در و بام ہی سہی

ہر ناکامی نے ایسے بھی کچھ دیواریں کھینچی ہیں
اک بے نقشہ شہر بنا ہے لاحاصل تدبیروں کا

درج بالا تمام اشعار زندگی کو ایک رخ سے دیکھنے کی کوشش مگر دوسرے رخ کے سامنے آ جانے کی داستان سناتے ہیں اور پھر ان دونوں رخوں کے درمیان زندگی بسر کرنے کی کاوش کا اظہار کرتے ہیں مگر یہ تمام خواہشیں کاہشیں قرار پا جاتی ہیں اور زندگی لاحاصل تدبیروں کے بسائے ہوئے ایک بے نقشہ شہر کی مثال بن کے رہ جاتی ہے، یہ بات تجربے کی ہے اگر کوئی اس تجربے سے نہیں گزرا اور اسے ان گنت فلاسفہ اور اہل دانش کے اقوال یاد ہیں اور وہ انہیں حتمی سچائیاں گردانتا ہے تو عباس تابش کے درج بالا اشعار اس کی تشفی نہیں کر پائیں گے اور شاید انہی حضرات کے لیے عباس تابش کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا جو کچھ یوں ہے:

یہ ہم کو کون سی دنیا کی دھن آوارہ رکھتی ہے
کہ خود ثابت قدم رہ کر ہمیں سیارہ رکھتی ہیں

اگر عباس تابش کے دوست ''کف خیال پہ عکس نشاط رنگ ترا، نہیں بنانے کا یارا مگر بناتے ہیں'' جیسے اشعار میں پنہاں کرب سے نہیں گزرتے تو کم از کم وہ اتنا ضرور سوچ سکتے ہیں کہ عالمی منظر، معلوم تاریخ میں جوں کا توں رہنے کا بھی، انہیں کون سی دنیا کی دھن آوارہ رکھتی ہے اور اگر اب بھی وہ عباس تابش کے بنیادی سوال سے آگاہ نہیں ہو پائے تو وہ عباس تابش کی اس فریاد کو ہی سوال گردان لیں تو ان کی بڑی مہربانی ہوگی۔

میرے سینے سے ذرا کان لگا کر دیکھو!
سانس چلتی ہے کہ زنجیر زنی ہوتی ہے؟

اگر آپ کے پاس اس سوال کا جواب ہے تو پھر جان لیں کہ عباس تابش نے تمہید میں کوئی سوال نہیں اٹھایا ہے البتہ اس نے کچھ خواب ضرور دیکھے ہیں اور وہ خواب ''باغ جناح'' میں تجسیم پا گئے ہیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے حبیب نبی اکرم ﷺ کے طفیل عباس تابش کے منزل فن کی طرف اس پہلے جرأت مندانہ مگر بہت ہی سنبھلے ہوئے قدم کے جمنے اور اگلے قدم کے رکھنے کے لیے مضبوط اور پاؤں پکڑنے والی زمین مرحمت فرمائے کہ اس کی رضا کے بغیر ہر انسانی کوشش پادر ہوا رہ جاتی ہے۔

شعور کا انگیخت

عباس تابش کی شاعری ''از دل فیزد، بردل ریزد'' کی عمدہ تفسیر ہے وہ قلم سے نہیں، دل سے شعر لکھتے ہیں جذبے کا وفور، قاری کے شعور کو انگیخت کر کے اسے ایسی شعری دنیا میں لے جاتا ہے جو عباس تابش کی دنیا ہے۔ ان کا لہجہ غزل کا لہجہ ہے ان کا اسلوب غزل کا اسلوب ہے ان کا ڈکشن غزل کا ڈکشن ہے اور ان سب پر عباس تابش کے دستخط ثبت ہیں اور یہ دستخط خونِ دل سے کیے گئے ہیں۔

محمد شہزاد نیئر

اقلیم، ولایتیں اور سرخ خیمہ

ڈاکٹر اظہار الحق
(اسلام آباد)

ساٹھ کی دہائی کے آواخر میں جب میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شہرۂ آفاق شعبہ معاشیات کا طالب علم بننے کے لیے شہرِ سبزہ وگل میں اُترا، گم ہوجانے والے اور سراغ نہ چھوڑنے والے شبیر شاہد نے لگتا ہے میرے لیے ہی کہا تھا:

فضائے ساحل کی اوٹ سے جھانکتا جھلکتا
وہ شہرِ حسن و جمال بھولا نہیں ہے مجھ کو
نگاہ میں ہے شکوہ اس کی عمارتوں کا
وہ معبدوں کا جلال بھولا نہیں ہے مجھ کو

میرا سن انیس برس کا تھا۔ اردو کی جدید شاعری میرا اوڑھنا بچھونا تھی۔ میں اسی کے ساتھ جاگتا اور اسی کے ساتھ سوتا تھا۔ احمد ندیم قاسمی کی دشتِ وفا، مجید امجد کی شب رفتہ، ناصر کاظمی کی برگ نے، ظفر اقبال کی آبِ رواں، منیر نیازی کی تیز ہوا اور تنہا پھول، احمد فراز کی دردآشوب وہ شعری مجموعے تھے جو مجھے تقریباً از بر تھے اور میں ان میں سے کسی بھی وقت اپنے کیسے سے کچھ بھی نکال سکتا تھا۔ سوئے اتفاق تھا یا حسنِ اتفاق کہ یونیورسٹی میں جس کلاس فیلو سے میری دوستی ہوئی وہ جدید اردو شاعری سے ناآشنا لیکن کلاسیکل شعراء کا دلدادہ تھا میں ناصر کاظمی کا شعر پڑھتا تو وہ مصحفی کا شعر سناتا۔ میں ظفر اقبال کا حوالہ دیتا تو وہ آتش کو بیچ میں لے آتا اور میں مجید امجد کا نام لیتا تو وہ میر تک پہنچ جاتا۔ منڈی میں اشیاء کی طلب اور رسد خود ہی قیمتوں کا تعین کر دیتی ہے۔ میں تو کلاسیکی شاعری کے بحرِ بے کنار کا شناور نہ ہوسکا لیکن میرا دوست جدید شاعری کی لپیٹ میں آ گیا اور پھر ایک وقت وہ آیا کہ اس نے ہوسٹل میں اپنے کمرے کے دروازے پر میرے استاد ظہیر فتح پوری کا یہ شعر لکھ دیا:

مرے من موہن ترے مکھڑے پر کھلے بیلے کا سجیلا پن ہے
نصیبہ اب کے بہت اترا یا تبسم ہے یا کنول روشن ہے

اس زمانے سے لے کر قریب کے زمانے تک میں اردو شاعری کے حوالے سے ایک قسم کی ثنویت کا شکار رہا۔ جب جدید شاعری پڑھنے کا موڈ ہوتا تو میں اپنی لائبریری سے منیر نیازی یا مجید امجد نکالتا اور جب کلاسیکل شعراء پڑھنے کو دل چاہتا تو میر انشاء اور ناسخ کے دواوین اٹھالیتا، سفر میں بھی ایک کتاب سے کام نہ نکلتا۔ حافظ کے ساتھ نادر نادرپور یا فروغ فرخ زاد کو بھی شامل کرنا پڑتا۔
لیکن یہ اس وقت تک تھا جب تک میں نے عباس تابش کو نہیں پڑھا تھا۔

مجھے یاد نہیں عباس تابش کی غزل میں نے پہلی بار کہاں پڑھی تھی، کسی ادبی جریدے میں تھی یا اس کا شعری مجموعہ تھا۔ لیکن مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ میں دم بخود رہ گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا یہ شاعر کون ہے، جو بیک وقت جدید بھی ہے اور کلاسیکل بھی جس کا شعر چونکا دیتا ہے اور ساتھ ہی ایک ایسی طمانیت بھی بخشتا ہے جو غائب و حاضر دونوں تک رسائی دیتی ہے۔ کیا آپ نے جدت اور کلاسیک کا اس سے بہتر امتزاج دیکھا ہے؟

لفظوں سے چھاؤں وضع کی، سطروں کو سائباں کیا
جیسے بھی ہو سکا بسر وقتِ زوالِ جاں کیا
دل کو کسی کا سامنا کرنے کی تاب ہی نہ تھی
اچھا کیا کہ آنکھ نے آنسو کو درمیاں کیا

جدید شاعری کا طالب علم کلاسیکل شعراء سے کیوں گریزاں ہے؟ اس لیے کہ قدیم فارسی غزل سے ورثے میں ملے ہوئے تلازمے اپنی کشش کھو چکے ہیں۔ وہی صحرا اور اس کے ساتھ محمل اور قیس، وہی کشتی اور اس کے ساتھ گرداب اور ساحل، وہی باغ اور اس کے ساتھ قفس اور صیاد، عباس تابش نے کمال یہ کیا کہ اسی لفظیات کو نیا زاویہ دیا اور اسی جسم کو نیا پیراہن عطا کیا یوں کہ یہ علامتیں بجائے خود جدت کا نشان بن گئیں:

اس کو مدت سے کوئی قیس نہیں ملتا تھا
میری دہلیز پہ صحرا کو ضرورت لائی
یہ دشتِ قیس کہ اب خاص کر کسی کا نہیں
یہ فیضِ عشق علیہ السلام میرا ہے

کشتی کو ہماری کلاسیکی شاعری میں ہمیشہ زندگی کی بقا کی علامت سمجھا گیا، یہاں تک کہ اسے ڈوبنے سے بچانے کے لیے اس سے سامان تک اتار لیا گیا۔ گرداب تھا یا ساحل، بادبان تھا یا ناخدا، طوفان تھے یا جزیرے یا دور منڈلانے والے پرندے، سب کشتی کو پار لگانے میں مصروف تھے۔ روایت کی اس کہنگی سے ماضی قریب کے شاعر بھی دامن نہ چھڑا سکے۔

کچھ لوگ جو سوار ہیں کاغذ کی ناؤ پر
تہمت تراشتے ہیں ہوا کے دباؤں پر
(احسان دانش)

عباس تابش نے اس قدامت کی بساط ہی الٹ دی:

مجھے بھی اوروں کی طرح کاغذ ملا ہے لیکن
میں اس سے کشتی نہیں سمندر بنا رہا ہوں

تو پھر تار کیسے اترا جائے؟
عباس تابش پھر وہی مدد کو آتا ہے:

ملتی نہیں ہے ناؤ تو درویش کی طرح
خود میں اتر کے پار اتر جانا چاہیے

یہ بجا ہے کہ عباس تابش سے میرا اولین تعارف جدت اور کلاسیک کے امتزاج کے حوالے سے ہوا لیکن جیسے جیسے میں اس کو پڑھتا گیا، یہ ابتدائی حوالہ دور ہوتا گیا اور حیران کن مناظر سامنے آنے لگے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی بار مسجد قرطبہ دیکھنے گیا تو اس کے بیرونی احاطے وہاں کے لگے ہوئے خوبصورت درختوں اور دیواروں کے باہر کے حصے کو غور سے دیکھنے لگا، لیکن جب عمارت کے اندر داخل ہوا تو حیرت سے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ٹھہر گیا۔ آپ جب پہلی بار لندن یا نیویارک کے ہوائی اڈے پر اترتے ہیں تو ائیر پورٹ کو غور سے AWE سے دیکھتے ہیں لیکن جب اصل شہر کے عجائبات دیکھتے ہیں تو پہلا بصری تعارف پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ عباس تابش کی کلیات، بہت دن میرے تکیے کے نیچے رہی اور اس نے کئی روز میرے سفری تھیلے میں بھی پڑاؤ کیا۔ اس کی شاعری پڑھ کر ہر بار میری زبان پر فارسی کا یہ شعر آیا:

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

عباس تابش کی شاعری کیا ہے؟ ایک وسیع اقلیم ہے، اس اقلیم کی کئی ولایتیں ہیں۔ ہر ولایت کا الگ انتظام ہے۔ ایک ولایت درختوں کے سپرد ہے۔ ایک ولایت کے انصرام پر پرندے مامور ہیں۔ ایک ولایت میں صرف محبت کے معاملات طے ہوتے ہیں۔ ایک ولایت باطنی اور خارقِ عادت (Metaphysical) امور کے لیے وقف ہے۔ سلطنت کے ایک حصے پر کربلا کے کنائے اور استعارے حکومت کر رہے ہیں۔ سب سے آخر میں سرخ رگ کا ایک بہت بڑا خیمہ ہے۔ یہ اس ولایت کا صدر مقام ہے اور اوپر بیان کی ہوئی ساری ولایتوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اس کا حسن اتنا بے پناہ ہے اور اس کی شوکت و ثروت اس قدر بے نظیر ہے کہ اسے کوئی نام ہی نہیں دیا جا سکتا۔

آیئے ذرا ان ولایتوں کی ذرا ذرا سی جھلک دیکھتے چلیں۔

عباس تابش محبت کی بازی میں شاطر نکلا اور اس نے سب سے پہلے درختوں کے ساتھ معاملہ کیا۔ وہ اس عقل مند عاشق کی طرح ہے جو شہزادی کے عشق میں کامیاب ہونے کے لیے پہلے محل کی کنیزوں سے راہ و رسم استوار کرتا ہے:

اگر قریب سے گزروں تو ایسا لگتا ہے
یہ پیڑ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں

محبت کی مہم میں درختوں کی حمایت فتح کی ضمانت ہے اور یہ چال چل کر عباس تابش نے سپہ سالارانہ مہارت کا ثبوت دیا۔ مجھے اپنی ایک نظم ''درختوں کے لیے ایک نظم'' کا ایک حصہ یاد آ رہا ہے:

میں جتنے راستوں پر چلا ہوں
اور میں نے جتنے دریا عبور کیے ہیں
اور میں جتنے پہاڑوں پر چڑھا ہوں
اور میں نے جتنے سنگدلوں کو چاہا ہے
اور میں جتنی راتوں کا جاگا ہوں
اور میں نے جتنی مسرتیں کاشت کی ہیں
اور میں نے جتنے غم کاٹے ہیں
اور میں نے جتنے پیاروں کو گم کیا ہے
وہ سب
مجھے درختوں کے حوالے سے یاد آتے ہیں
اس لیے کہ
درختوں کے ساتھ ٹیک لگا کر
اور درختوں کے چلتے سایوں کے ساتھ ساتھ
بان کی کھر دری چار پائیاں گھسیٹ کر
اور درختوں کو دیکھ کر
اور درختوں سے بغل گیر ہو کر
ہم نے معاملے طے کیے تھے
اور درختوں کو گواہ بنا کر
کنارے سے رخصت ہوئے تھے
اور درختوں کو زینہ بنا کر
اُوپر گئے تھے
ہم نے درختوں کو اپنے سروں پر رکھا تھا
اور شام کے وقت قریے میں واپس آئے تھے
اور جب رخصت ہوئے تھے
تو صرف درختوں کے دل درد سے پھٹے تھے

عباس تابش نے بھی درختوں کی وساطت سے معاملے طے کیے۔ اس نے ان سے رات کے آخری حصے میں بات کی۔ اس نے ان کے دکھوں کو اپنے دکھوں سے مماثل پایا۔ وہ خشک پتوں کے ساتھ اڑا تو درختوں نے اسے واپس بلایا۔ اس نے درختوں پر بور لگنے کے انتظار میں کئی موسم خالی گزار دیئے۔ اسے درختوں سے شکوے بھی تھے:

عجیب پیڑ ہیں ان کو حیا نہیں آتی
ہمارے سامنے کپڑے بدلنے لگتے ہیں

پھر اس کے بعد پھلوں میں مٹھاس آئی نہیں
شجر نے کام لیا تھا غلط بیانی سے

لیکن وہ جیسے بھی تھے، اس کے اپنے تھے:

اپنے ہم زاد درختوں میں کھڑا سوچتا ہوں
میں تو آیا تھا انہیں آگ لگانے کے لیے

پرندے عباس تابش کے شعری نظام کا دوسرا بڑا حصہ ہیں، سہیل احمد خان کی نظموں کے مجموعے ''ایک موسم کے پرندے'' کے عباس تابش پہلا شاعر ہے جس کے ہاں پرندے ایک منظم سیٹ اَپ کا حصہ ہیں۔ محبت کی ایک مضبوط علامت کے عہد پر عباس تابش نے جس سرخ پرندوں سے کام لیا ہے اس سے شاعری پر اس کی دسترس اور مضمونِ شعر پر اس کی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ کبھی اس کے ہاں پرندے پیاس کے سفیر بن کر ابھرتے ہیں:

دشت میں پیاس بجھاتے ہوئے مر جاتے ہیں
ہم پرندے کہیں جاتے ہوئے مر جاتے ہیں
ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

اور کبھی یہی پرندے وحشت کی پہنائیوں میں شاعر کا ساتھ دیتے ہیں، وحشت کی یہ پہنائیاں عاشقانہ بھی ہیں اور سیاسی اور معاشرتی بھی:

ہمیں سماعتِ بے لفظ کی اجازت ہے
ہمارے ساتھ پرندے کلام کرتے ہیں

نفسانفسی اور افراتفری کا وہ دور ہے کہ شاعر کو پرندوں کی سلامتی کی فکر ہے۔ پرندے اس کے لیے معصومیت اور کمزوری کی علامت ہیں۔ معاشرہ بدقسمتی سے اس مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں معصوم اور کمزور ہونا خطرناک ہے۔ عباس تابش سارے معصوموں اور کمزروں کے لیے دعا کرتا ہے:

ان کے بچوں کو خدا سانپ سے محفوظ رکھے
دن میں ہوتے ہیں پرندوں کے ٹھکانے خالی

ثروت مند طبقے کو جو معاشرے کے زیریں حصے سے بے نیاز ہے، عباس تابش کتنے مہذب انداز میں نصیحت کرتا ہے:

تلاشِ رزق میں بھٹکے ہوئے پرندوں کو
میں جیب خرچ سے دانہ کھلایا کرتا تھا

لیکن عباس تابش جہاں قلم توڑ کر رکھ دیتا ہے وہ معاملاتِ محبت ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ مومن کے بعد معاملات جس طرح عباس تابش نے طے کیے ہیں شاید ہی کسی اور نے کیے ہوں۔ مومن نے معاملہ بندی پر ایسے ایسے اشعار کہے ہیں جو اردو شاعری میں اپنی مثال آپ ہیں:

وحشت سے میری سارے احبا چلے گئے
آنا ہے گر تو آؤ کہ خالی مکاں ہے اب

گر دیکھ کر ہنس دیا ہمیں تو
منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم
بت خانہ چیں ہو گر ترا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

سب نوشتے ترے اغیار کو دکھلاؤں گا
جانتا ہے تو مرے پاس ہیں کیا کیا کاغذ

عباس تابش کی معاملہ بندی کے اشعار مغل مصوری کی یاد دلاتے ہیں یا ان خوبصورت پینٹنگز کی جو دیوانِ حافظ اور رباعیات عمر خیام کے ایران میں چھپے ہوئے نسخوں میں لگی ہوتی ہیں اور نظر اور دل دونوں کا دامن کھینچتی ہیں۔ ابر چھایا ہوا ہے، باغ میں پھولوں اور درختوں کی بہار ہے، خوبصورت طائر اِدھر اُدھر اڑ رہے ہیں۔ دو مسندوں پر عاشق اور معشوق بیٹھے ہیں۔ خدام جام لیے کھڑے ہیں لیکن شکوے ہیں کہ ختم نہیں ہو رہے۔ ہاتھ سینے پر دھرا ہے، سر پاسِ ادب سے خم ہے لیکن دل کی بات زبان پر لائے بغیر چارہ نہیں کہ جانے پھر قربت کب میسر ہو:

کب تمہیں عشق پہ مجبور کیا ہے ہم نے
ہم تو بس یاد دلاتے ہیں چلے جاتے ہیں
آپ کو کون تماشائی سمجھتا ہے یہاں
آپ تو آگ لگاتے ہیں چلے جاتے ہیں

ناصر کاظمی نے کہا تھا:

پھر ایک طویل ہجر کے بعد
صحبت ہوئی برقرار کچھ دیر

عباس تابش کو بھی یہ صحبت ایک طویل جانکاہ سفر کے بعد میسر آئی ہے لیکن اس نے اس نادر موقع کو ناصر کاظمی سے بہتر استعمال کیا ہے۔ وہ روایتی شاعر کی طرح محض سپردگی اور تسلیم کا شیوہ نہیں رکھتا۔ وہ کھل کر بات کرتا ہے اور جو کہنا چاہتا ہے کہہ دیتا ہے۔ مگر عشق کے دائرے کے اندر رہ کر:

تجھ تک پہنچ کے اس لیے آنکھیں بھر آئی ہیں
میں بھولتا نہیں کوئی ٹھوکر لگی ہوئی

پھر وہ اور زیادہ ہمت کا مظاہرہ کرتا ہے:

یہ روز و شب ہماری ترجیح میں نہیں ہیں
ہم تو جمالِ جاناں تجھ کو بسر کریں گے

میں نے کچھ دیر پہلے ایک سرخ خیمے کا ذکر کیا تھا جو عباس تابش کی سلطنت کے سب سے خوبصورت منطقے مین نصب ہے اور جہاں عباس تابش اپنے پسندیدہ ہم نشینوں کے ساتھ بزمِ خاص آراستہ کرتا ہے۔ اب میں آپ کو اسی خوبصورت خیمے کی طرف لے کر جا رہا ہوں اور عباس تابش کے وہ اشعار سنانے لگا ہوں جن کے بارے میں یہ بتانا کم از کم میرے لیے ممکن نہیں کہ ان کے قدم براہِ راست سینے پر کیوں جا پڑتے ہیں؟ ایک شعر کیوں اچھا لگتا ہے؟ اس کا جواب آج تک کوئی نہیں دے سکا۔ اس لیے کہ نقادوں نے ایک اچھے شعر کی جتنی خوبیاں بیان کی ہیں، بارہا ایسا ہوا ہے کہ وہ سب خوبیاں ایک شعر میں موجود ہوتی ہیں لیکن وہ اچھا نہیں لگتا۔ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ خارج از بحر شعر پڑھنے والے

شعر کو موزوں انداز میں پڑھنا سکھایا جائے اور جس طرح دنیا کی معلوم تاریخ میں آج تک کوئی ایسا مکتب سکول یا تربیتی ادارہ وجود میں نہیں آیا جہاں ناشاعر بنایا جاسکے۔ بالکل اسی طرح اچھے شعر کی تعریف کرنا ناممکن ہے۔ کیا کبھی کسی کو بتایا گیا ہے کہ اگر تم نے عاشق ہونا ہے تو اتنی قامت اور ایسے چہرے اور ایسی آنکھوں اور ایسے ہونٹوں والی حسینہ سے عشق کرنا اور کیا اس Process کو ضبطِ تحریر میں لایا جا سکتا ہے جس کے نتیجے میں عشق ہوتا ہے۔

سو! آپ Process کی میکانیات میں پڑے بغیر اشعار پڑھیے:

تو جانتا نہیں مرے مالک مکان کو
اے دوست! کوئی چیز ادھر کی ادھر نہ ہو

اس زمانے میں غنیمت ہے غنیمت ہے میاں
کوئی باہر سے بھی درویش اگر لگتا ہے

خدا پہ چھوڑیے صاحب معاملہ دل کا
ہماری عمر میں قول و قسم نہیں ہوتے
عجیب لوگ ہیں یہ خاندانِ عشق کے لوگ
کہ ہوتے جاتے ہیں قتل اور کم نہیں ہوتے

گزر رہا ہوں کسی قریۂ ملامت سے
قدیم سلسلہ داری کو عام کرتا ہوا

اے قامتِ دلدار! گزشتہ کی معافی
پہلے کوئی معیار نہیں تھا مرے آگے

ابھی نہ کوئے ملامت کو بند کیجیے گا
کہ اس طرف سے گزر صبح و شام میرا ہے
نہ ڈھونڈیے یہاں بد نظمی زمانہ کو
یہ میرا دل ہے یہاں انتظام میرا ہے

یوں بچایا ہے مجھے مجھ خدا نے میرے
سنگ جو ہاتھ میں تھا اب ہے سرہانے میرے

یہ جو مٹی کی طرح ہم کو بٹھا دیتا ہے تو
موسمِ گریہ! ترا یہ سلسلہ قائم رہے

یہ جو میں نے چند اشعار پیش کیے ہیں تازہ شعری مجموعے ''رقصِ درویش'' سے ہیں ورنہ عباس تابش کے سارے مجموعوں سے نشتر نکالے جائیں تو بہتر سے کیا کم ہوں گے!

عباس تابش کی شاعری اس کی عمر سے آگے ہے۔ میری اور میری طرح اس کی شاعری کے بہت سے دلدادگاں کی دعا ہے کہ وہ لمبی عمر پائے اور اس کی شاعری اس کی عمر سے آگے ہی رہے۔ مجھے یقین ہے کہ انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔ اس لیے کہ اس نے (کم از کم اب تک) تکبر کو پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ جس نے بھی دو مصرعے موزوں کر لیے اس نے خود کو پورا اور میر کو آدھا شاعر قرار دیا لیکن عباس تابش پانچ جاندار کتابوں کا مصنف ہونے کے باوجود مطمئن نہیں اور مزید امکانات کا در باز کیے بیٹھا ہے:

زندگی بھر میں کوئی شعر تو ایسا ہوتا
میں بھی کہتا جو مرا زخم دروں ہے یوں ہے

یہ رویہ اسی کا شیوہ ہوتا ہے جس کے سر پر ستارۂ بلندی چمک رہا ہو۔

مراسمِ عشق

عباس تابش کی شاعری پیش نظر ہے اور دل انبساط و سرشاری کی اُن منزلوں میں ہے جہاں نعمت پر شکر لازم و واجب گردانا جاتا ہے۔ پروین شاکر، ثروت حسین، جمال احسانی اور اظہار الحق کے بعد عباس تابش اُردو غزل کی روایت کو ثروت مند بنانے والی نسل کے میرے نزدیک سب سے نمایاں شاعر ہیں۔ ایک مکمل شاعر جو غزل کی کلاسیکی روایت کے دائروں میں رہتے ہوئے مضمون تازہ کی نئی راہیں نکالتا ہے اور غزل بہ غزل اور کتاب بہ کتاب بلندیوں کی طرف گامزن ہے۔ عباس تابش اپنی نسل کے مقبول ترین شاعروں میں ہیں تو اس کا سبب صرف مشاعرہ بازی نہیں ہے بلکہ اس کا دار و مدار اُس مسلسل فنی ریاضت پر ہے جس سے عباس تابش کی غزل نمود کرتی ہے۔ معمولات و مراسمِ عشق کو نئے ڈھنگ سے باندھنا مشکل کام ہے مگر عباس تابش ان مرحلوں سے بھی بہت کامیاب گزرے ہیں۔ عباس تابش نے مشاعرہ بنیاد شعری مقبولیت کے باوجود اپنے آپ کو تکرار سے محفوظ رکھا ہے تو اس کا یہ ہنر بھی قابل داد ہے۔ مشاعرے کی داد کے اُڑائے ہوئے غبار میں کیسی کیسی توانا آوازیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ اہل قلم اس سے بخوبی واقف ہیں۔ اکیسویں صدی کی غزل کو وقار و اعتبار بخشنے والوں کا جب بھی ذکر ہوگا عباس تابش کا نام بہت نمایاں نظر آئے گا مجھے اس کا یقین ہے۔

افتخار عارف

''محبت کی کہانی نہیں مرتی''

عابد حسین عابد
(میاں چنوں)

اردو ادب کے ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد اردو غزل میں ہجرت کا موضوع بہت نمایاں دکھائی دیتا ہے، نتیجہ بچھڑے ہوؤں کی یاد، گھر بار چھوڑ کر آنے کا دکھ اور اجنبی ماحول کا احساس اتنی شدت سے ابھر کر سامنے آیا کہ ہر طرف مایوسی اور نا امیدی کی فضا قائم ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک معروف غزل گو شاعر کے متعلق کہا جانے لگا کہ ''اس کی شاعری پڑھ کر طبیعت خودکشی کی طرف مائل ہوتی ہے'' اس شعری رجحان کو ایک عرصہ تک مقبولیت حاصل رہی۔ ادب کی دیگر اصناف خصوصاً افسانے میں بھی تقریباً یہی باتیں دہرائی جاتی رہیں سو ایک پچھتاوے کا احساس بیدار ہوا۔ اور یوں محسوس ہونے لگا کہ شاید ہم اجتماعی طور پر کوئی جرم کر بیٹھے ہیں۔

چونکہ بات غزل سے شروع ہوئی تھی لہٰذا واپس اپنے موضوع کی طرف آتا ہوں۔ مختصراً عرض کرتا چلوں کہ غزل ترقی پسند تحریک کے اثرات قبول کرتے ہوئے جدت، فلسفہ و سائنس، اساطیری علامتوں اور نئی زبان کے مختلف مراحل طے کرتی ہوئی نوے (۹۰) کی دہائی یعنی گزشتہ صدی کے آخر تک آ پہنچتی ہے اب اسے موجد کے طور پر اپنا نام رجسٹرڈ کروانے کے شوق میں تجربات کی بھینٹ چڑھایا جانے لگا۔ سطحی عشقیہ مضامین، کمزور زبان، لطیف کلام سے محرومی اور اپنے قدیم تہذیبی ورثے یعنی کلاسیکی روایت سے یکسر کٹی ہوئی غزل کہنے کا رواج عام ہوا، یوں غزل ایک بازاری جنس کی شکل اختیار کر گئی، جسے طلب و رسد کے قانون کے تحت لکھا اور بیچا جانے لگا۔ عشق کے مفہوم سے نا آشنا، کمرشل ازم کے علمبردار، فلرٹ کرنے والوں کو بہر حال سہولت میسر ہوئی، بہت سوں نے اپنے جعلی عشقیہ جذبات دوسروں تک پہنچانے کے لیے خطوط کا کام شاعری کی کتابوں سے لیا۔

اس قسم کی شاعری تخلیق کرنے اور کتابوں کا ''مخصوص'' نام رکھنے کے کار خیر میں ہمارے چند سینئر شعراء نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے۔ ان حالات میں چند شاعر ایسے بھی ہیں جنہوں نے کلاسیکی شعری ورثے سے رشتہ استوار رکھا۔ ماضی کی عظیم شعری روایت کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار بخوبی ادا کیا اور کر رہے ہیں انہی چند شاعروں میں سے ایک نام عباس تابش کا ہے۔ جس کے نئے شعری مجموعے ''پروں میں شام ڈھلتی ہے'' کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے نئے امکانات اور آج کے موضوعات کی حامل جدید غزل، روایت کے اندر رہتے ہوئے آج بھی اتنی ہی متاثر کن اور تازگی سے بھرپور ہے، جتنی ہمیں میر اور غالب کے زمانے میں پڑھنے کو ملتی ہے۔ اس کتاب میں غزل کی تہذیبی فضا آج کے عہد میں سانس لے رہی ہے زبان و بیان اور طرزِ پیش کش بے ساختگی کا منہ بولتا ثبوت ہے، یہ فن برسوں کی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے اس کے لیے مکمل سنجیدگی کے ساتھ پورے پراسس سے گزرنا پڑتا ہے اس بات کا اعتراف عباس تابش نے کچھ اس طرح کیا ہے۔

یوں بھی عذاب ہجر سے میں نے گزر کیا
شب کی بجائے میر کا مصرعہ بسر کیا

ابھی پچھلے دنوں محترم ظفر اقبال سے عباس تابش کی اس کتاب کا میں نے ذکر کیا۔ تو کہنے لگے، میری ہمیشہ اس کے متعلق اچھی رائے رہی ہے بلکہ میں نے ایک جگہ لکھا بھی ہے کہ ''اگر کسی نے مصرعہ کہنا سیکھنا ہو تو عباس تابش کی شاعری پڑھے'' مذکورہ کتاب میں تقریباً چھ سات جگہوں پر میر کے حوالے سے اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ فن عباس تابش نے کس سے سیکھا؟ یہی وجہ ہے کہ نہ تو کوئی ابلاغ کا مسئلہ سر اٹھاتا ہے نہ کہیں خیال مجروح ہوتا ہے۔ شاعر کے بے پناہ تخلیقی وفور کی بدولت قاری شاعری کی کلاسیکی روایت کا خط اٹھاتا ہے۔

تو محبت کی غرض لحہ موجود سے رکھ
تیرے ذمے نہ مرے درد پرانے لگ جائیں

پھر اس کے بعد یہ بازارِ دل نہیں لگنا
خرید لیجیے صاحب غلام آخری ہے

میرا زور و زر نہ پوچھو میری صورت پر نہ جاؤ
عشق کرتا ہوں تو اس کا حوصلہ رکھتا ہوں میں

بس میری محبت سے غرض رکھی ہے اس نے
وہ شخص مرے اور مسائل نہیں سمجھا

اب میری جان جاتی ہے مجنوں کے نام سے
پہلے پہل یہ لگتا تھا ایسا تو میں بھی ہوں

ہمارے جیسے وہاں کس شمار میں ہوں گے
کہ جس قطار میں مجنوں کا نام آخری ہے

محبت کی کہانی نہیں مرتی لیکن
لوگ کردار نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

الیکٹرانک میڈیا کی ترقی نے جہاں فوری رابطے کی سہولت پیدا کی

وہاں مجلسی زندگی کا خاتمہ بھی ہوتا گیا ایک دوسرے کے دکھ درد سے آ گاہی، بے خبری، لاتعلقی اور بے حسی کا روپ اختیار کرتی چلی گئی۔ عالمی سامراج نے قدرتی وسائل اور منڈی پر قبضے کی لڑائی میں ایک گھناؤنے کھیل کا آغاز کیا، سادہ لوح ان کے جھانسے میں آئے اور ریاکاروں نے خوب دولت سمیٹی۔ ملکی اور عالمی سطح پر تقسیم کا عمل شروع ہوا۔ انسان ایک دوسرے کے قریب آنے کی بجائے مختلف خانوں میں بٹ گئے۔ سیاست مذہب اور فرقوں کے نام پر قتل وغارت کا وہ بازار گرم ہوا کہ الاماں! دم توڑتے تہذیبی اداروں میں ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ تیزی سے آگے بڑھا، عدم اعتماد کی اس فضا میں معاشرہ، نفرت، لاتعلقی اور بے حسی کا شکار ہوا۔

شاید یہی وہ صورت حال ہے جس نے عباس تابش کو انسانوں کے بجائے اشجار، پرندوں اور چاند سے ہمکلام ہونے پر مجبور کیا۔ یہ تینوں علامتیں اپنے اندر نہایت دلکش تخلیقی قوت، ہنرمندی اور معنوی حسن لیے ہوئے ہیں۔ سوکھے ہوئے تالاب پر بیٹھے ہوئے ہنس کی وفاداری، دن نکلتے ہی پرندوں کا شور، دھرتی ماں کی محبت، چاند کی تنہائی کا دکھ، سورج کی طرح چاند میں ڈھل جانے کی خواہش، چاند کی ہمراہی میں راستہ بھٹک جانا، درختوں کو زخم دکھانا اور کبھی خود کو درخت محسوس کرنا یہ سب معاملات بالکل اسی طرح بیان ہوئے ہیں جیسے آدمی اپنے کسی انتہائی قریبی دوست کے متعلق بات کرے یا اس سے محوِسخن ہو، پرندے چاند اور درخت سبھی ہمارے دل و نگاہ کو ٹھنڈک، راحت اور سکون پہنچانے کا باعث ہیں۔ انسانوں کی طرح دکھ نہیں دیتے، لہٰذا عباس تابش کی یہ دوستی اپنا جواز بھی رکھتی ہے اور حسن بھی۔

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

دن نکلتا تو میں شور مچانے جاتا
میں پرندوں میں پرندہ نظر آنے جاتا

کب سے بیٹھا ہے ہمارے صحن کی دیوار پر
یہ پرندہ ہے کہ پتھر بال و پر میں رہ گیا

اپنے سوا بھی میں کوئی آواز سن سکوں
وہ برگِ خشک ہو کہ پرندہ کوئی تو ہو

کھاتا ہے رنج چاند کی تنہائی کا مجھے
پھر سوچتا ہوں اس کی طرح کا تو میں بھی ہوں

چاند کے ساتھ بہت دور نکل آیا تھا
اب کھڑا سوچتا ہوں میں نے کدھر جانا ہے

یہ نکتہ کٹتے شجر نے مجھے کیا تعلیم
کہ دکھ تو ملتے ہیں گر خواہش نمو کی جائے

میرے مانند اگر ان کی بھی آنکھیں ہوتیں
میں نیا زخم درختوں کو دکھانے جاتا

پنجاب کے عظیم صوفی شعراء مادھولال حسین، میاں محمد بخش، خواجہ غلام فرید اور بلھے شاہ نے پنجابی شاعری میں جس صوفیانہ اسلوب کی طرح ڈالی، عباس تابش کے ہاں اس شعری روایت کی جھلک بھی موجود ہے۔ جس کی بنیاد خالصتاً اپنی ذات کی نفی، ماحول کا بغور مشاہدہ، تہذیب کی روح اور انسان دوستی پر مبنی ہے، میں ذاتی طور پر اس تصوف کا قائل نہیں ہوں جو انسان کو رہبانیت کی طرف لے جاتا ہے بلکہ میرے نزدیک صوفی کا کام معاشرے کے مایوس ستائے ہوئے ناامید افراد کو واپس زندگی کے دھارے میں شامل کرنا ہے۔ جس میں اپنی دکان کی مشہوری اور نمود ونمائش کی خاطر ''تسکین شاہ'' یا کسی ''ثواب نامہ'' کی قطعاً کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ مجھے عباس تابش کو صوفی ثابت کرنا مقصود نہیں۔ بات اس شعری رویے کی کر رہا ہوں جو محبت کا درس دینے اور انسانوں سے پیار کرنے والے عشاق کا طرہ امتیاز رہا ہے۔

دنیا سے دست کش ہیں ترے دل گرفتگاں
یہ تیرے پاس اور مسائل سے آئے ہیں

تہمت گرانِ شہر کا حسن تضاد دیکھ
جب میں ہی کچھ نہیں ہوں تو میرا فسانہ کیا

نہ کیجیو تو محبت کی گفتگو پہ یقیں
بس اک مقام جہاں کوئی دل دکھانے لگے

اتنا آساں نہیں مسند پہ بٹھایا گیا میں
شہرِ تہمت تری گلیوں میں پھرایا گیا میں

ابتدا میں غزل پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کی بات ہوئی تھی۔ معاشی ناہمواری، ناانصافی اور جبر کی مختلف صورتوں نے معاشرے میں وہ انتشار پیدا کر رکھا ہے کہ انسانی زندگی آزادی اور مساوات کو ترس کر رہ گئی ہے۔ لوگوں کی توجہ بنیادی ضرورتوں کے حصول تک محدود کر دی گئی ہے۔ طاقت ور کمزوروں کے استحصال کے لیے نت نئے طریقہ واردات ایجاد کر رہے ہیں۔ اس بے یقینی کی کیفیت اور دوہرے عالمی معیارات نے انسان کی بقا خطرے میں ڈال دی ہے۔ اب یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سرتاپا عشق میں ڈوبا ہوا شخص کس طرح خاموش تماشائی کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی اپنی تکلیف کا

اظہار تو کرے لیکن دوسروں کے دکھ درد سے بے خبر رہے؟ میں سمجھتا ہوں کسی ایک شخص سے محبت کرنے والا دیگر افراد کو کرب جھیلتے دیکھ کر نظر انداز نہیں کر سکتا۔

فریڈرک اینگلز نے ایک جگہ لکھا ہے:

"مقصدی میلان کو بغیر کہے ہوئے اشاروں کے، قصے کے واقعات اس کے افراد اور اس کی فضا سے، خود بخود، بے ساختہ غیر محسوس طور پر ابھر کر اثر ڈالنا چاہیے، اس کی ضرورت نہیں کہ مصنف اپنے خیالات اور عقائد کا ڈنکا پیٹ کر زبردستی پڑھنے والے پر اپنا اثر ڈالے۔"

میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ کوئی بھی نظریہ کسی پر زبردستی ٹھونسا نہیں جا سکتا، جب تک اندر سے کوئی تبدیلی واقع نہ ہو، سماج اور اس میں ہونے والی تبدیلیاں، معاشی ناہمواری، جبر، ناانصافی اور بے پناہ پھیلے ہوئے دکھ درد اپنی طرف متوجہ ہی نہیں کر سکتے، یعنی بات تو صرف احساس اور محسوسات کی ہے۔

انسانی معاشرہ تکالیف سے کبھی خالی نہیں رہا، ہر صاحب دل ضمیر کی آواز پر لبیک ضرور کہتا ہے، وہ اپنے سماج کا حصہ ہوتا ہے، اس سے کٹ کر نہیں رہ سکتا، ان سب باتوں کا ادراک عصری شعور کے بغیر ہرگز ممکن نہیں۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو جاگیرداری سسٹم کے خلاف پنجاب سے پہلی آواز صوفی شاعر بابا بلھے شاہ کی ہی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ عباس تابش اس کتاب میں ایک انقلابی یا نظریاتی شاعر کے طور پر سامنے آیا ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں ایسے اشعار موجود ہیں جن میں ملکی و عالمی سیاست، حالات و واقعات کا جبر، زندگی کی رائیگانی اجتماعی بے حسی اور برگ و ثمر سے محرومی کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جسے اس نے کمال ہنر مندی سے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے کہ کہیں بھی نعرہ بازی کا شبہ تک نہیں ہوتا، شاید اس کی وجہ کلاسیکی روایت میں Live کرنا ہے یا پھر عشق کے معاملہ میں صوفیانہ طرز احساس نے رہنمائی کی۔ کہیں بھی محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی شعر بطور فیشن یا ضرورت کے تحت کہا گیا ہو یا ذات کا وہ کرب ہے جسے صرف احساس اور محسوسات کے مراحل سے گزر کر ہی بیان کیا جا سکتا ہے۔ دراصل یہ موضوعات ہیں ہی اتنے بڑے کہ کوئی بھی اچھا لکھاری ان سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔

پاس ہی ڈوب رہی ہے کوئی کشتی تابش
خود نہیں بچتے اگر اس کو بچانے لگ جائیں

تُو پرندے مار دے سرو صنوبر مار دے
تیری مرضی جس کو دہشت گرد کہہ کر مار دے

ان کے بھی قتل کا الزام ہمارے سر ہے
جو ہمیں زہر پلاتے ہوئے مر جاتے ہیں

مستقبل کی غزل

ادب کے راستوں پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کبھی کسی ادبی نظریہ کا سندِ قبولیت مل جاتی ہے تو کافی دیر تک نئے آنے والے اسی کے سائے میں سفر کرتے ہیں یہ چربہ سازی یا نقالی کا دور ہوتا ہے۔ کوئی ایسا ادب ایسی صنف یا ایسا اسلوب نہیں جس نے چربہ ساز یا نقال پیدا نہ کیے ہوں۔ میر و سودا کے دور سے غالب کے دور تک دلی، لکھنؤ، دکن میں جو شاعر ہوئی وہ حقیقتاً میر اور سودا کے چبائے ہوئے نوالوں میں نئے مرچ مصالحہ کی آمیزش سے ذائقہ دار بنائی گئی۔ پھر غالب نے اردو شاعری میں جو نئے امکانات روشناس کرائے تو حسرت، فانی، جگر اور یگانہ تک اُردو غزل ان ہی متعین حدود میں مسافت طے کرتی رہی۔ پھر جادۂ غزل نے ترقی پسندی کا موڑ کاٹا تو اس کے بعد کافی دور تک سایہ دار درخت تو کجا کوئی ایسا قد آور پودا بھی نظر نہیں آتا تھا۔ جو رہروانِ شعر کو ستانے کے لیے سایہ فراہم کر سکے یا آگے کی رہنمائی کر سکے۔ جدید نشری ذرائع نے اس دوران مسندِ مقبولیت پر کئی نقلی چہروں کو بٹھانے کی بھرپور کوشش کی لیکن اربابِ نقد و نظر نے ان کو چربہ ساز یا نقال سے بڑھ کر کوئی درجہ نہیں دیا۔ غزل میں ترقی پسندی کے اثرات مدھم پڑھنے کے ساتھ ظفر اقبال (شعری مجموعہ آبِ رواں کی حد تک) اور شکیب جلالی نے اُردو غزل کے دامن کو وسعت عطا کی۔ گذشتہ تین چار دہائیوں تک پھر وہی چربہ سازی اور نقالی کی ہم رنگی کا دور مسلط رہا کہ عباس تابش نے شبستان غزل میں داخلہ کے لیے نئے دروازے دریافت کیے۔ عباس تابش کی فکری اساس محبت سے پھوٹی لیکن اردگرد کی سماجی ناہمواریوں کے زیرِ اثر حزن و ملال کی جھاڑیوں میں الجھی مگر فوراً ہی خود اعتمادی سے ان جھاڑیوں سے آگے سر نکالا۔ کانٹوں میں الجھ کر جو تھوڑی بہت خراشیں آئیں ان کے قریب اندمال چھلکے چھیل کر میٹھی سی کسک کے اظہار سے اس کی غزل عبارت ہوئی۔ اس نے اپنے بیشتر معاصرین کی طرح خود کو لفظی بازی گری میں ضائع نہیں کیا بلکہ روایت سے پیوند کاری کرتے ہوئے ذائقہ دار پھل اور نئے نئے پھول دریافت کیے اور اس تجربہ سے غزل کی ڈکشن کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی میں بھی قابل قدر اضافہ ہوا۔ اس لسانی اور موضوعاتی تجربہ سے اس کو ایک رجحان ساز شاعر کا منصب عطا ہوا۔ میں پورے اعتماد اور ذمہ داری سے یہ کہتا ہوں کہ عباس تابش کی غزل ہی عصرِ رواں اور اس سے منسلک مستقبل کی غزل کہلائے گی۔

مرتضیٰ برلاس

آشوبِ خواہش
مکان کا شاعر

طاہر تونسوی
(●)

عباس تابش کو بات کرنے اور کہنے کا فن، لفظوں کو استعمال کرنے کا گر اور ترکیب سازی کا ہنر خوب آتا ہے، یہ ساری خصوصیات اس کے پہلے مجموعے ''تمہید'' میں بھی موجود ہیں البتہ وقت، تجربات، مشاہدات اور تخلیقی عمل کے مراحل سے گزرنے کے بعد ان میں اور نکھار پیدا ہوا ہے چنانچہ ''آسمان'' میں اس کے شاعرانہ کمالات اور روشن ہوئے ہیں خاص طور پر اس نے اپنے انفرادی لب و لہجے سے سب کو چونکایا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ظفر اقبال جیسے کھر درے شاعر اور بے باک کالم نگار نے ایک انٹرویو میں اپنے پسندیدہ شاعروں کی فہرست میں عباس تابش کو بھی شامل کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ نہ صرف عباس تابش کی شاعری کا اعتراف ہے بلکہ اس کے فن کی داد بھی ہے۔ عباس تابش نے جو شاعری کی ہے اس کے حوالے سے یہ بات سچ ہے اور اس کا برملا اعتراف بھی ضروری تھا جو ہوا ہے۔

عباس تابش کی تمہید سے آسمان تک کے شعری سفر میں زمین اور آسمان کا فرق دکھائی دیتا ہے اور یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو بنانے اور سنوارنے میں کافی محنت کی ہے اور اپنے ہم عمر شعراء میں ایک الگ منفرد مقام بنایا ہے۔ یہ بات میں نے محض روایتی پیرائے میں نہیں کی بلکہ آسمان میں شامل نظمیں اور غزلیں اس کی گواہی دیتی ہیں، عباس تابش لفظ مستزاد کہ اس کی شاعری، فن اس کے موضوعات اس کے فکری تنوعات اور اس کے اوریجنل سٹائل کی نشاندہی کے لیے اس کے ناقدین کے کام کو آسان بنا دیا ہے اس سے پہلے یہ کام عرش صدیقی ''محبت لفظ تھا میرا'' میں کر چکے ہیں۔

شاعری کی طرح مجھے اس دیباچے نے بھی بڑا متاثر کیا ہے اور میرے اس نظریے کو تقویت ملی ہے کہ تخلیق کار اپنا محتسب بھی خود ہی ہونا چاہیے اور پھر ہر فن کار کے باطن میں ایک ناقد جبلی طور پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ بس اس سے کام لینے کا مسئلہ ہے اور اس مسئلے کو عباس تابش نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔

دکھوں، غموں، انتظار موسموں، کرب دنوں، وصال و ہجر آئینوں، ان دیکھے خوابوں بے نام چاہتوں، دو دھڑکتے دلوں، نارسائی کے لمحوں، جبر کی کیفیتوں، پیاسی نگاہوں، سیال جذبے آتے جاتے پرندوں، سبز رنگ رتوں، عذاب اور عذاب کے جھمیلوں، فطری رویوں کو جس طرح عباس تابش نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے وہ ہر اعتبار سے قابل ستائش ہے۔ اس ساری صورتحال میں جو دکھ ساری شاعری پر محیط ہے وہ پناہ گاہ کے نہ ہونے کا دکھ ہے، سائبان کے نہ ہونے کا دکھ ہے، یعنی مکان کے نہ ہونے کا دکھ ہے اور یہ دکھ گھر بسانے کا نہیں بلکہ گھر بنانے کا ہے اور اس دکھ کا شدید ترین احساس تقریباً ہر دوسری تیسری غزل کے کسی نہ کسی شعر میں موجود ہے اور اس طرح یہ شدید خواہش اس کے ہر ایک آشوب کی شکل میں ابھرنے لگتی ہے۔

ان شکنوں کا منظر نامہ کچھ یوں بنتا ہے۔

ہمیں تو خاک پہ حکم سفر دیا اس نے
وہ اور ہوں گے جنہیں کوئی گھر دیا اس نے

تمہارے ساتھ محبت پہ گفتگو کیا ہو
تمہارا دست ہے اور میرا گھر حوالہ ہے

دیوار ہے کسی کی دریچہ کسی کا ہے
لگتا ہے گھر کا گھر ہی اثاثہ کسی کا ہے

میرے ہی ساتھ گھر میں نظر بند تھا تو پھر
تیرا خیال کون سے در سے نکل گیا

زمیں کے نیچے کوئی شے تھی آسماں کی طرح
میں اپنے پاؤں پہ کیا ٹھہرتا مکاں کی طرح

دیوار پیش پا کا ہنر دے دیا گیا
دشمن کو میرے ساتھ کا گھر دے دیا گیا

ہم دونوں اپنے اپنے گھروں میں مقیم ہیں
پڑتا نہیں درخت کا سایہ درخت پر

شکستگی میں بھی معیار اپنے ہوتے ہیں
گرے مکان تو اپنے ہی پاؤں پڑتا ہے

کھلا مہتاب بھی ٹوٹے ہوئے در کے حوالے سے
سمجھتا ہوں میں اشیا کو فقط گھر کے حوالے سے

دروازہ کھٹکنے کی صدا لے گئی گھر سے
پیغام رہائی مجھے زنجیر سے پہنچا

ڈھلتا سورج تو نہ ہاتھ آیا کہ لاتے اس کو
ایک رستہ تھا جسے شام کو گھر لے آئے

دھندلی سمتوں میں اگر کونج کا پر مل جائے
پھر تو اے دربدری مجھ کو بھی گھر مل جائے

آئے ہیں تو ستا کے چلے جائیں گے پنچھی
وہ پیڑ اسی طرح اسی گھر میں رہے گا

شام ہوتی ہے تو یاد اس کو بھی گھر آتا ہے
اک پرندہ مرے کاندھے پہ اتر آتا ہے

پرندے پوچھتے ہیں تم نے کیا قصور کیا
وہ کیا کہیں جنہیں ہجرت نے گھر سے دور کیا

یہ عجب ساعت رخصت ہے کہ ڈر لگتا ہے

خمیدہ سر نہیں ہوتا میں خودداری کے موسم میں

پرندے پوچھتے ہیں تم نے کیا قصور کیا

پھر بھٹکتا پھر رہا ہوں ہجر موسم کے لیے

بہت بیکار موسم ہے مگر کچھ کام کرتا ہے

سانس کے شور کو جھنکار نہ سمجھا جائے

چاند چمکا جنگلوں پر آسمان کا در کھلا

اک ٹہنی پر پھولے پھلے ہیں پاکستان اور میں

چمکے گا شجر پہ نہ مرے گھر میں رہے گا

شروع کی غزلوں کے دو شعر میں نے آخر میں درج کیے ہیں تا کہ میں اس کیفیت کو اجاگر کر سکوں جو عباس تابش کے ہاں ''گھر'' کے سلسلے میں کروٹیں لے رہی ہے اور جہاں کہیں بھی اس نے اپنے ''گھر'' کے ہونے کا ذکر کیا ہے اس میں بھی نہ ہونے والی بات موجود ہے۔ اس تناظر میں ''گھر'' اس کے اعصاب پر چھایا ہوا ہے البتہ خواہشوں اور خوابوں کی اس ساری عمل کاری میں وہ خالی ہاتھ نہیں بلکہ اس نے آسمان کو اٹھا رکھا ہے بلکہ اپنی ہتھیلیوں پر آسمان کو سجا رکھا ہے اس حوالے سے دل اس کا گھر ہے جسے اس نے یادوں کے چراغوں سے جلا رکھا ہے۔ اور ان چراغوں کی روشنی نے اسے تخلیقی بصارت اور فنی بصیرت سے سرفراز کیا ہے۔

عباس تابش نے لفظی بازی گری اور ترکیب سازی کا جو شیش محل تعمیر کیا ہے اس کی بنا پر اس کی شاعری منقش مینا کاری کا نمونہ دکھائی دیتی ہے اور یہی دست کوزہ گر کا کمال ہے کہ اس کی ہر تصویر اپنے اندر ایک جاذبیت اور کشش رکھتی ہے اور اس کی تخلیقی صنّاعی کو بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ میرے نزدیک عرض ہنر کا یہ فن اسے برسوں کی ریاضت سے ملا ہے چنانچہ سکوت دہر، سر دیدہ نم، ساعت رخصت، خواب ہنر، دست دعا، طلسم خواب، کوہ امکان، سفال بے مرکب، غبار دربدری، شوق اذیت، برج سفر، پس غبار، طوق تمنا، نشہ لاحاصل، لمحۂ موجود، طلوع ہجر، ساحل رسوائی، دست بے دعا، شام سفر جیسی تراکیب جب اس کے اشعار کے نگینوں میں جڑتی ہیں تو جمالیاتی پیکر تراشی کا شاہکار بن جاتی ہیں اور ویسے بھی اس کی شاعری کا سارا حسن مصرعوں کی بنت میں ہے۔

عباس تابش کی یہ ساری فکری حسیات اور لفظی ساختیات اس کی شاعری کو پڑھتے ہوئے روح میں اتار لینے کو جی چاہتا ہے میرے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ مجھ پر یہ احساس کہ وہ خواہش مکان کے آشوب میں مبتلا ہے اس کی شاعری کے پورے مطالعے کے بعد آہستہ آہستہ کم ہونے لگتا ہے اس خیال سے میری مراجعت کے ساتھ ساتھ خود اس سے بھی واپسی ہوئی ہے اور اس نے خود کہا ہے۔

تجھے تو سب خبر ہوگی
یہاں عباس تابش نام کا اک شخص رہتا تھا
کہاں ہے وہ
نہ اب سرسوں کی گندل ہے
نہ وہ چرخے کی گھوکر ہے
مگر اک بند دروازے پہ دھندلے نام کی تختی
مرے گھر کی نشانی ہے
یہ میری آج کے دن کی کہانی ہے

دراصل عباس تابش گھر کے حوالے سے خود اپنی تلاش میں سرگرداں تھا اسے دربدری کا جو احساس تھا وہ ایک طرح ختم ہوا۔ اس نے گھر کو بھی پا لیا اور اپنے آپ کو بھی۔۔۔ اور پھر اس نے آسمان کو اوڑھ لیا اس یقین کے ساتھ کہ:

یقیں آتا نہیں تو مجھ کو یا مہتاب کو دیکھو
کہ رات اس کی بھی کٹ جاتی ہے جس کا گھر نہیں ہوتا

''شاعری کبھی الہام نہ تھی''

ڈاکٹر ضیاء الحسن
(لاہور)

عباس تابش سے میرا ایک عمر کا تعلق ہے۔ہمیں ملتے اور نہ ملتے ہوئے تیس بتیس سال کا زمانہ گزر گیا ہے۔یہ اُس زمانے کا تعلق ہے جو انسان کے اندر ٹھہر جاتا ہے اور وہ کسی بھی عمر میں کیوں نہ پہنچ جائے، مسلسل اپنا احساس دلاتا رہتا ہے۔شاید انسان ہمیشہ اُس عمر میں زندگی گزارنا چاہتا ہے جس میں میرا عباس تابش سے تعلق استوار ہوا۔یہ ادب اور شاعری سے بھی میرا ابتدائی تعارف کا زمانہ ہے۔یوں سمجھ لیجیے کہ شاعری اور عباس تابش میری زندگی میں آگے پیچھے آئے۔اس زمانے کے کتنے ہی دوست تھے جو اب نہیں رہے۔کچھ دنیا سے چلے گئے، کچھ شہر سے چلے گئے، کچھ ملک سے چلے گئے، جو چند ایک باقی ہیں ایک دوسرے میں اُس زمانے اور اُس زمانے کی محفلوں اور دوستوں کو دیکھ لیتے ہیں۔سو اس اعتبار سے عباس تابش میرے لیے ایک شخص اور ایک دوست کا ہی نام نہیں ہے بلکہ ایک زمانہ ہے جو عباس تابش کی صورت میرے اندر زندہ ہے۔

اس زمانے میں ہم دوستوں کے تین بڑے ٹھکانے ہوا کرتے تھے، ٹی ہاؤس، پرانی انارکلی اور پھر ایم۔اے۔او کالج کی کینٹین یا شام ٹی ہاؤس میں گزرتی۔اوّل شب پرانی انارکلی اور آدھی رات کا وقت ایم۔اے۔او کالج کی کینٹین۔عباس تابش ان دنوں روزنامہ جنگ میں ملازمت کرتا تھا، چھٹی والے دن کے علاوہ وہ عموماً دو بجے رات واپس آتا اور دوستوں کی محفل میں شریک ہو جاتا۔ان دنوں ہمارا گھر شام نگر میں ہوا کرتا تھا۔اظہر غوری صاحب کے گھر کے بالکل سامنے اور عباس تابش ریواز گارڈن کے ایک فلیٹ میں کچھ دوستوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔کئی بار ایسا بھی ہوا کہ میں ٹی۔ہاؤس کے بعد گھر چلا گیا اور پھر رات کو عباس تابش سے ملنے کے لیے دوبارہ ایم۔اے۔او کالج کی کینٹین پر آیا۔ان سینکڑوں راتوں میں سے کئی راتیں ایسی بھی مجھے یاد ہیں جب میں اور عباس تابش ریواز گارڈن کی سڑک پر پھرتے رہتے اور عباس شعر کہتا رہتا۔عباس تابش کو میں نے ہمیشہ فکرِ شعر میں ہی غرق دیکھا ہے۔اس نے کتنی ہی غزلیں اور کتنے ہی شعر اسی طرح شہر کی سڑکوں پر چلتے پھرتے کہے ہیں۔اس کی زندگی کا مرکز ہی شعر گوئی رہی ہے کہ شاعر بننا اور شعر کہنا اس کی زندگی کا بنیادی مقصد تھا۔وہ کالج میں پروفیسر ہے لیکن اُس نے کبھی ملازمتی ترقی کے بارے میں نہیں سوچا ہوگا۔کبھی کبھی وہ پی۔ایچ۔ڈی کرنے کی بات ضرور کرتا ہے لیکن یہ بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک بے نیازی جھلکتی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ یہ کام اُس کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں کرتھا۔شاعری اور شعر خوانی کی محفلیں اُس کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔آج بتیس برس بعد جب میں اُس کے تازہ شعری مجموعے ''شجر تسبیح کرتے ہیں'' کا دیباچہ لکھنے بیٹھا ہوں تو اُس کی شاعری کی فضا مجھے کھینچ کر اس زمانے میں لے گئی ہے جو اُس کی شعر گوئی کا بھی ابتدائی زمانہ تھا۔وہ زمانہ مجھے اس لیے بھی یاد آیا کہ اس مجموعے میں بھی اُس کا شاعری سے والہانہ تعلق اُسی طرح قائم ہے جو دورِ اولین میں تھا، بس فرق یہ ہے کہ وہ اوائلِ محبت کا زمانہ تھا اور اب یہ اُس کی میچورٹی کا عہد ہے۔

بتا اے در بدری! لفظ ہیں کہ اینٹیں ہیں
مکاں بنا لیا میں نے غزل بناتے ہوئے

عطا ہے جس کی وہی مجھ میں بولتا ہے میاں
سو میں بھی میں نہیں ہوتا غزل سناتے ہوئے

یہ جو غزل کے عشق میں غزلا گیا ہوں میں
اس مسئلے کو چند وفوری سمجھتے ہیں

مدت سے ہو رہی ہے غزل، ہو رہے گی کیا
اب تک تو حال یہ ہے ادھوری سمجھتے ہیں

یہ مصرعہ مصرعہ اداسی اُتر رہی ہے یہاں
کہ اپنے پنکھ گراتی ہے شام کاغذ پر

ربّا ظہار کا یہ خاص کرم ہے مجھ پر
میرے لہجے میں کوئی دل زدگاں بولتے ہیں

ہوئی تھی رات ہمیں دشتِ ہول میں لیکن
گزار دی گئی غزلوں پہ کام کرتے ہوئے

اسے پتہ بھی نہیں اور بات ہو بھی گئی
میں شکوہ کرنے گیا تھا غزل سنا آیا

میرے دل میں جو ترا دل نہیں لگتا پیارے
لے مرا ہاتھ پکڑ اور مرے دیوان میں آ

یہ شاعری کبھی الہام تھی نہ ہے تابش
تُو انتظار مگر صورتِ پیمبر کھینچ

جس طرح پیاس میں روتا ہوا بچہ کوئی
کھکھلا اُٹھتا ہوں جب مصرعۂ تر ہو جائے

کسی ایک مجموعے میں قوت وخواہشِ اظہار کے بارے میں اتنے زیادہ اشعار کا ہونا بہت معنی خیز ہے۔ یہ اُس مزاج کا پتہ دیتا ہے کہ شاعر کس درجہ کارِ شاعری میں غرق ہے۔ ہمارے زمانے میں ہر آدمی مکان بنانے اور مکان کو آراستہ کرنے کے لیے دولت جمع کرنے کی ہوس کا شکار ہے لیکن ہمارا شاعر غزل کا مکان بنا کر مطمئن ہے۔ میں چاہتا تو کچھ شعر منتخب کرتا اور اس موضوع کے باقی اشعار نقل نہ کرتا لیکن اُن اشعار کو پڑھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ یہ شاعری کی خواہشِ شعر کے مختلف پہلو ہیں جو مل کر ایک مکمل تصویر بناتے ہیں۔ عباس تابش کا دنیا سے تعلق شعر کے ذریعے قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے دوست، دشمن سبھی شاعری کی دنیا سے ہیں۔ وہ یا تو خود شعر کہتے ہیں یا شاعری سے محبت کرتے ہیں۔ عباس تابش کا کمال یہ ہے کہ شعر سے بے تعلق لوگ بھی جب اُس سے ملتے ہیں تو شاعری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس زمانے میں جب کہ لوگ سنجیدہ شاعری سے دور ہوتے جا رہے ہیں، عباس تابش جیسے شاعر انہیں شاعری سے وابستہ کرنے کا کارِ دشوار کر رہے ہیں۔ اس موقع پر مجھے ٹی ایس ایلیٹ کی تشویش یاد آتی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ شاعری کا نہ ہونا اور آج کے تناظر میں شاعری سے تعلق نہ ہونا فی الاصل انسان کی قوتِ تخلیق کی گمشدگی اور اُس کی ثقافتی زندگی سے دوری اور میکانکیت کی طرف اشارہ ہے جو انسان کو اعلیٰ انسانی تصورات سے دور کرتی ہے۔ اس اعتبار سے عباس تابش کا اندازِ زندگی ہماری معاشرتی زندگی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

عباس تابش کی شاعری میں کچھ اسمائے معرفہ کا تواتر سے استعمال بھی اسی شعر شعاری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ اصل میں تو اُس کے تصورِ انسان کی وضاحت بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ زندگی سے اُس کے تعلق کی نشاندہی بھی کرتا ہے اُن کے ذریعہ ہم اُس کی شاعری کے دیگر استعاروں کی معنویت اور اُس کے موضوعاتِ شعر کی زیادہ بہتر تفہیم کر سکتے ہیں۔ تابش نے ان شخصیات کی تلمیحاتی جہت بھی دریافت کی ہے اور انہیں علامتی معنی بھی پہنائے ہیں۔ بہ ظاہر یہ وہ شخصیات ہیں جو شاعر کے آئیڈیل ہیں لیکن وہ انہیں ہمارا آئیڈیل بھی بنا دینا چاہتا ہے کیونکہ یہ شخصیات زندگی کے جن رویوں کا مظہر ہیں وہ اب ہماری زندگی سے ناپید ہوتے جا رہے ہیں اور ہمارے شاعر کا تجزیہ یہ ہے کہ اُن کی وجہ سے زندگی غیر تخلیقی اور بنجر ہوتی جا رہی ہے۔ اس زندگی میں شادابی اسی صورت پیدا ہو سکتی ہے جب ہم ان شخصیات کے ذریعے ان رویوں تک رسائی حاصل کریں جن سے آج ہماری زندگی تہی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ تابش اپنا تعلق کن سے استوار کرتا ہے۔

بہت دنوں میں مری واپسی ہوئی ممکن
میں رات میرؔ کے دیوان سے نکل آیا

اب کے محمود درویش کی نظم کو گنگناتے ہوئے
اپسرا آنسوؤں کو بلونے لگی، شام ہونے لگی

کھڑے تھے ہم بھی وہاں دل بدست واشک بچشم
صدا لگی کہ ادب! میرؔ مبتلا آیا

مرے سمیت سبھی ایک سلسلے میں ہیں
وہ مرزا نوشہ ہوں، اقبالؔ ہوں یا حضرتِ عشق

وہ پیاس ہے کہ ٹھیکری ہونے لگی زباں
اب تو مجھے اے مولویٔ معنوی پلا

دیوانگی میں حد سے جو بڑھنے لگے یہ دل
غالب کا شعر پڑھ کے اسے دم کروں ہُوں میں

ان اشعار میں محمود درویش، عبدالرحمٰن چغتائی اور مولانا روم بھی ہیں لیکن سب سے زیادہ میرؔ اور پھر غالبؔ و اقبالؔ ایسے پیرائے میں آئے ہیں جس سے عباس تابش کی محبت وعقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر ان اشعار میں شاعر نے اپنے قبیلے کا اعلان کیا ہے اور صرف اپنے قبیلے کا اعلان ہی نہیں کیا بلکہ اپنا نظریۂ زندگی بھی پیش کیا ہے کہ وہ ایسے ہی انسانوں کو آئیڈیل سمجھتا ہے اور ایسی زندگی کو آئیڈیل سمجھتا ہے جو انہوں نے گزاری ہے۔ یہاں یہ شائبہ ہوتا ہے کہ شاعر ایسے شاعروں کی زندگی کو مثالیہ سمجھتا ہے۔ ایسا بھی ہے لیکن بس یہی نہیں ہے۔ میرے خیال میں میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، مولانا روم، چغتائی اور محمود درویش ایسے انسانوں کا مثالیہ ہیں جو یک سطحی دنیادارانہ زندگی کے برعکس اعلیٰ انسانی زندگی گزارتے ہیں جو دنیا جمع کرنے کی بجائے اس جوہر کی پرورش کو اہمیت دیتے ہیں جو انہیں خدا کی طرف سے ودیعت ہوا ہے اور اس جواہر سے انسانی زندگی کو خوبصورت بنانے کا کام لیتے ہیں۔ یوں یہ تمام شخصیات اصل میں تمام علوم وفنون کے تخلیقی جوہر رکھنے والے انسانوں کی علامت بن جاتی ہیں۔

عباس تابش کی شاعری میں شاعری، درویشی اور عشق ایک ہی کام ہے، یہی وجہ ہے کہ اُس کی شاعری میں انہی موضوعات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اُس نے ان بظاہر مختلف نظر آنے والے کاموں میں ایک تعلق تلاش کیا ہے اور وہ تعلق ہے اپنی ذاتی اور شخصی زندگی کو تج کر دوسروں کے لیے زندگی گزارنے کا رویہ۔ ان سارے کاموں میں توجہ کا ارتکاز اور ایک خاص طرح کی رندی و سرمستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر، درویش اور عاشق کی تمام توجہ ایک مرکزی نکتے پر مرتکز ہوتی ہے۔ وہ عام دنیادار انسان کی طرح دائیں بائیں نہیں دیکھتے بلکہ اپنی تمام تر توانائیاں اپنے بنیادی وظیفۂ حیات کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ اس مجموعے میں ان موضوعات پر اتنے زیادہ اشعار ہیں کہ میرے لیے اُن تمام کو نقل کرنا ممکن نہیں، اپنی بات کی وضاحت میں مَیں یہاں چند اشعار ہی نقل کر سکوں گا۔

اک چٹائی تھی مری، ایک پیالہ تھا مرا
عام ہو کر بھی خاص حوالہ تھا مرا

خلقتِ شکوہ سنج کو اذنِ کلام دے کے بھی
خلوتِ خاص میں مجھے حکم دیا کہ تُو نہ کر

زندگی بھر میں ہمیں اک عشق کرنا تھا، کیا
زندگی بھر میں ہمیں اک بار ہونا تھا، ہوئے

ہم فقیروں کے ہیں آدابِ تکلم ہی کچھ اور
جب ہمیں بولنا ہو، رقص کناں بولتے ہیں

قدیم سے ہے یہی سلسلہ فقیری کا
کوئی سنے نہ سنے تُو صدا لگاتا چل

پہنچا ہے مجھ تلک جو بزرگانِ عشق سے
اس سلسلے کو اور منظّم کروں ہُوں میں

یوں سمجھ لیجیے کہ جو اشعار میں نے نقل کیے ہیں وہ اس موضوع پر کہے گئے اشعار کا سوواں حصہ ہیں، ان میں وہ غزلیں بھی شامل ہیں جو پوری پوری انہی موضوعات کے مختلف رنگوں کو پیش کرتی ہیں مثلاً وہ غزلیں جن کی ردیفیں ''دھمال ڈالتے ہیں''، ''سائیاں''، ''بولتے ہیں''، ''اداسی''، ''ہذا جنون العاشقیں''، ''عشق'' اور ''رونا'' ہیں۔

تابشؔ کی شاعری عشق/ شاعری/ درویشی سے اپنے ہنر کا اظہار کرتی ہے۔ اُس کے لیے اُس نے پرندے کی علامت منتخب کی ہے، پرندوں میں بھی اُسے کبوتر کی علامت زیادہ پسند ہے جو درویش پرندہ ہے اور عموماً مزاروں پر پایا جاتا ہے۔ پرندہ معصومیت، حسن، بےضرری کی علامت ہے۔

ترے نواح میں درویش بھی، پرندے بھی
بچھائوں میں بھی یہیں بوریا جو تو چاہے

میرے اعصاب معطل نہیں ہونے دیں گے
یہ پرندے مجھے پاگل نہیں ہونے دیں گے
یار! اک بار پرندوں کو حکومت دے دو
یہ کسی شہر کو مقتل نہیں ہونے دیں گے

اب چوک میں پڑے ہیں ہم جنگلی کبوتر
غُرفے کی جالیوں میں ہوتا تھا گھر ہمارا

پرندوں کی مناسبت سے شجر/ پیڑ کی علامت بھی اُس کے ہاں بہت آئی ہے۔ پرندہ ایک سطح پر معصوم انسانوں یعنی انہی شاعروں/فقیروں/ عاشقوں کی علامت ہے سو شجر کے ساتھ گھر کی علامت بھی تابشؔ کی شاعری میں فراوانی سے استعمال ہوتی ہے لیکن یہاں وہ عمارت، مکان اور گھر کے فرق کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے۔ شجر، پرندوں اور گھر شاعروں کے لیے جائے اماں ہے۔ اسے ایسا گھر پسند ہے جس میں پیڑ ہو اور پیڑ میں پرندے بسیرا کرتے ہوں۔ وہ کسی محل/ بنگلے کا آرزومند نہیں ہے بلکہ کرایہ کا عام سا مکان جس میں پیڑ اور پرندے ہوں اُس کے لیے قصرِ شاہی سے زیادہ باعثِ آرام وسکون ہے۔

اس میں آباد پرندوں کی دعا ہے تابشؔ
یہ کرائے کا مکاں ہی مرا گھر ہو جائے

ہمارے جسموں کی اینٹیں لگائی جاتی ہیں
ہمیں ٹھکانے لگا کر ٹھکانہ بنتا ہے

زندگی اُس کی سرِ دشت بسر ہو جائے
جو مجھے ڈھونڈنے نکلے وہ شجر ہو جائے

پیڑ کو غور سے دیکھوں یہ کہیں میں تو نہیں
شاخ پر گل کی جگہ دل نظر آتا ہے مجھے

اس لیے میں نے درختوں سے اجازت مانگی
اچھا لگتا ہے مجھے اپنوں سے مل کر رونا

پرندے اور شجر کے حوالے سے اُس نے جن موضوعات کو اختیار کیا ہے وہ فطرت سے محبت اور تعلق کو قائم کرتے ہیں۔ یہ محض فطرت پسندی نہیں، دیکھنے کی ایک کاوش ہے۔ اس سے محبت کا رویہ جنم لیتا ہے۔ اُس کی شاعری میں پیڑ اور پرندے یعنی فطرت غیر نہیں بلکہ انسانی وجود کا لازمہ ہے۔ یہ ایک کلاسیکل رویہ ہے جس میں انسان صرف انسانوں سے ہی منسلک نہیں ہوتا بلکہ اپنے پورے ماحول سے جڑا ہوتا ہے۔ آج کی دنیا میں ہم جس Echological Disorder سے دوچار ہیں، شاعر ہمیں اس سے نکال کر ایک مربوط اور مکمل زندگی کی طرف بلانا چاہتا ہے۔ جب ہم شاعری کے ذریعے ان رویوں سے آشنا ہوتے ہیں تو لاشعوری طور پر فطرت سے ہمارا ٹوٹا ہوا تعلق قائم ہو رہا ہوتا ہے۔

عباس تابشؔ کی شاعری کی مجموعی فضا سرمستی، سرشاری اور اداسی سے مزّین ہے۔ یہ فضا ان لفظوں سے بھی قائم ہوتی ہے اور ان سے پیدا ہونے والے تصورات سے بھی۔ اسی لیے اُس کی شاعری میں شام کا استعارہ بہت آیا ہے۔ شام جہاں دن/ زندگی کے آخری دور کا استعارہ ہے وہاں اداسی اور ملال کا

استعارہ بھی ہے۔''اداسی ہے'' اور''شام ہونے لگی'' والی ردیفوں میں کہی گئی غزلوں کے علاوہ بھی اس مجموعے میں ان استعاروں میں درجنوں شعر ہیں جو اُس کی شعری فضا کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ فضا اپنے قاری کے دل پر اثر کرتی ہے اور اس میں دل گدازی پیدا کر کے ان رویوں کی ترویج کو ممکن بناتی ہے جو شاعر کا مقصود ہیں۔

عباس تابش کی شاعری کا ایک اہم استعارہ دعا ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم شاعر کے جس مزاج، موضوعات اور استعارات وعلامات کا ذکر کر آئے ہیں ان کے پیش نظر دعا ایک فطری استعارہ ہے۔ اس وقت دنیا جس سخت دور میں داخل ہوگئی ہے سرمایہ داری نظام نے جن غیر انسانی رویوں کو پروان چڑھایا ہے جیسی دہشت اور غارت گری دنیا کا مقدر بنتی جا رہی ہے، جس طرح کے خطرات دنیا اور انسان کی بقا کو لاحق ہیں، ان سب کا تقاضا ہے کہ دعا کا رویہ اختیار کیا جائے۔ دعا تابش کی شاعری میں طرزِ عمل بھی، موضوع بھی ہے اور استعارہ بھی۔ دعا فی الاصل واحد پناہ ہے جو انسان کو اس وقت حاصل ہے۔ یہ بے بسی بھی ہے، محبت بھی ہے اور تعلق بھی۔ انسان کا انسان سے تعلق، انسان کا فطرت اور کائنات سے تعلق اور انسان کا خدا سے تعلق دعا سے ہی قائم ہوتا ہے۔ ہمارے دور کے دیگر شاعروں کے ہاں بھی یہ استعارہ کم یا زیادہ آیا ہے۔ اس دور کی زندگی کو پیش کرنے کے لیے یہ ایک بہترین استعارہ ہے اور تابش کے ہاں یہ بھی کثرت سے آیا ہے۔

اک ایک حرف ہو خوش ذائقہ جو تو چاہے
بہت پھلے مرا نخلِ دعا جو تو چاہے

دعا لپیٹ کے رکھ دیں، کلام چھوڑ دیں ہم
تو کیا یہ خوش طلبی کا مقام چھوڑ دیں ہم

صبحِ کاذب کی ہوا ہے اور میں
ورثۂ حرفِ دعا ہے اور میں

عباس تابش کی شاعری کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں کی جا سکتی ہیں مثلاً یہ کہ وہ نئی نئی زمینوں کا جویا رہتا ہے اُس کی شاعری میں روزمرہ بول چال کے لہجوں کو گرفت میں لیا گیا ہے، وہ مصرع کی ساخت پر بہت غور کرتا ہے اور عام طور پر اُس کے مصرعے حشو وزوائد سے پاک، رواں اور بولتے ہوئے ہوتے ہیں۔ کسی ایک مضمون میں عباس تابش جیسے شاعر کے بارے میں ساری باتیں کرنا ممکن نہیں ہوتا، کچھ باتیں کوئی کرتا ہے اور کچھ کوئی اور۔ اس مضمون میں مَیں نے اس کی شاعری کی مرکزی قوت کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے تا کہ اس مسئلے کو دریافت کرسکوں جو شاعر کو شعر گوئی پر اکساتا ہے اور اس کے موضوعات و استعارات کے انتخاب میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ عباس تابش ایک معروف شاعر ہے اور اُسے میرے جیسے کسی نقاد کی تعارفی تحریر کی ضرورت نہیں ہے لیکن شاعری کو تجزیے کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے اور یہ مضمون اُس کی شاعری کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ میں اس مضمون کا اختتام اس دعا پر کرتا ہوں کہ اس کے دل میں شاعری کی جس منزل کی لگن ہے اللہ پاک اُسے عطا فرمائے۔ (آمین)

☆

اَپ ٹو ڈیٹ شاعر

عباس تابش کو اپنی شاعری کی تصدیق کے لیے آپ کے سٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اب تو وہ خود ایسے سٹیفکیٹ جاری کر سکتا ہے بلکہ کرتا بھی ہے، شاعری تو اپنی تصدیق خود ہوتی ہے اور اگر وہ خود اپنی تصدیق نہیں کرتی تو کوئی بڑے سے بڑا تصدیق کنندہ بھی اسے مطلوبہ اعتبار نہیں دلا سکتا۔ وہ ایک ٹھوس شاعر اس لیے بھی ہے کہ اس نے اپنی بنیادیں بہت گہری کھودنے کا کام پوری سنجیدگی کے ساتھ کیا ہے۔ جسے عام طور پر نئے شاعر زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور پھر ان کی ساری تعمیر ناپختہ اور کمزور رہ جاتی ہے۔

نئے شاعر کا اَپ ٹو ڈیٹ ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جدید علوم وفنون کے پروں کے ساتھ بندھی انتہائی تیز رفتار زندگی شاعر سے پہلا تقاضا یہی کرتی ہے۔ عباس تابش کا کمال یہ ہے کہ اس تقاضے سے عہدہ برآ ہوتے وقت مسلسل پیچھے مڑ کر بھی دیکھتا رہتا ہے کیونکہ روایت وہی نہیں جو اسے ورثے میں ملی ہے بلکہ وہ بھی ہے جو وہ خود تشکیل دیتا چلا آ رہا ہے چنانچہ صحت مند اور روایت قابلِ فخر کے ہمراہ جدیدیت کا سنگھم اس خوش ادائی کے ساتھ اس کے ہم عصروں میں اور کسی کے ہاں دستیاب نہیں ہے۔ اس کی آہستہ روی میں ایک زبردست استحکام بھی موجود ہے جو اس صبر آزمائی کا جواز خود ہے۔

اس کی فنی پختہ کاری سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس پر بڑھاپا پہلے آیا ہے اور جوانی، بلکہ لڑکپن بعد میں بے عیب مصرعہ ہر کوئی نہیں بنا سکتا، جبکہ غزل کی تمام تر شاعری مصرعے ہی کا کھیل ہے میں اسے کوئی مشورہ نہیں دے سکتا کیونکہ وہ اپنے فیصلے خود کرنے کا پوری طرح اہل ہے اور شاعر کو اپنے فیصلے خود ہی کرنا بھی چاہئیں، نئے ادبی معاشرے کی توقعات کچھ بھی ہوں۔ عباس تابش انہیں ہر وقت اور ہر طرح پوری کرنے کی ہر ممکن صلاحیت سے لبالب بھرا ہوا ہے اور اس حوالے سے وہ اپنے نظام اوقات سے بھی خوب اچھی طرح واقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے مشورہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اپنا صلاح کار وہ آپ ہی سب سے بہتر ہے۔

ظفر اقبال

''ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج''

خورشید بیگ میلسوری
(پاکستان)

''پروں میں شام ڈھلتی ہے'' عباس تابش کا تازہ ترین مجموعہ کلام ہے جس میں عباس تابش نے اپنے اسلوب اور ندرت کمال سے اپنے فنی اور حسیاتی سفر کو ایک ایسے شاندار مقام پر متعین کیا ہے جو ان کے اگلے پڑاؤ تک عصری ادب کی قیام گاہ قرار دی جا سکتی ہے اگر ہم عصر تخلیق کاروں سے تخلیق ہونے والے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو عباس تابش اپنے اندازِ نگارش میں ان کے حسیاتی شعور سے آگہی کے ساتھ ساتھ اپنے مخصوص طرز ادا کو قائم رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں ان کی فکری کارگاہ فنی ستونوں پر قائم ہے۔ وہ معنی آفرینی کے آگاہ لمحے کا شاعر ہے، اس کی شاعری کو پڑھتے ہوئے یہ غالب امر سامنے آتا ہے کہ فکری سفر میں وہ ارتقا کی شمع روشن کے ساتھ محو تخلیق ہے، اس کا زادِ سفر اس کا جذبہ ہے اور اس کی تیز گامی وہ ندرت ہے جو اس کے اندازِ بیان سے اس کی عظمت آشکار کرتی ہے۔ ''تمہید'' سے لے کر اب تک اس کی شاعری میں فکر و فن کی آمیزش کا تناسبی وجود یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی تخلیق ایک سورج کی طرح جذبہ واحساس کے مدار پر مناظر کو لمحہ بھر دیکھنے اور اس کے اگلے پڑاؤ سے باخبر ہونے کی چکا چوند کا مظہر بنتی ہے۔ اسے ہم خزاں میں پت جھڑ کے عمل کے بعد کونپلیں پھوٹنے اور موسم بہار کی آمد کا پتہ دینے کی منتظر مگر باخبر نگاہ کی بصارت کہہ سکتے ہیں۔ شاعری میں ایسا ہوتا ہے کہ شش جہات کا مطالعہ عمیق ذات کا مشاہدہ پر منطبق ہو کر خیال کی پیدائش و افزائش کا سبب بنتا ہے یا اس سے ہونے والی آفرینی کی زیبائش اس کا اظہار یہ ہے۔ شاعر جو کہنا چاہتا ہے وہ کہہ سکنے کی آرزو کرتا ہے مگر شعر فہم یہ سمجھتا ہے کہ اس تک یہ معنی الفاظ کی حسن ترتیب میں قفل شکن احساس کے ذریعے کھلتا ہے۔ دراصل غزل کے پیکر کو اپنے ذہن میں ڈھلنے پر مجبور کرنے والے شعراء نے اس کی روانی کو سیلانی میں بدل دیا ہے۔ اس نشست میں کئی کئی غزلیں لکھنے والے شاعروں نے غزل کے معیار کو شاعر ہونے کے اصرار میں گراوٹ کا شکار کیا ہے۔ قحط الرجال کے اس عہد ادب میں عباس تابش کی غزل وہ سرمایہ ہے جو ادب کی شان بڑھانے کا باعث ہے۔ اس کے شعروں کی تابانی نے اسے تابش کہلوایا ہے۔ اس کے ہاں محبت کے موسم ہیں ہجر اور وصل کی سیپیاں چنتے ہوئے وہ اعتماد سے درِ نایاب کی تلاش میں ہے وہ انسانی نفسیات پر حسن اور محبت کی حکومت کا شاہد ہونے کے ساتھ ساتھ فرد کے داخلی بحران کا شاعر ہے۔ اس کے نزدیک سبب کا ہونا انسان کی حسیاتی زندگی کا ثبوت ہے۔ اس کی بنا پر شاعری اس کے لیے ایک فلسفہ ہے اور یہی اس کا فلسفہ شاعری ہے وہ سالم کو نا مکمل کہہ کر بھی شعر کہتا ہے کہ اس کے نزدیک لفظ سے زیادہ لفظوں کا تنوع شاعری کی نئی ادبی رجحان سازی ہے وہ اظہار کے رویوں کو شاعری کا ماخذ سمجھتا ہے یہ Trends اس کے ہاں اولین حیثیت کے حامل ہیں جب کہ ثانوی عمل شعروں کے اندر سماجی احساس کا ظہور اور اس سے عالم بے خبری میں سامنا شمار ہوتا ہے۔ یوں وہ ایسے طلسم، سحر اور فسوں کے ایک ایسے کنارے پر بیٹھا ہے جہاں سمندر اور صحرا کے وجود کا باعث محبت کا نظام ہے جو اس کی ذات سے چل کر جب کہ وہ خود موجود ہوتا ہے دوبارہ اس کی ذات تک چلا جاتا ہے۔ جب وہ کسی اور کے احساس میں خود کو غیر موجود پاتا ہے۔ یہ شعری رویہ فنی ریاضت کا کمال بھی لیے ہوئے ہے یوں عباس تابش کے ہاں پایا جانے والا طلسم اور سحر لحاتی نہیں بلکہ اس کا حصار ازل اور ابد کی حدود کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے، وہ سچائی کو اس کے اصل روپ میں دیکھنے کے لیے چل پڑے تو کئی جھوٹ سچ سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں بالکل ایسے جیسے ہر جوہر کے اندر انسانی بقا اور تخریب دونوں کا وجود ممکن ہے۔ عباس تابش بقا کے پہلو کو اتنا غالب اور نمایاں بنانے کا ہنر ور ہے کہ معنی پہلو کا ایقان رکھنے والوں کا ''ایمان'' بھی متزلزل ہو جاتا ہے۔ اور اس کے اظہار کی شدت کا کمال ہے یا اس کی ہنر مندی کی یکتائی ہے یا پھر اس کی فنی کارگاہ کا معجزہ فن، بہر حال اس ہنر میں وہ واقعی یکتا ہے۔ اس کے ہاں مشاہدہ کا بھی نادر تاثر ہے وہ ابلاغ کے عمل میں قاری کو شریک رکھتا ہے اس کا مشاہدہ زود حسی سے ہی عبارت نہیں ہوتا بلکہ اس کے بیان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

یوں عباس تابش کے ہاں آنے والے زمانوں کی جھلک ان رویوں سے ہویدا ہوتی ہے جس کا جال انسانوں نے اپنے چاروں طرف بن رکھا ہے۔ وہ خود غرضی، نفسا نفسی اور بے وفائی کے سطحی نظام میں بہ نظر عمیق اپنے داخلی مشاہدے کی عکس ریز کرنوں سے ایک نئے جہان کی بشارت دیتا ہے۔ اس کا فکری عمق اپنے اندر سارے جہان کے درد کو سمیٹ کر ایک آنسو میں سمٹ جاتا ہے جس کے اندر خیال کے زاویے موجِ احساس کو منعطف اور منعکس کرتے ہوئے اس کی بالائی اور زیریں سطح کے لمس کو مناسب باری پر سامنے لاتے ہیں عباس تابش کے ہاں واردات قلبی عالم عشق میں یگانگی حالات کے شعور سے ملتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی شاعری کے جسد نے محبت کا پیرہن اوڑھ رکھا ہے اور یہ پیرہن ان کے وجود کی بقا سے متصل نظر آتا ہے اور اپنے بارے میں بھی لکھتے ہیں تو مضمون آفرینی کے باوجود آورد کی بجائے آمد کا احساس ہوتا ہے۔ ''جینئس'' کی تعریف اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے؟ اور وہ یقیناً عباس تابش پر خداوند کریم کا خصوصی احسان ہے کہ اس کے قلم کی جولانی عطیہ خداوندی ہے۔ عباس تابش کا ذاتی دکھ اپنی شدت کے ساتھ قاری تک پہنچ جاتا ہے۔ چونکہ اکثر معاملات میں یہ ترسیل انیس بیس کے غیر محسوس فرق کے ساتھ جاری رہتی ہے۔ اس لیے پڑھنے والا غم و الم کے موضوعات سے متعارف ہوتا رہتا ہے مگر عباس تابش نے اپنے دُکھ کو بیان کر کے ایسی لفظی تصویر کشی کی ہے کہ متبادل کا دور دور تک گمان نہیں ہوتا۔۔۔

سرِ راہ روک کے پوچھنا شرفا کا شیوہ نہیں میاں
کبھی فرصتوں میں بتاؤں گا جو معاملے مجھے کھا گئے

یقیناً بھینچ رکھا ہے کسی نے میرا دل تابشؔ
وگرنہ بند مٹھی سے کہاں جگنو نکلتے ہیں

ہم لوگ تری چپ بھی کہاں جھیل سکے ہیں
اس پہنچے ہوئے تیر کو جھلے میں رکھنا

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ عباس تابش رویے کا شاعر ہے وہ رویہ کو شعر بنا دیتے ہیں کیونکہ کمٹمنٹ بہت موثر ہے جس نے ان کے رویے کو شعر و ادب کا گراں قدر حصہ بنا دیا ہے۔ گل کا ثبات پوچھتے ہوئے کلی کے تبسم کے اشارے سے جوابدہی کا اظہار بھی تو ایک رویہ ہے، فطرت کے سبھی ارکان بھی تو ہم کلام ہیں یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عباس تابش نے مقتدین کی اس روایت کو جدت اظہار کے ساتھ برقرار رکھا ہے۔ ساختیاتی تجربات نے اس روایت میں تروتازگی بھر دی ہے۔ جبکہ اظہار کی شدت نے انہیں عصری ادب میں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔

یہ محبت کی کہانی نہیں مرتی لیکن
لوگ کردار نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

تجھے پسند بہت ہے گلاب کا کھلنا
اور اتفاق سے تو آئینے کے پاس بھی ہے

اس لیے جل کے کبھی راکھ نہیں ہوتا دل
یہ کبھی آگ میں ہوتا ہے کبھی پانی میں

دراصل عباس تابش اس عبوری ادبی دور میں لکھنے کے کمال سے متصف ہے جب غزل دکھ کے شائستہ اظہار بیان اور غم کی خوش سلیقگی سے دور ہوتی جا رہی ہے انا کا اظہار محبت کے وجود سے متصادم دکھایا جاتا ہے اور غزل کو شہرت دینے کی بجائے خود کو مشہور کرنے کی روش عام ہے۔ ہمیں عباس تابش اس قطار میں دُور دور تک کھڑے دکھائی نہیں دیتے، گویا انہوں نے ''پروں میں شام ڈھلتی ہے'' میں نہ صرف اپنی شاعرانہ تکمیل کے لمحات کی نقشہ کشی کر دی ہے بلکہ انہوں نے شعری رویے اور میلان کو فنی کمال سے جوڑ کر رائج اظہاری معیار کو بدل کر رکھ دیا ہے اور غزل کے خوش اندام وجود کو مسند وقار پر متمکن رہنے دیا ہے۔

لہو لہو ہیں مگر آخری بیان اپنا
ہم اپنے ہاتھ سے تحریر کرنا چاہتے ہیں

یہ میاں اہلِ محبت ہیں انہیں کچھ نہ کہو
یہ بڑے لوگ ہیں بچوں کی طرح سوچتے ہیں

بس یہ کہنا تھا مجھے چھوڑ کے جانے والو
ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج نے مر جانا ہے

عباس تابش کے ہاں غزل کا جو معیار برقرار رکھا ہے وہ زلفِ غزل سنوارنے والوں کے لیے ایک راہ کا درجہ رکھتا ہے وہ خوبصورتی کے شاعر ہیں اور ساری دلکشی محبوب سے منسلک پہلوؤں میں پاتے ہیں۔ وہ اپنے قاری کو کسی خیالی دنیا میں الجھانا نہیں چاہتے بلکہ اپنے جذبے کو سچائی سے بیان کرنے کی جرأت رکھتے ہیں اور پھر ان کا اسلوب اتنا دلکش ہوتا ہے کہ وہ بھی اسلوب کے حصار میں ہوتا ہے یوں کہا جا سکتا ہے کہ چودہ دن تک وہ پہلی آدھی دنیا میں رہتے ہیں تو چودہ دن دوسری آدھی دنیا میں۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ لمحے کی رفاقت میں اپنے خیال کو رواں دواں رکھتے ہیں۔ اگر سورج کی کرن ان کا پڑاؤ ہے تو اس کے ساتھ ساتھ وہ عام انسانوں کی طرح چار پہر نہیں گزارتے بلکہ پوری دنیا کی سیاحت ان کے خیال کا پھیلاؤ ہے۔ اسی طرح اگر رات کے ستارے ان کے خیال کے مہمان ٹھہرتے ہیں تو وہ کرۂ ارض پر ان کے مکمل وجود کے شاہد نظر آتے ہیں جس سے گمان ہوتا ہے کہ سیاحتِ عالم میں انہوں نے اپنی فکر کے معیار کو دوچند کیا ہے۔

جس طرح نور سے پیدا ہے جہانِ اشیاء
اک نظر ڈال کہ ہم بھی نظر آنے لگ جائیں
یہ بھی ممکن ہے کوئی روکنے والا ہی نہ ہو
یہ بھی ممکن ہے یہاں مجھے زمانے لگ جائیں

اس وسعت نظری نے انہیں متقابلہ موضوعات پر کمال کی دسترس عطا کی ہے جو ان کی شاعری میں تضاد کی بجائے حسن تضاد کا پہلو لیے ہوئے ہے جو ایک بڑی خوبی قرار دی جا سکتی ہے ادب کے دامن کو وسیع ہونے کے لیے ایسی ہی خوبی کی ضرورت ہے۔ شعری وقار اور غزل کی شان کو بڑھانا اسی طرح ممکن ہو سکتا ہے۔

یہاں چشم بستہ سنگ ہے نہ لہو نہ اس کی ترنگ ہے
میاں حادثوں کو دعائیں دو تمہیں دو گھڑی تو رُلا گئے

اپنا مقسوم ہے گلیوں کی ہوا ہو جانا
یار ہم ہیں کسی محفل کے اٹھائے ہوئے لوگ

خود فراموشی کے عالم میں مشاہدے کی قوت متاثر ہوتی ہے لیکن عباس تابش کا جینئس ہونا اس امر سے بخوبی واضح ہے کہ انہوں نے فطرت کے مشاہدے کو اپنی نظر کی گرفت سے دور نہیں ہونے دیا۔ وہ ہوا کو محسوس کرتے ہیں شاخ کو دیکھتے ہیں دریا کی روانی کو اپنے مشاہدے کے حلقے سے دور نہیں رہنے دیتے، ان کے اندروں بیں Ontrovert ہونے سے ہم سب واقف ہیں لیکن

جہاں کمالِ شعر کا میدان آتا ہے تو وہاں یہ غزل کے قافلہ سالار نظر آتے ہیں تاہم اس کے باوجود کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان کی اندروں بینی حالات سے متعین ہوئی ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شعری عظمت اس امر میں نہاں ہے کہ انہوں نے اندر کے موسم کو اگر حالات سے متاثر ہونے بھی دیا تو اس موسم کی Orignality کو نہیں کھویا جو ان کی ادبی عظمت پر یقین رکھنے والوں کے لیے بلا شبہ موجِ ناز کا ملکہ رکھتی ہے۔

یہ محبت بھی ولایت کی طرح ہوتی ہے
حالتِ حال میں یا حالتِ حیرانی میں

چاند بھی سرخ ہے آنکھوں کی طرح
یہ کسی ظلم پہ رویا ہو گا

میں برگِ خشک ہوں ٹہنی سے جڑ نہیں سکتا
درخت کیوں مجھے اپنی طرف بلانے لگے

ہم نکال آئیں گے تالاب کی تہہ سے اس کو
چاند واقف ہی نہیں باولے پن سے اپنے

میں کوئی شاخِ شکستہ اور تو ہے اس کی ٹیک
یار اپنا سلسلہ یک جان دو قالب نہیں

عباس تابش کے ہاں عصری اشارے بھی موجود ہیں یہ نہ صرف ادبی حوالے سے ہے بلکہ عصر گزشتہ اور عصر موجود کے اظہار سے پیوست ہے، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ بڑا شاعر زمان و مکان کی قید سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ اور کسی بھی واقعاتی تذکرے سے ادب کا دامن وسیع ہوتا ہے انہوں نے وارداتِ قلبی کو بھی زمانے کے رویے کے ساتھ وابستہ کیا ہے اور بعض واقعات علامت کی صورت میں بیان کیے ہیں۔

یوں بھی عذابِ ہجر سے میں نے گزر کیا
شب کی بجائے میر کا مصرع بسر کیا

سائیراہ تجھ کو بہت یاد ہیں اس کی باتیں
کیوں نہ کچھ وقت ترے ساتھ گزارا جائے

کوفۂ شک نہ کسی دشتِ بلا کی جانب
میں مدینے سے گیا کوہِ ندا کی جانب
تیرا اس کے ماننے والوں سے پالا پڑ گیا
جو پرندے بھیج کر لشکر کے لشکر مار دے

مختصر یہ کہ عباس تابش نے اس مجموعہ کلام سے دنیائے ادب کو جو Momentum دیا ہے وہ متحرک نئے امکانات کو روشن کر رہا ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ان کی آئندہ کی کتاب سے پہلے تک ان کے ہم عصر اتنی بڑی شاعری نہیں دے سکتے تاہم موجودہ صورت حال میں ہمیں ان کی شاعری اپنے عصر کی نمائندہ ترین شاعری نظر آتی ہے کیونکہ عباس تابش کی محبت کی طرح ان کی شاعری کی کشش اور سحر کاری، غم روزگار جیسی ٹھوس حقیقت کو بھی مسخر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

کھینچ لاتی ہے ہمیں تیری محبت ورنہ
آخری بار کئی بار ملے ہیں تجھ سے

بڑے شاعر کا ظہور

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غزل میں قافیہ ردیف کی پابندی اکثر شعراء کا قافیہ تنگ کر دیتی ہے اور وہ لگے بندھے مضامین کے دائرے سے باہر نہیں نکل پاتے لیکن جب کسی بڑے شاعر کا ظہور ہوتا ہے تو یہی قافیہ ردیف اس کے آگے چلنے کی بجائے اس کے پیچھے چلنا شروع کر دیتے ہیں اور ہمارے سامنے اس کی بہترین مثال اقبالؒ کی بالِ جبریل کی وہ غزلیں ہیں جن کی ایک جہانِ معنی آباد ہے، اقبال کی یہ روایت فیض اور ندیم سے ہوتی ہوئی آج کے نوجوان شعراء تک پہنچتی ہے جن میں سرِ فہرست عباس تابش کا نام ہے۔ عباس تابش نے غزل کی لفظیات اور مضامین میں ''میرے دل تک سجنا'' قسم کا کوئی ڈرامہ تو نہیں کیا لیکن گزشتہ ایک دہائی کے شعر سفر کے دوران اس نے اپنی غزل کو اس صف میں ضرور لا کھڑا کیا ہے، جس میں اپنے ہم عصروں میں سب سے آگے کھڑا نظر آتا ہے اور اس کے پیچھے بعد میں آنے والے نوجوان شعراء کی قطاریں ہیں۔ عباس تابش کی غزل کی تر و تازگی اور انوکھا پن اس کے قاری کو بہت سے مقامات پر مبہوت کر دیتا ہے۔ تابش کی داخلیت اور خارجیت بھی کسی دوراہے پر کھڑی نظر نہیں آتی بلکہ ان کی صورت ہم سفری کی ہے اس خوبصورت شاعر کی غزل میں موجود یہ سب خصوصیات قاری کے ذہن پہ صرف ایک تاثر چھوڑتی ہیں اور یہ تاثر بے پناہ تاثیر کا ہے وہ تاثیر جس سے بڑے بڑے جغادری قسم کے شعراء کا کلام بلاغت نظام یکسر خالی نظر آتا ہے، مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک دن اردو ادب کا قاری اس پُر اثر طرزِ فغاں کے قابل نوجوان شاعر کا نام بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ان شعراء کے ساتھ لے گا جنہیں ایک عرصے سے مسلمہ طور پہ اردو غزل کی آبرو سمجھا جاتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی

''ہر چیز خوبصورت ہو جاتی ہے''

یونس بٹ

(لاہور)

دور سے ہر کوئی خوبصورت لگتا ہے یہاں تک کہ اپنی بیوی بھی اچھی لگتی ہے مگر جونہی درمیانی فاصلہ ختم ہوتا ہے یہ خوبصورتی بھی ختم ہو جاتی ہے لیکن عباس تابش دور سے یوں لگتا ہے جیسے ابھی قریب آ کر بڑھک مارے گا یا مارنے لگا ہے۔ وہ چلتے وقت ادھر اُدھر یوں دیکھتا ہے جیسے مارنے کے لیے پتھر ڈھونڈ رہا ہو لیکن جوں جوں وہ قریب آتا ہے، اس کی جون بدلتی جاتی ہے یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کی شخصیت کے گرد محبت کا ایک ایسا ہالہ ہوتا ہے جس میں آ کر ہر چیز خوبصورت ہو جاتی ہے مگر عباس نے کم ہی لوگوں کو اس ہالے تک پہنچنے دیا ہے۔

عباس کی عمر کیا ہے؟ اسے خود پتہ نہیں۔ جوں جوں اس کے مسائل بڑھتے رہے وہ سمجھتا رہا وہ بڑا ہو رہا ہے حالانکہ وہ عین بچپن میں بوڑھا ہو گیا تھا۔ دیکھنے میں عباس اس عمر کا لگتا ہے جس میں سب سے آسان کام شعر کہنا ہے مگر عباس نے نوجوانوں کے لیے شعر کہنا اتنا ہی مشکل بنا دیا ہے جتنی اس نے مشکلیں سہی ہیں۔ اس کے سکھ کے ساتھی اس کے دکھ ہیں، جن کے ساتھ عباس وہی سلوک کرتا ہے جو مشرق میں عورت کے ساتھ ہوتا ہے یعنی انہیں چھپا چھپا کر رکھتا ہے۔ جس دن اسے کوئی مسئلہ نہ ہو سارا دن پریشان رہتا ہے۔

عباس تابش بیٹھا ہوا ہو تو یوں لگتا ہے جیسے اس نے کبھی کوئی حرکت ہی نہیں کی اور جب چلنے لگے تو یقین نہیں آتا کہ رکاوٹ کے بغیر رک بھی سکے گا۔ چلنا تو پاؤں کا زمین سے گفتگو کرنا ہے اور شہر لاہور کی گلیوں سے ساری ساری رات جتنی باتیں ناصر کاظمی اور عباس تابش نے کی ہیں شاید ہی کسی نے کی ہوں۔ شہر، آسمان کی مچھر دانی لگا کر سڑکوں کی صورت ٹانگیں پسار کر لیٹا نہیں اور عباس کے پاؤں نے اس سے سرگوشیاں شروع کی نہیں، جوں جوں رات بھیگتی جاتی ہے پاؤں کی آواز بلند ہوتی جاتی ہے۔ رات ختم ہو جاتی ہے مگر اس کی باتیں ختم نہیں ہوتیں۔

عباس خواتین کے پردے کے اس قدر حق میں ہے کہ عورتوں سے ہمیشہ پردے میں باتیں کرتا ہے یہی نہیں بلکہ ان کی باتوں پر بھی پردے ڈالتا رہتا ہے۔ عورتوں کے پاس یوں بیٹھتا ہے جیسے اعتکاف میں بیٹھا ہوا ہو۔ یعنی ان کی سنتا ہے نہ سناتا ہے۔ اتنا ٹھنڈا آدمی ہے کہ اسے اس عمر میں بھی گرمی نہیں لگتی۔ لیکن میرا دوست ''ف'' کہتا ہے کہ عباس تابش بڑا کامیاب خاوند ثابت ہو گا کیونکہ جو خالد احمد کے ساتھ گزارا کر سکتا ہے وہ ہر قسم کی بیوی کے ساتھ رہ سکتا ہے۔

عباس تابش کا منہ اتنا بڑا ہے کہ جو بات کرے چھوٹی لگتی ہے۔ رنگ ایسا کہ نہا کے آ رہا ہو تو یوں لگتا ہے جیسے ابھی نہانے جا رہا ہے۔ ایک سر جس پر اس نے کئی لوگوں کو چڑھا رکھا ہے۔ عباس اس سر کو اپنی بات دوسروں کو سمجھانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب خود بھی اسے کسی بات کی سمجھ نہ آئے تو اپنے آپ کو سر ہلا ہلا کر سمجھانے لگتا ہے مگر سر بوڑھی عورتوں کی طرح ہلاتا ہے یعنی ہمیشہ اثبات میں۔

دوست وہ ہوتا ہے جس سے گفتگو کرنے کے لیے انسان لفظوں کا محتاج نہ ہو اس لیے میں اور عباس گھنٹوں مل کر خاموش بیٹھتے ہیں اور جب عباس کا دل گفتگو کرنے کو چاہتا ہے وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ وہ دشمن نہیں بناتا مگر اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے میں اس کا دوست بن گیا ہوں۔ وہ دوستوں کا اس قدر خیال رکھتا ہے کہ اگر کبھی بیمار ہو جائے تو خود گھر گھر جا کر عیادت کرواتا ہے۔ مستقل مزاج اتنا کہ پانچ سال قبل جن سے دھوکا کھاتا تھا آج بھی انہی سے دھوکا کھاتا ہے۔ اگر وہ کسی مسئلے پر پریشان ہو تو سمجھ لیں یہ اس کے کسی دوست کا مسئلہ ہے۔ اگر وہ خوش ہو تو دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ مشاعرہ پڑھنے جا رہا ہے اور دوسری یہ کہ مشاعرہ پڑھ کر آ رہا ہے۔ اسے جہاں اور جس وقت مشاعرہ ملے لوٹ لیتا ہے۔

عباس تابش کو ملنے کے بعد بھی اس سے آدھی ملاقات ہی ہو سکتی ہے کیونکہ یہ بیٹھا تو آپ کے پاس ہوتا ہے مگر نصف۔ اور اس کا نصف بہتر ہمیشہ خیالوں میں ہوتا ہے۔ عباس کو انگریزی سے اس قدر لگاؤ ہے کہ اس نے جتنی بار بھی بی۔اے کا امتحان دیا انگریزی کا پرچہ ضرور دیا۔

بڑا احساس آدمی ہے۔ دوسروں سے اس کو اکثر ہمدردی ہو جاتی ہے اور اس کے لیے دوسرے کا مصیبت میں مبتلا ہونا ضروری نہیں بس خوبصورت ہونا البتہ ضروری ہے۔ اسے دنیا کا ہر خوبصورت انسان مظلوم نظر آتا ہے۔

عباس اپنی نسل کے شاعروں میں سب سے آگے ہے مگر وہ وقت دور نہیں جب اس کا پیٹ اس سے بھی آگے نکل جائے گا۔ اس کی صحت مندی کا راز وہی ہے جو ہماری مندی صحت کا ہے یعنی سوچیں۔ وہ خوش خوراک ہے یعنی ہر خوراک کھا کر خوش ہوتا ہے۔ دوستوں کو ہر وقت بیدار دیکھنا چاہتا ہے اسی لیے اکثر رات کو دو تین بجے مجھے ہوسٹل میں آ کر خواب غفلت سے جگا دیتا ہے۔ وہ لمبا فاصلہ پیدل طے کرتا ہے۔ اگر زیادہ قریب جانا ہو تو رکشہ لے لیتا ہے۔

وہ بے وقوفی کی حد تک مخلص ہے، یعنی ہر کسی کے ساتھ مخلص ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس کا برا کرے یہ اس کا بھلا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے آدمی وہی کچھ کرتا ہے جو کر سکتا ہے آج کل ہر دوسرے کو کیمرے کی آنکھ سے دیکھتا ہے، یعنی صرف ظاہر ہی کو دیکھتا ہے مگر عباس اس دور میں بھی انسان کو آنکھ سے دیکھتا ہے اس کا تو پورا وجود آنکھ ہے جو مسلسل شب و روز بیداری کے باعث سوجتی جا رہی ہے۔

عباس چشمہ بھی لگاتا ہے مگر دوسروں کی باتیں سنتے وقت تاکہ دوسروں کو پتہ نہ چل سکے کہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے، مگر اپنی بات سناتے وقت چشمہ اتار لیتا ہے، کبھی کبھی قمیض کے بازو بھی اوپر چڑھا لیتا ہے۔عباس گا بھی لیتا ہے مگر اس کے گانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ دوسروں کو سنائی نہیں دیتا۔ کبھی کبھی تو اتنے درد سے گنگناتا ہے کہ سننے والے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اسے درد ہو رہا ہے۔

عباس کو غزل لکھنے کی اتنی ہی فکر ہوتی ہے جتنی غریب والدین کو اپنی خوبصورت بیٹی کی شادی کی۔

عباس تابش ایک پروف ریڈر بھی ہے۔اس کی نگاہیں ہر وقت کاغذ پر دوڑتی رہتی ہیں اور جہاں غلطی نظر آئے رک جاتی ہیں اور اس کا ہاتھ بے اختیار اس پر دائرہ لگا دیتا ہے۔اس کی نگاہیں انسانی لفظوں کو پڑھتی رہتی ہیں اور دائرے بڑھتے رہتے ہیں وہ ہر آن بڑھتے ہوئے دائروں کے درمیان ہے۔اگر وہ شاعر نہ ہوتا تو یہ دائرے اس حساس شخص کا دائرہ حیات تنگ کر دیتے، اسی لیے تو میں کہتا ہوں ''اگر وہ شعر نہ کہتا تو مر گیا ہوتا۔''

- بقیہ -

براہِ راست

☆ گزشتہ سات دہائیوں سے تقسیم در تقسیم کے باوجود اردو زبان و ادب نے جس سخت جانی اور ہر دلعزیزی کا مظاہرہ کیا ہے تعصب، تنگ نظری اور شدت پسندی کے مقابل اس زبان و ادب کا عزم قائم رہنے کے کتنے امکانات ہیں؟

☆☆ اردو درویشوں کی زبان ہے۔اس کو قومی زبان کا درجہ تو حاصل ہے مگر یہ اس درجے پر فائز نہیں ہے۔اس زبان کا کمال یہ ہے کہ یہ ہر نئے آنے والے کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔جس طرح اردو زبان میں ہر زبان کا لفظ سما سکتا ہے اسی طرح کسی بھی زبان کو بولنے والا اردو زبان میں بآسانی اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے، تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھا کر پذیرائی حاصل کر سکتا ہے۔یہ ایسی زبان ہے کہ اس کی جتنی مخالفت کی جائے یہ اتنی ہی سخت جانی کا مظاہرہ کرتی ہے۔یہ زبان جس تیزی سے پھل پھول رہی ہے بالخصوص اردو شاعری کو مستقبل میں کوئی آنچ نہیں پہنچا سکتا۔کچھ عرصے بعد بعض ناقدین مایوسی کا اظہار کرتے ہیں تو کوئی تازہ کار غزل گو پھر سے اس زبان میں نئی روح پھونک دیتا ہے اور پھر سے یہ پودا لہلہانے لگتا ہے۔

کلاسیکی سرمایہ

ہمارے دور کے بیشتر شعراء مختلف محرکات کے تحت شعر گوئی شروع کر دیتے ہیں اور بعض وجوہ کی بنا پر چند ایک کو پذیرائی بھی مل جاتی ہے لیکن جلد ہی اپنے آپ کو دہرانا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ مطالعہ ادب سے بے تعلق ہوتے ہیں۔عباس تابش البتہ استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو شاعر کے کلاسیکی اور جدید سرمائے پر اُن کی گہری نظر ہے۔اس وسعت مطالعہ کی وجہ سے فن شعر کے تمام اسرار و رموز ان پر روشن ہیں۔وہ خیالات کو ذاتی طور پر محسوس کر کے شعر کا جامہ پہناتے ہیں اس لیے ان کی شاعری میں قدیم یا جدید شعراء کے خیالات کی تکرار کہیں موجود نہیں ان کے ہاں انفرادیت اور تازہ کاری جگہ جگہ موجود ہے چنانچہ ان کا کلام گہرے تاثر کا حامل ہے اور گذشتہ چند دہائیوں سے جو شاعری تخلیق ہو رہی ہے اس میں عباس تابش کا مقام بہت بلند ہے۔

خواجہ محمد زکریا

جمالیات کے زاویے

عباس تابش نے بلاشبہ خود کو آغازِ سفر میں رومانویت کی گرفت میں دے دیا تھا لیکن حیات شناسی اور وقت کی رفتار نے اس کے لیے نئے راستے متعین کیے۔اس نے اپنی فکر کی جہات کے لیے اپنے آپ کو محدود نہیں کیا اس نے فکر جو جلا بخشنے کے لیے نئے راستے تراشے۔اس نے سوسائٹی کی زود فراموشی و شکست و ریخت اور تصورات کی پامالی سے لے کر تمام تغیرات کا مکمل منظر نامہ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔وقت کے لمبے سفر نے اسے نرگسیت کی گرفت سے نکال کر اس مقام پر لا کھڑا کیا جو زندگی سے بھرپور کسی بھی شخص کے اندر پیار کی رُت جگا دیتا ہے۔ اس پیار کی کہانی کا تانا بانا بنتے ہوئے کل کا نوجوان شاعر آج کا صاحب طرز کہنہ مشق شاعر قاری کو اپنی جگہ لا کھڑا کرتا ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں یہ شاعر اپنے اندر مظہریات سے جمالیات تک کے تمام زاویے اپنے قاری پر کھول دیتا ہے۔

رضا الحق صدیقی

''ترے فقیر کا قصّہ''

ثاقب تبسم ثاقب
(گوجرانوالہ)

شاعری فنِ لطیف ہے اور یہ اس وقت تک پُر تاثیر نہیں ہوتا جب تک اس میں شدتِ احساس، قلبی واردات اور اصلیت نہ ہو اور بالخصوص صفِ غزل میں فن کار کے لیے باریک بینی اور دل کی کیفیات میں ڈوب کر گوہر تلاش کرنا سب سے اہم ہوتا ہے۔ گویا عمومی طور پر شاعری میں شدتِ احساس کا ہونا لازم ہے اور غزل تو اس وقت تک غزل کہلوانے کی مستحق ہی نہیں جب تک شاعر ڈوب کر نہ کہے۔ یہی وجہ ہے کہ صفِ شاعری نے ہر دور میں خود کو منوایا ہے۔ اردو غزل کی تابناکی اور بے باکی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ اس کی مقبولیت اور فرضیت کے لیے ہر دور میں مختلف شعراء نے اپنی خدمات پیش کیں۔ کوئی بھی عہد ہو، کوئی بھی دبستان ہو، اردو غزل نے اپنی روشنی سے کئی چہرے روشن اور کئی چہرے روشن تر کیے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ غزل کو اپنی آبیاری اور نمو کے لیے ایسے ایسے سہارے ملے ہیں کہ جن کے دم سے اردو غزل، اصنافِ شاعری میں ایک معتبر صنف قرار پائی ہے۔ ان میں ولی، میر، غالب، مومن، حسرت، اقبال، ناصر اور منیر نیازی سمیت درجنوں ایسے نام ہیں جن سے غزل کی آبرو ہے۔ ان بے مثال لوگوں نے اپنے اپنے عہد میں اردو غزل کی روایت کو مضبوط تر اور معتبر بنایا۔

۸۰ء کی دہائی میں بہت اہم نام عباس تابش کا ہے۔ اردو شاعری میں ایسی مثالیں بہت کم کم ہیں کہ جب کسی شاعر کو اس کی زندگی میں ہی بے پناہ پذیرائی اور محبت ملتی ہے۔ ایسا نصیب بھی نصیب والوں کو نصیب ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ہی خود اپنا حوالہ بن جائے۔ عباس تابش ایسے ہی خوش نصیب شاعر ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں ہی عروج، شہرت، عزت اور بے پناہ محبت کے سارے رنگ دیکھے ہیں اور وہ ان رنگوں کے سمندر میں پوری طرح غوطہ زن بھی ہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں:

یہ کرم ہے یہ کرم ہے یہ کرم ہے اُس کا
میرے ہوتے ہوئے آیا ہے زمانہ میرا

عباس تابش ۱۵ جون ۱۹۶۱ء کو جناب فیض بخش کے گھر میلسی ضلع وہاڑی میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام غلام عباس ہے اور ان کا تعلق راجپوت بھٹی گھرانے سے ہے۔ عباس تابش کے آباؤ اجداد میں کوئی بھی شاعر یا ادیب نہ تھا، تاہم ان کے گھر میں علمی اور تاریخی کتب بینی کا رواج ان کے والد اور بڑے بھائی کی وجہ سے پایا جاتا تھا۔ انھی کتابوں نے ان کے اندر کا شاعر جگایا۔ عباس تابش نے ۱۹۷۵ء میں آٹھویں جماعت میں باقاعدہ شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے نذیر اظفر کو اپنی ابتدائی شاعری دکھائی۔ میلسی میں ان پر تعلیم ختم کرنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا جسے انھوں نے اپنے والد کی شہہ پر نظر انداز کرتے ہوئے نسبتاً ایک بڑے مضافاتی شہر ساہیوال میں ہجرت کی۔ اسی دوران روزنامہ ''آفتاب'' ملتان کے ادبی صفحہ کے انچارج کیف انصاری کو پہلی بار غزل بھجوائی جو شائع ہوئی۔ حصولِ علم کے لیے کی جانے والی اس نقل مکانی نے عباس تابش کو مسافر بنا دیا۔ عباس صاحب نے میٹرک میلسی گورنمنٹ ہائی سکول، ایف اے گورنمنٹ ڈگری کالج، ساہیوال سے ۱۹۸۱ء اور اسی دوران گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور ۱۹۸۷ء میں ایم اے اردو کیا اور حصولِ علم و رزق کی آرزو نے انھیں لاہور کی سڑکوں کا مکین بنا دیا اور اب وہ انہی سڑکوں کے امین بھی ہیں۔ ۱۹۸۶ء تک وہ ایک اخبار میں پروف ریڈر رہے۔ ''راوی'' کے مدیر رہے۔ ۱۹۸۹ء میں ''مساوات'' میں سب ایڈیٹر بھرتی ہوئے اور اسی سال دسمبر میں لالہ موسیٰ کالج میں لیکچرار منتخب ہوئے۔ ۱۹۹۲ء میں لاہور ایف سی کالج میں ٹرانسفر ہوئی، پھر جی سی ٹاؤن شپ میں ملازمت جاری رکھی اور آج کل گلبرگ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ یوں وہ دریا سے نکلے اور سمندر کی بے رحم موجوں کے حوالے ہوئے لیکن اپنے صبر و استقلال اور عزم و ہمت کے ساتھ نہ صرف بے رحم موجوں کی سنگینی کا مقابلہ کیا بلکہ انھیں زیر بھی کر لیا۔

انھیں پتا بھی نہیں وہ تمام ہو گئے ہیں
ترے فقیر کا قصہ تمام کرتے ہوئے

عباس تابش نے زندگی کے نشیب و فراز دیکھے، پھن پھیلائے ایسے اور حادثے ان کی راہ میں حائل رہے جن سے وہ برسرِ پیکار رہے، انھیں سنگینی حالات کی تلخیوں کا سامنا بھی رہا جن کے خلاف وہ احتجاج بھی کرتے رہے، انھوں نے حالات کی تبدیلی کے لیے تدابیر پیش کیں تو کبھی ان کے حصول کے لیے جتن کیے۔ اسی طرح کے ملے جلے احساسات و جذبات اور کیفیاتِ قلبی سے انھوں نے غزل کی آبیاری کی ہے۔ عباس تابش بڑی باریک بینی کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہیں، اسے شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور جدت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تکمیلِ ذات کے لیے تگ و دو بھی موجود ہے اور اپنے ادھورے پن کا احساس بھی، تقدیرِ جبریہ کے نمونے بھی نظر آتے ہیں اور تقدیرِ قدریہ کا نظریہ بھی پیش پیش ہے۔ عباس تابش کی حیات شناسی نے ان کے لیے نئے راستے متعین کیے اور وہ پورے انہماک سے ان پر عازمِ سفر ہوئے۔ مختلف راستوں کا یہ سفر آج بھی جاری ہے اور ان کی فکری جہات انہی راستوں کی کہانی سناتی ہیں۔

اتنا آساں نہیں مسند پہ بٹھایا گیا میں
شہرِ تہمت! تری گلیوں میں پھرایا گیا میں
خلوتِ خاص میں بلوانے سے پہلے
عام لوگوں میں بہت دیر بٹھایا گیا میں

۱۹۸۶ء میں ''تمہید'' کے نام سے ان کا پہلا شعری مجموعہ منظرِ عام پر آیا۔اس کے بعد ''آسمان''، ''مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا''، ''پروں میں شام ڈھلتی ہے''، ''رقصِ درویش''، ''شجر تسبیح کرتے ہیں'' اور کلیات ''عشق آباد'' شعری اور ادبی حلقوں سے داد وتحسین وصول کر رہے ہیں۔عباس تابش کی شاعری میں غزل کو ہی خاص مقام حاصل ہے۔وہ اردو شاعری کے باذوق قاری اور شعری روایت سے خوب شناسا ہیں۔وہ اپنا فکری وفنی ربط روایت سے جوڑے ہوئے ہیں۔انھوں نے خالد احمد سے شاعری کے رموز سیکھے اور انھیں اپنا مرشد مانتے ہیں۔وہ ساہیوال میں رہے، اس وقت وہاں مجید امجد کا طوطی بولتا تھا۔وہ مجید امجد کی کتاب ''شبِ رفتہ کے بعد'' سے متاثر ہیں جبکہ فراق ان کے پسندیدہ ترین شاعر ہیں۔عباس تابش کے اشعار میں جدت طرازی پوری کلاسیکی روایت کے ساتھ موجود ہے، اسی روایت میں وہ رومانوی لہجہ بھی منفرد انداز میں بیان کرتے ہیں۔

تو پھر یوں ہے کہ میں نے اُس کو چاہا ہی نہیں تابش
اگر اُس کی شباہت کا گماں مجھ پر نہیں ہوتا

اس ضمن میں افتخار عارف کا یہ کہنا ہے کہ:

''عباس تابش اردو غزل کی روایت کو ثروت مند بنانے والی نسل کے میرے نزدیک سب سے نمایاں شاعر ہیں۔ایک مکمل شاعر جو غزل کی کلاسیکی روایت کے دائروں میں رہتے ہوئے مضمونِ تازہ کی نئی راہیں نکالتا ہے اور غزل بہ غزل اور کتاب بہ کتاب بلندیوں کی طرف گام زن ہے۔عباس تابش اپنی نسل کے مقبول ترین شاعروں میں ہیں۔''

عباس تابش نے غزل میں جہاں اسلوب کو ایک نیا انداز دیا ہے وہاں موضوعات کی کشید میں بھی خود کو منوایا ہے۔ان کے سامنے موضوعات ہاتھ باندھے کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔انہوں نے روایت سے ناتا جوڑ کر عصرِ رواں اور مستقبل کی غزل کے لیے راستے ہموار کر دیئے ہیں۔

نئے سرے سے تعلق نہیں بنائیں گے ہم
جہاں سے ٹوٹ گیا تھا وہیں سے جوڑیں گے ہم

ہمارے جیسے وہاں کس شمار میں ہوں گے
کہ جس قطار میں مجنوں کا نام آخری ہے

انہوں نے خود کو لفظی بازی گری میں ضائع نہیں کیا بلکہ روایت سے پیوند کاری کرتے ہوئے ذائقہ دار پھل اور نئے نئے پھول دریافت کیے اور موضوعات میں نئے نئے رجحانات کو فروغ دیا ہے۔اس بات کی وضاحت ڈاکٹر اجمل نیازی اس طرح کرتے ہیں:

''عباس تابش نے شاعری کو رقصِ درویش بنا دیا ہے تو پھر یہ کچھ اور ہی شاعری ہے اور یہ شاعری سے آگے کی چیز ہے۔لفظ وخیال کی حکمرانی اور ہجر و وصال کی درویشی کے امتزاج سے شاعری کا جو مزاج بنا ہے اسے عباس تابش نے ایک ان دیکھی معراج پر پہنچا دیا ہے۔''

غزل جذب وخیال، تنوع موضوعات کا حیرت کدہ اور جہانِ معنی کا آئینہ خانہ ہے۔اس میں زندگی کی سی وسعت ہے۔جس طرح زندگی اپنے اندر تمام موسم، رنگ، واقعات، جذبات، تحریکات، چہرے، نظریے اور رویے سمو لینے پر قادر ہے اسی طرح غزل بھی ان سب عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔جس طرح زندگی کا ارتقائی سفر جاری رہتا ہے اسی طرح غزل بھی اپنا ارتقائی سفر جاری رکھتی ہے اور زندگی کے بدلتے مناظر اور مظاہر صنفِ غزل کا حصہ بنتے جاتے ہیں۔ایسے تمام موضوعات، رنگ، موسم، مناظر اور مظاہر عباس تابش کی شاعری کی زینت ہیں۔

جب بن گیا تو اس کی دنیا مثال دے گی
تعمیر ہو رہا ہے ملبے سے گھر ہمارا

کب تمہیں عشق پہ مجبور کیا ہے ہم نے
ہم تو بس یاد دلاتے ہیں، چلے جاتے ہیں

تصوف، عشق ومحبت، ہجر ووصال، حسن و جمال، تنہائی و نارسائی، آشوبِ ذات، فطرت نگاری، تمثیل نگاری، سیاسی وسماجی حالات، تخیل اور خواب، حب الوطنی، موت وحیات کا فلسفہ، پرندے، ماں، انسانی عظمت، ہجرت اور اخلاقی قدریں ان کی غزل کا خاصہ ہیں۔ممکن ہے کہ ان میں سے اکثر موضوعات عام لگیں لیکن عباس تابش کی شاعری میں یہ موضوعات تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند محسوس ہوتے ہیں۔انہوں نے بالخصوص تصوف اور عشق کو ''رَلا مِلا'' دیا ہے اور اس امتزاج سے شاعری کو تابندگی بخشی ہے۔اس حوالہ سے ڈاکٹر ضیاء الحسن رقم طراز ہیں:

''عباس تابش کی شاعری میں شاعری، درویشی اور عشق ایک ہی کام ہے، یہی وجہ ہے کہ اُس کی شاعری میں انہی موضوعات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اُس نے ان بظاہر مختلف نظر آنے والے کاموں میں ایک تعلق تلاش کیا ہے۔''

اک چٹائی تھی مری ، ایک پیالہ تھا مرا
عام ہو کر بھی یہی خاص حوالہ تھا مرا
میں کہ نقصان کے مانند مِلا تھا خود کو
عشق کرنا ہی مری جان ازالہ تھا مرا

ان کی شاعری میں موضوعات کے رجحانات بدلتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ شاعری کے سفر میں مشاہدے اور تجربے کو ہم سفر بنائے رکھتے ہیں اور ان کی شاعری میں ایک بھرپور تحریک ہے جو ہر قسم کا جمود توڑنے کے کام آتی ہے۔عباس تابش کی شاعری میں موضوعاتی تنوع اور خیال کی رنگا رنگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

عشق نے ظلم کمانے کی اجازت ہی نہ دی
ورنہ یہ شہرِ ستم ایک نوالہ تھا مرا

انھوں نے نرگسیت سے حیات شناسی تک کا سفر کامیابی سے طے کیا ہے جس میں مظہریات اور جمالیات کو خاص مقام حاصل ہے۔انھوں نے علامت واستعارہ کا اک نیا جہان آباد کیا ہے جو ان کی خاص پہچان ہے۔گھر،پیڑ اور پرندے ان کی محبوب و مرغوب علامتیں ہیں اور یہی علامتیں ان کی غزل کی پیامبر بھی ہیں۔

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

میرے اعصاب معطل نہیں ہونے دیں گے
یہ پرندے مجھے پاگل نہیں ہونے دیں گے
یار ! اک بار پرندوں کو حکومت دے دو
یہ کسی شہر کو مقتل نہیں ہونے دیں گے

اس لیے میں نے درختوں سے اجازت مانگی
اچھا لگتا ہے مجھے اپنوں سے مل کر رونا

پھر اس کے بعد پھلوں میں مٹھاس آئی نہیں
شجر نے کام لیا تھا غلط بیانی سے

انھوں نے پیغام پہنچانے کا جو ڈھنگ اور قرینہ سیکھا ہے اس کو سلیقے کے ساتھ نبھایا بھی ہے۔ایک ہی خیال کو مختلف پہلوؤں میں بیان کرنے کا فن ہی دراصل ان کی انفرادیت ہے اور یہ انفرادیت ہی ان کی طاقت اور محبت ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے موضوعات قلب اور روح کی گہرائیوں میں اُتر کر اذہان کی تطہیر و تنویر کرتے ہیں جن میں اثر آفرینی کا اعجاز پوری طاقت سے موجود ہے۔

کوئی افواہ بھی آنگن میں اُتر سکتی ہے
یہ ضروری نہیں کھڑکی سے ہوا ہی آئے

ان کا یہ سلسلہ تاحال کامیابی سے جاری ہے۔ان کے حوالہ سے جاوید اختر پاشا کا ایک جملہ ہی کافی ہے:

''عباس تابش ایک ازلی شاعر ہے جس میں ابدیت بھی پوشیدہ ہے۔''

اکثر و بیشتر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ ادبا و شعراء کو ان کا صحیح مقام ان کے قیدِ حیات سے آزاد ہونے کے بعد ملتا ہے لیکن ایک سچے تخلیق کار کا بروقت اعترافِ کمال بھی ایک نیکی ہے اور اس کو زندگی میں ہی پذیرائی ملنا چاہیے۔عباس تابش بھی عصرِ حاضر کے جدید اور اہم ترین شاعر ہیں۔وہ ایسے خوش نصیب شاعر ہیں کہ انہیں ان کی زندگی میں ہی عروج و پذیرائی حاصل ہے۔کسی بھی محفل میں ان کو وجود طمانیت کا باعث ہوتا ہے۔عباس تابش نے جس مہارت اور ضرورت کے تحت اپنے موضوعات سے نبھا کیا ہے وہ انھی کا خاصہ ہے۔اردو جدید شاعری کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو عباس تابش کی غزل کو ایک مستند حوالہ کے طور پر پیش کیا جائے گا۔اس وقت بہت سے شعراء موجود ہیں جو اپنا مخصوص اسلوب اور اندازِ کلام رکھتے ہیں لیکن عباس تابش کو ان کی زندگی میں باقی ہم عصروں کے مقابلہ میں زیادہ پذیرائی ملی ہے تو یقینی بات ہے کہ وہ کسی خاص انفرادیت کے حامل ہوں گے۔

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

وہ اکثر خواب میں آ کر مری حالت پہ روتی ہے
کہ زیرِ خاک بھی ماں کی پریشانی نہیں جاتی
کلاہ و تخت سے شہزادگی بالکل نہیں مشروط
کہ جب تک ماں ہو زندہ، بوئے سلطانی نہیں جاتی

عباس تابش کی شاعری میں اردو غزل کے روایتی اور جدید موضوعات پوری طاقت، توانائی اور وقار کے ساتھ موجود ہیں۔ان کے ہاں موضوعات میں اک نئی جان اور اور ان کی اک منفرد شان ہے اور انھوں نے ہر عہد میں زندگی کے تغیرات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔عباس تابش کے شعری موضوعات ان کی زندگی کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ اردو غزل کا جمود توڑنے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں اور اس عہد کو اپنے نام کرنے کے تمام شعری لوازمات ان کی شاعری میں موجود ہیں۔اس لیے عباس تابش روایت شکن بھی ہیں اور روایت ساز بھی۔بلاشبہ ان کا نام اردو غزل میں ایک معتبر حوالہ ہے اور اکیسویں صدی کی غزل ان پر فخر کرے گی۔ان کی شاعری ان کا حوالہ اور وہ شاعری کا حوالہ ہیں۔ان کی فکری وسعتوں اور اضافتوں کی بُنت اور تمام تر جمالیاتی پرتوں نے انھیں بے نامی کی زمین سے ناموری کے فلک پر سجادیا ہے۔

کہیں چراغ کہیں چشمِ تر حوالہ ہے
ہر اک حوالہ مرا معتبر حوالہ ہے
کہیں میں کام کہیں صرف نام ہوں تابش
کہیں طویل کہیں مختصر حوالہ ہے

حوالہ جات:

۱۔افتخار عارف،فلیپ ،رقصِ درویش،لاہور،العصر پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء
۲۔اجمل نیازی،ڈاکٹر،فلیپ ،رقصِ درویش،لاہور،العصر پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء
۳۔ضیاء الحسن،ڈاکٹر،پیش لفظ،شجر تسبیح کرتے ہیں،لاہور،الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء
۴۔جاوید اختر پاشا،بہت مجبور ہوں تابش مگر اپنا خدا ہوں،مشمولہ بیاض،لاہور، ملتان روڈ،۲۰۰۴ء

''شیطنیت کے حملے''

حمد

تیرے سوا جہاں میں کوئی نہیں ہمارا
بیکس کا تو ہے ساتھی بے بس کا تو سہارا

یہ رات کا اندھیرا دریا کے یہ تھپیڑے
مولیٰ ہمیں نہیں اب تنکے کا بھی سہارا

چپو بھی چھٹ گئے ہیں بازو بھی تھک گئے ہیں
کشتی بھی ڈولتی ہے اور دُور ہے کنارا

تیرے ہی ہاتھ میں ہے اعداد بیکسوں کی
ہو جائے پار بیڑا جو ہو تیرا سہارا

بخشش کی تیری یارب حد ہی نہیں ہے کوئی
پائی مُراد اُس نے جس نے تجھے پکارا

یہ دوریاں وطن کی یہ ماندگی سفر کی
تنہا یہ اک مسافر پھرتا ہے مارا مارا

یہ کُفر کے اندھیرے بیماریوں کے گھر گھر
یہ شیطنیت کے حملے کیسے ہو اب گزارا

مطلب نہ بھول جانا شاہدؔ تو بندگی کا
اللہ کے کرم کا ہو جائے گا اشارا

محمد شاہد صدیقی شاہدؔ
(کینیڈا)

حمدِ باری تعالیٰ

ہے دُعا دَردعا، خدا سُن لے
دل سے نکلی ہوئی صَدا سُن لے

تُو تو سنتا ہے سارے عالم کی
میری بھی ایک اِلتجا ،سُن لے

سمجھوں گی میں کہ بامُراد ہوئی
گر مرا تُو یہ مدّعا ،سُن لے

میرے سارے عمل کچھ ایسے ہوں
جن میں شامل تری رضا،سُن لے

تیری بخشش کی کوئی حد نہ حساب
کہتی ہے پھیلی یہ ردا، سُن لے

مر کے بھی حق ادا نہیں ہوتا
کس قدر ہے تیری عطا سُن لے

مجھ کو بخشے، مجھے معاف کرے
دائم ہونٹوں پہ ہے دُعا سُن لے!

شگفتہ نازلی
(لاہور)

نعت رسول مقبول ﷺ

محبوبِ کردگار کی یادوں کے پھول ہیں
دامن میں ہم لئے سوئے نعتوں کے پھول ہیں

آئے ہیں ذکرِ رحمتِ عالم کے عشق میں
آنسو تمام بھیگتی آنکھوں کے پھول ہیں

مہکا ہے جن کے نور سے یہ دشتِ کائنات
آقاً فقط وہ آپ کے قدموں کے پھول ہیں

اس کے سوا نہیں ہے کوئی دل کا آسرا
بس میرے پاس چند درودوں کے پھول ہیں

مہکی ہوئی ہیں زیست کے صحرا میں رونقیں
شاخِ قلم پہ نعت کی فصلوں کے پھول ہیں

اتنی کہاں مجال کوئی فرق کر سکیں
اصحابِ باصفا تو گلابوں کے پھول ہیں

شوقِ ثنا میں جتنی بھی نعتیں کہیں عدیؔل
یہ چاہتوں کے چاند ہیں جذبوں کے پھول ہے

ابراہیم عدیل
(جھنگ)

نعت شریف

دیجئے اب تو دلاسا یا نبی
کون ہے اپنا سہارا یا نبی

جانے کب ہو گا بلاوا یا نبی
آپ کے در پر دوبارا یا نبی

نعت لکھوں سرورِ کونین!
ہو زباں پر مرے کلمہ یا نبی

آپ کے نقشِ قدم پر ہم چلیں
آپ نے رستہ دکھایا یا نبی

آپ کی نظر عنایت سے مرا
نام ہر سو جگمگایا یا نبی

آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہے
آپ نے در پر بلایا یا نبی

سیفی سرونجی
(بھارت)

دھیان کا کھیل

عشرت آفرین
(نیویارک)

وہاں اس وقت بھیڑ بہت کم تھی۔ میں اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے دبایا اور چھوڑ دیا۔

کونسی والی؟ اس نے دیوار میں سجی چوڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مختصراً پوچھا۔

یہ والی، مگر ڈھائی نمبر نکالنا۔ میرا ہاتھ بالکل لٹھا ہے۔ میں نے تاکید کی۔

باجی آپ فکر ہی نہ کریں میں آپ کو سوا دو پہناؤں گا۔

ارے بھیا، زندگی بھر ڈھائی نمبر پہنی ہے اب تم سوا دو کہاں سے پہنا دو گے؟ میں ہنسی۔

باجی دیکھتی رہیے۔ وہ گال میں گٹکا یا پان دبائے تھا اور پیک کو روکتے ہوئے خاص انداز میں بول رہا تھا۔

ہائیں یہ اتنی چھوٹی چوڑیاں! میں خوفزدہ ہو گئی۔ میں نہیں پہنوں گی خواہ مخواہ ہاتھ زخمی ہو گا۔ میں نے حجت کی۔

باجی آپ میرے پر چھوڑ دو نا۔ آپ کو چوڑییں پہنانی ہیں یا میرے کو۔ اس نے اگالدان اٹھا کر اس میں گٹکا تھوکا تو صحیح طرح سے بولنے کے قابل ہوا۔ باجی اس میں کڑے لگا دوں۔ اس نے دو خوبصورت کڑے بھی اس میں جوڑتے ہوئے کہا۔

اس سے قیمت اور بڑھ جائے گی؟ پہلے ہی تم مہنگی دے رہے ہو۔ امی نے کل مجھے تمہاری دکان دکھائی تھی۔ مگر دوپٹے چنوانے میں دیر ہو گئی۔ اب تم دام اتنے زیادہ بتا رہے ہو۔ میں نے خفگی سے کہا۔

باجی آپ فکر نہ کرو۔ آپ کو شکایت نہیں ہو گی۔ اس نے نیا پان منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ جوڑ دوں کڑے بولو؟

مہنگے ہیں۔۔۔ میں نے تکرار کی۔

باجی چوڑیوں میں مول بھاؤ نہیں کرتے۔ یہ تو نصیب کی چیج ہے۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اچھا ٹھیک ہے۔ جلدی کرو۔ میں نے اس کا اطمینان دیکھتے ہوئے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہا۔

باہر سے آئی ہو باجی۔ اس نے انگلیوں میں کڑے اور دو چوڑیاں گھماتے ہوئے پوچھا۔

ہوں۔ میں نے بے دلی سے کہا۔

باجی اماں ہماری ستّر برس کی عمر میں اللہ کو پیاری ہوئیں۔ کانچ کی دو چوڑیاں سہی مگر ہاتھ کبھی ننگا نہیں رکھا۔ اللہ کے فضل سے ابّا کے ہاتھ سے مٹی پائی۔ کہتی تھیں چوڑیا ہنس کے پہناؤ۔ کبھی کدارا اپنے فیروز آباد کو یاد کرتی تھیں تو ایسی سریلی آواز میں گاتی تھیں کہ نہ پوچھو۔ کہتی تھیں کہ ہمارے یہاں خاص گانے تھے جو منہارنیں چوڑیاں پہناتے وخت گایا کرتیں تھیں۔ اماں کہے تھیں کہ ہم فیروز آباد والے ہیں ہمارے یہاں سے چوڑیاں پورے ہندوستان میں جاتی تھیں۔ ہماری دادی راجے مہاراجوں کے ہاں چوڑیاں پہنانے جاتی تھیں۔ منّا منہارن کا نام آج بھی جو بچے کھچے رجواڑے ہیں پوچھ لیں کبھی جائیں ہندوستان تو۔ امّاں کہتی تھیں کہ کوئی مانے نہ مانے اس مری گری حالت پر بھی فیروز آباد کے ہاتھ میں ہندوستان کے سہاگ کی کنجی ہے۔ آج بھی سہاگ کی نشانی، کانچ کی چوڑیاں فیروز آباد والوں کی دور سے پہچان میں آئیں باجی۔

تم کہاں پیدا ہوئے تھے؟ میں نے اسے بیچ میں ٹوکا جو چوڑی والا کم اور داستان گو زیادہ معلوم ہو رہا تھا۔

وہ پھر رواں ہو گیا۔ ہم تو کبھی گئے نہیں سب بھائی یہیں کراچی میں پیدا ہوئے ہیں۔ میں اپنی امّاں کا سب سے چھوٹا بیٹا ہوں۔ امّاں کہتی تھیں چھوٹا بیٹا اور کھوٹا پیسہ ہی برے وختوں میں کام آئے ہے۔ بڑے بھائی ذرا آس مراد کے تھے اسکول بھیجے گئے۔ فر (پھر) دس جماعت کیا پڑھ گئے، چوڑیاں پہناتے شرمانے لگے۔ ایک بھائی تو یہیں حبیب بینک جو ہے نا، کے۔ ڈی۔ اے مرکیٹ کے وس طرف واں ہے۔ ادھر سے گزرنا پڑے تو کنّی کاٹ کے نکل جاتا ہے۔ ابّا اب بھی دکان پر آتے ہیں مگر میں نے کیا ابّا اب تم آرام کرو بہت کام کر لیا۔ اللہ کا فضل ہے باجی ابّا میرے سے خوش ہیں۔ ویسے باجی یاں کا تو بڑا ہی برا حال ہے۔ لونڈے سارے نکل لیے۔ کچھ سیاست میں پڑ کے خوار ہوئے کچھ مار دیئے گئے، کچھ چھپتے پھرے۔ اور جو سیاست میں نئیں انیں بھی باہر کی ہونڑ لگی۔ باجی ایمان سے کے ریا ہوں یاں ایک بیچاری نانی تھیں غرارے والی چھٹے چھما ہے ہماری دکان کا ایک چکر ضرور لگا لیتیں۔ پوچھو کیوں۔ ان کی نواسی کی دو بیٹیاں تھیں نواسی تھی امریکہ میں۔ تو بیچاری جب آتی تھیں ایک نیا فوٹو لیے کھڑی ہیں کہ دو ڈبے چوڑییں باندھ دے میرا بچہ۔ اب میں سیج (سائز) پوچھوں تو تصویر دکھائیں باجی ایمان سے میرے کو تو ہنسی آ جاتی تھی۔ میں نے کیا (کہا) امّاں فوٹو سے تو چوڑیوں کا سائج نئیں مل سکتا بس اللہ کا نام لے کے میں تو لپیٹ دیتا تھا۔ فر دیکھو تو تھوڑے دنوں میں کھڑی ہیں بیٹا ذرا ایک ڈبہ چوڑیوں کا بنا دے جلدی سے۔ میں نے کیا نانی وہ چوڑیاں پسند آئیں بچیوں کو۔ تو پھر رو ہانسی۔ بولیں بیٹا کبھی جو لے جانے والا کوئی ملتا ہے تو وخت پر پہنچا تائیں۔ اب واں سے پتہ چلا کہ چوڑییں تو چھوٹی تھیں۔ ایمان سے باجی قسم لے لو جو میں نے بڑی بی سے کبھی منافع لیا ہو۔ برکت تھی ان کے آنے سے۔ نیفے میں بریک بریک (باریک باریک) بتی بنے جنے کتنے نوٹ گھیسڑے رہتیں۔ دھیرے دھیرے انگوٹھے سے ٹھیل ٹھیل کے جب وہ نوٹ باہر نکالیں تھیں تو باجی میرے کو ہنسی روکنا

مشکل ہو جاتا تھا۔اور جب پوچھو پچھلی والی چوڑیاں پسند آئیں تو پھر رو ہانسی۔ارے میرا لال۔۔۔جو لے جانے والے تھے وہ تو ایک دن پہلے چلے گئے امریکہ۔میں نے تو کام والی کی لڑکی شہزادی کو دے دیا بچوں کا صدقہ۔اب کیا کرتی۔بڑھتے بچوں کا ناپ، پھر کانچ کی چوڑییں۔کسم سے باجی بہت برا وخت آ گیا ہے۔ہمارے جاننے والوں میں سب آس پاس بنگلے اور فیلٹ ہیں جو کبھی ابّا کے وخت کے گراہک تھے نا، بھولے بھٹکے آتے ہیں تو خبر ملتی ہے۔ادھر خالی ڈھنڈھار بڑی بڑی کوٹھیاں۔کسم سے باجی الو بولتے ہیں۔آدمی نہ آدم زاد۔دو بڈھے بڑھیا ٹرّوٹوں۔اب دیوار سے سر پھوڑیں بھلا۔پنچھی تو سب اڑ گئے۔اسی لین میں بڑی بی کو دن دہاڑے ڈاکو لوٹ لے گئے خیر انہیں کیا لوٹتے۔ٹی وی اسکوٹر اور پتہ نہیں کیا کیا باجی انہوں نے تو پانی کی موٹر تک کھولی اطمینان سے۔وہ بتا رہی تھیں کہ کمبختی مارے ڈاکوؤں نے چائے بھی بنائی اور ڈھٹائی دیکھو مجھ سے کے رئے امّاں چائے پیو گی۔اب اللہ ماروں سے کوئی پوچھے کہ منہ پر کپڑا بندھا ہے امّاں کے، چائے تیری نانی پیئے گی۔ایک باری ایسا ہوا کہ غرارے والی نانی سامنے دوپٹہ رنگوارئی تھیں۔اور وہ لوگ آ گئے۔اب تڑ تڑ تڑ تڑ تڑغولیاں لگیں چلنے۔۔۔میں نے دیکھا کہ نانی بے چاری پلٹیں اور شائیں سے گولی وِن کے سر کے اوپر سے یوں گئی۔اب ''کی روس فے رنگ'' (کراس فائرنگ) دونوں طرف سے اور امّاں بیچ میں! اتنے میں میرے شلٹر میں آئیں اور میں دم سادھے وہ اشٹول پر بیٹھی ہانپیں۔۔۔اب فیرنگ بند۔سامنے لمبا تڑنگا آدمی زمین پر۔۔۔امّاں کا منہ پیلا زرد۔میں نے اماں سے کیا پانی پی لو۔بولیں تم پی لو بیٹا پہلے۔میں نے کیا امّاں یہ کراچی ہے۔ہم تو روز یہ دیکھتے ہیں۔وِنے ہم سے کچھ نئیں لینا دینا۔جن کو ٹرگٹ کرنا تھا وِن کو کیا۔بزار ویسے کا ویسے۔سامنے لاش پڑی اور لوگ اپنے رستے چل رئے۔یہ دیکھ کے باجی سچ کے ریا ہوں بڑی بی کی جان میں جان آئی۔میں نے کیا امّاں نکلا نہ کرو کسی دن چپیٹ میں آ جاؤ گی۔باجی بڑا برا حال ہے یہاں بوڑھوں کا میں تو کہتا ہوں بزرگ لوگوں کو یا تو ساتھ لے جاؤ نہیں تو ایدھی میں بھیج دو۔اکیلے گھر کی چوکیداری کو جو چھوڑ دیتے ہیں میرے کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ایسا بھی دولت کے پیچھے کیا بھاگنا۔میرا بھی ایک بھائی باہر چلا گیا نا۔میں نے کیا میں کہیں نئیں جاؤں گا۔پرائے دیس میں ہم کیا کریں کے۔ہنر تو یہیں رہ جائے گا ناواں خالی اپنے ہاتھ بیچیں گے۔یاں اپنے پاس ہاتھ بھی ہیں اور خاندانی ہنر بھی۔دیکھو اللہ کا فضل ہے باجی بڑی برکت ڈالی ہے اللہ نے۔دور دور شہرت ہے ہماری دکان کی۔پوچھ لو کسی سے ایک دن۔۔۔وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔اس کی قینچی کی طرح چلتی زبان اور پھرکی کی طرح گھومتا ہوا ہاتھ دونوں ایک لمحے کو رکے۔ہاں کیا ایک دن کیا؟ میں نے تجسس سے پوچھا۔

کہہ یہ ریا تھا کہ ایک دن میں آپ کو دولّہ چوڑیاں پہنا کے دکھاؤں گا باجی۔میری امّاں کہتی تھیں بابو، ہاتھ نا سخت ہوتا ہے نا نرم اور چوڑیاں بھی نا چھوٹی ہوتی ہیں نہ بڑی۔سارا کھیل ہے دھیان کا، گراہک کا دھیان بٹانا پڑتا ہے۔یہ پہلا گُر امّاں نے سکھایا چوڑی پہنانے کا۔اس نے میری کلائی کے نیچے ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ سے چوڑیاں برابر کیں۔ایک دم سیٹ ہے نا باجی۔کلائیوں میں کسی ہوئیں، پر ایک خراش نئیں آئے گی میرے چوڑیاں پہنانے میں۔اس نے فاتحانہ انداز سے مجھے دیکھا۔

اسے کیا خبر کہ اس کی سیدھی سچی باتوں کے زخم ہاتھ کی خراشوں سے کہیں گہرے تھے۔

تم اتنے بڑے تو نہیں ہوا بھی۔اتنا تجربہ کیسے آ گیا؟ میں نے پیسے دیتے ہوئے پوچھا۔

وخت سب سکھا دیتا ہے باجی۔اس نے نوٹ گنتے ہوئے شائستگی سے جواب دیا۔

اس پل اس منحنی سے لڑکے کے چہرے پر ایک سنجیدہ مسکراہٹ تھی اور میں اپنی کلائیوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔خلاف توقع سوا دو نمبر کی باریک کانچ کی چوڑیاں میری کلائیوں میں جگمگا رہی تھیں! اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ چوڑیاں پہنتے ہوئے میرے ہاتھ پر کوئی خراش بھی نہیں آئی۔

بقیہ : زہریلا انسان

مدد سے چمڑے کی سلائی کو اُدھیڑنا شروع کیا۔تینوں عورتیں مجھے تجسس آمیز حیرت سے یہ سب کچھ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔سلائی ادھڑی تو چمڑے کا تعویذ کھُلا جس میں ایک مومی کاغذ تھا۔میں نے بڑی احتیاط سے مومی کاغذ کو کھولنا شروع کیا۔کمرے میں اگرچہ بلب روشن تھا لیکن پہلی نظر میں مجھے سیاہی کے چند دھبوں کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔میں نے ڈالیا سے ٹارچ لانے کو کہا۔ٹارچ کی روشنی میں مجھے اس پر اردو زبان میں بہت باریک لکھائی نظر آئی۔روزی بولی، یہ کونسی زبان ہے۔کیری نے کہا، کیا تم یہ زبان پڑھنا جانتے ہو۔ڈالیا نے پوچھا، مجھے بتاؤ اس میں کیا لکھا ہے؟ میں نے تینوں کو ایک ساتھ جواب دیا یہ لکھائی اردو زبان کی ہے اور میں یہ زبان پڑھنا، لکھنا اور بولنا جانتا ہوں لیکن یہ لکھائی اتنی باریک ہے کہ میرے لیے اسے پڑھنا مشکل ہو رہا ہے۔اگر کسی کے پاس محدب عدسہ ہو تو پڑھنا آسان ہو جائے گا۔میری عمر میں سوئی میں دھاگہ ڈالنا مشکل ہوتا ہے اس لیے میں محدب عدسے کی مدد سے یہ کام کرتی ہوں، یہ کہتے ہوئے روزی نے اٹھ کر ایک بار پھر اپنے سوٹ کیس میں سے سوئی والے ڈبے سے ایک گول عدسہ نکال کر میرے ہاتھ پر رکھا۔عدسے کی مدد سے کاغذ پر لکھی ہوئی ڈیڑھ صد سالہ تحریر پڑھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

یہ گھنٹہ گھر

سیمیں کرن
(فیصل آباد)

میں جب بیاہ کرفیصل آباد آئی تو دِل کو بڑا دھچکا لگا اِک مسلسل دُکھ اورصدمے کی کیفیت تھی اور وہ جو کہتے ہیں کہ ''پیا کا گھر بڑا پیارا لگے''، تو اس کے برعکس پیا کا دیس ہونے کے باوجود یہ شہر مجھے بڑا اجنبی پرایا اور بے مہر سا لگا روکھا پھیکا سا مغرور سا اور یہی مزاج اس شہر کے لوگوں میں ملا تھا۔ اِک عجیب سی سردی، اجنبیت اور غیریت نے رَگِ جاں کو کاٹتی تنہائی نے میرا استقبال کیا۔ عجیب شہر اوراس سے سواتر عجیب مزاج کے حامل لوگ!۔

بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہاں کے لوگوں نے اس شہر کو بڑا عجیب روکھا پھیکا، سرد اور اِک انانیت وغرور بھرا تاثر دے رکھا ہے۔

آج سے بیس برس پیشتر جب میں اس شہر میں آئی تو پسماندگی میں لپٹا یہ شہر جہاں سڑکوں کی حالت دگرگوں، سیر وتفریح کے مواقع اور شہر کی عظمت کے نشان مفقود سوائے اِک گھنٹہ گھر کے!

مجھے یوں لگا کہ بطور اِک نئے شہری کی حیثیت سے اس شہر نے اس کی آب وہَوا حتیٰ کہ اس کے پانی تک نے مجھے قبول کرنے سے انکار کردیا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے بستر مستقل پکڑ لیا اور میرے شوہرِ نامدار کا ڈاکٹر کا بجٹ دوگنا ہوگیا آخر عاجز آکر میرے شوہر نے مجھے منرل واٹر لگوادیا جس پر میری ساس نے لہجے میں تمام تر سردی بھر کر آہ لے کر کہا ''کیی کریے وائی کڑی لوہروں آئی اے نخرے تے وکھاوے گی''،

میں نے دکھ بھری حیرت سے شہر میں اپنے اِس ''سواگت'' کو دیکھا بلکہ شہر کیا تھا دیہی وشہری زندگی کا مغلوبہ تھا۔ جہاں معاشی ترقی کے حیرت ناک نمو نے نظر آتے تھے، معاشی وسائنسی وسماجی سہولیات شہر کی سمت تیزی سے رواں دواں تھیں اور مزاجوں میں دیہی پن کھلا تھا محلوں میں بوڑھی عورتیں جابجا اپنی چار پائیاں، پیڑھیاں بچھائے دھوپ سینکتی، ساگ اور مکئی کی روٹی کی دعوت اُڑاتی، ہر آتے جاتے راہگیر کا شجرہ نسب کھنگالتی، ہر نوجوان عورت اور نوخیز لڑکے لڑکیوں پر اپنی نگاہ رکھنا اور اُن کے معاملات میں اپنی ٹانگ اڑانا عین کارِ ثواب سمجھتی تھیں۔

حتیٰ کہ میرے اندر کسی منفی جذبے نے ہی شاید زبان میں بھی شیرینی کی بجائی اِک کرختگی کو محسوس کیا۔ پنجابی کا اِک عجب اُکھڑ سا لہجہ جس میں کھلا پن تو تھا مگر نرمی اور مٹھاس دور تک نہ تھی بس روح کو کاٹتی کرختگی تھی روزمرہ کے استعمال سے بہت سے الفاظ وہ تھے جس سے میں انجان تھی ساس نے ''چھننی'' بولا اور میں نے چائے کی چھلنی پکڑا دی وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئیں پتہ چلا کہ کٹوری مانگی تھی۔ حالانکہ جو خود کو کھوجوں تو میری جڑیں اسی شہر میں ملیں گی میری مٹی کا خمیر اسی شہر سے اُٹھایا گیا گو اس کو نمو کہیں اور پانا تھا! میرے والدین کا تعلق اسی شہر سے تھا اور اُن کے والدین ہجرت کر کے یہاں آبسے تھے۔ میرا باپ سیلانیوں کی طرح ''نگری نگری پھرا مسافر'' کے مصداق واپڈا کا ایک اعلیٰ افسر ہونے کے ناطے پاکستان کے مختلف حصوں میں تعینات رہا یہی وجہ تھی کہ میرے مزاج میں کوئی علاقائی عصبیت نہ تھی۔ اس حقیقت کے باوجود میں نے اپنا وطن اپنی جنم بھومی سرحد کے (آج کے خیبر پختون خواہ) اُس علاقے کو ہی سمجھا جہاں میں نے آنکھ کھولی۔ اُس گھر کے پیڑ پودے مجھے اب بھی خوابوں میں ملنے چلے آتے ہیں اور اُن کی یاد ہی میں نے اپنے گھر کے چھوٹے سے باغیچے میں امرود کا درخت لگایا ہے اور اُسے بڑھتا پھولتا دیکھ کر میرے دِل کو عجیب سی راحت ہوتی ہے۔ مجھے یوں لگتا کہ میں نے اس شہر میں محبت کا اِک پیڑ لگایا ہے اِک وقت آئے گا کہ یہ پھل پھول دینے لگے گا اور میں جس کے مزاج میں اپنے باپ کے ساتھ مختلف علاقوں میں رہتے کوئی علاقائی عصبیت نہ تھی میں نے تو اِس شہر کو اِک پاکستانی متجسس نگاہ سے دیکھا مگر جس کی روح فیصل آباد کی شہری عصبیت نے علاقائی غرور سے بُری طرح مجروح کیا!

میرے وجود میں اِک مینا کاری نے میرے حیرت اور تجسس کی آنکھ کھول دی اور میں نے اپنی اسی حیرت کی آنکھ سے اِس شہر کو دیکھا فیصل آباد پر میرے احساسات نہ تو کوئی تاریخی دستاویز ٹھہرے نہ کوئی ادبی مضمون! یہ تو اِک ستم رسیدہ کی آپ بیتی ہے اِک متجسس آنکھ کا اپنا مشاہدہ ہے۔ اس انوکھے اور عجب شہر سے میری حیرت ومتجسس روح نے جب سوال کرنے شروع کیے تو جواب ازخود ملنے شروع ہوگئے۔ یہ شہر جو کبھی میرا الف لیلوی شہر تھا جی ہاں میرا الف لیلوی شہر !وہ وقت جب چاند ستارے روز رات کو بستر میں ملنے آتے ہیں۔ جب پریاں اپنی اور بلاتی ہیں جب پرندوں کی بولی خود بخود وجدان کھول کر سمجھا تا ہے ہاں اس وقت میرا یہ ننھیالی وددھیالی شہر میرا الف لیلوی دیس تھا، جس رات امی چمڑے کے کالے اٹیچی کیس میں کپڑے اور تام چینی کے پیلے ٹفن بکس میں قیمے والے پراٹھے سفر کے لیے رکھا کرتی تھیں تو اِس شہر میں رہنے والی پریاں ساری رات جگاتی تھیں میں اور بھائی خوشی کے مارے سو نہیں پاتے تھے۔ وہ پنڈی سے ریل گاڑی کا لمبا سفر، آتے ہوئے رات کا سفر اور جاتے ہوئے ستاروں کی چھاؤں میں جھٹپٹے اندھیرے لمبی سیاہ کولتار سڑک پر ٹک ٹک کرتا تانگہ دور تک خالی سڑک پر جاتا اس وقت اس شہر کی جانب اِک انوکھی کشش بلاتی تھی!

تو پھر اَب کیا ہُوا؟ میری حیرت نے مجھ سے سَوال کیا؟ آخر اَب یہ مجھ سے اور میں اس سے برہم کیوں؟ تو کیا یہ واقعی الف لیلوی شہر تھا؟ جو جادو کے زور سے کچھ بدل گیا غائب ہوگیا! سب کچھ وہی تھا ویسا ہی تھا کچھ بھی تو نہ بدلا تھا وہی شہر ویسے ہی لوگ وہی مغرور اُونچا سا گھنٹہ گھر اپنے اردگرد آٹھ بازار لیے۔

ہاں شاید یہی مسئلہ تھا کہ میرے بچپن کو بیتے مدتیں گزر گئیں اور یہاں کچھ بھی نہ بدل سکا تھا۔ شہر اور دیہی کلچر کا اِک عجب آہنگ تھا۔ میں نے محسوس کیا

یہی چیز جو مجھے کاٹ رہی تھی۔ اندر سے چھیل رہی تھی میں نے بیس پر غور کیا تو مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ اِس شہر کی ابھی عمر ہی کیا ہے بھلا جمعہ جمعہ آٹھ دِن ابھی اِک صدی پیشتر تو لارڈ لائل نے مانچسٹر کے نقشے پر اس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ اِک صدی کسی شہر کی عمر ہی کیا ہے؟ بھلا! کوئی تاریخی ورثہ اور تہذیب وثقافت جنم لینے میں صدیوں کی وہاں بسنے والے لوگوں کی وہاں کے عوام اور خواص کی ریاضت مانگتی ہے اور مجھے لگا کہ اس شہر کے مخصوص مزاج کا راز اِس کے ''مانچسٹر'' ہونے ہی میں پنہاں ہے۔ مانچسٹر ہونا اس کے لیے بیک وقت اِک نعمت وزحمت بن گیا ہے۔ پاکستان کا صنعتی شہر ہونے کے ناطے ترقی صرف ظاہر میں آئی باطن کورے کا کورا رہ گیا یہاں کا بھاری پانی صنعت کے لیے نعمت اور مزاجوں کو بھاری پن اور رجعت پسندی دے گیا شاید!

ایسا شہر جس کا نہ کوئی تاریخی ورثہ اور تہذیبی اثاثہ اور اپنی معاش کے بل بوتے پر وہ پاکستان کا تیسرا بڑا صنعتی شہر بن گیا یہاں کی یارن مارکیٹ ایشیا کی سب سے بڑی مارکیٹ بن گئی۔ اس کے پاس فخر اور ناز کو سوائے اِک گھنٹہ گھر کے کچھ بھی نہیں! ایشیا کی سب سے بڑی زرعی یونیورسٹی یہاں مگر تعلیم مزاج میں کیوں نہیں! شہر کے وسط میں دھوبی گھاٹ جو صرف سیاسی گند دھونے کے لیے کبھی کبھار سنوارا جاتا ہے۔

گھنٹہ گھر اس شہر کی علامت و پہچان بھی اور فخر بھی! اس گھنٹہ گھر کو اِک وقت تھا کہ میں نے طفلانہ وفورِ اشتیاق سے دیکھا اور آج کھوج اور استعجاب کی نظر سے! مجھے لگا کہ شہر کی عمارتیں وہاں کے مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اِسی طرح گھنٹہ گھر اِک غرور مرکزیت کی علامت یہاں کے شہریوں کے مزاج کی عکاسی! پھر میرے ساتھ یک طرفہ تماشہ ہُوا میں جو شہر اور لوگوں کی نفسیات کو کھوجتی پھرتی تھی مجھے مختلف سروں پر مختلف جسامت کے چھوٹے بڑے گھنٹہ گھر نظر آنے لگے!

گھنٹہ گھر عمومیت میں ہر شخص کے اندر اور خصوصیت میں مجھے یہاں نظر آیا حتیٰ کہ مجھے اپنے گھر میں اپنی ساس بھی اِک گھنٹہ گھر ہی نظر آئی کہ خاندان کے تمام رستے یہیں آ کر ملتے کھلتے اور بند ہو جاتے تھے۔ آخر مملکتِ پاکستان کا اِک آئین بھی تو بنا تھا 1962ء میں جس میں طاقت کے سارے سرچشمے اِک سمت کو جاتے تھے اور ستم ظریفوں نے اِسے طنزاً گھنٹہ گھر کہا تھا۔

یہ گھنٹہ گھر جو ایک کنویں پر تعمیر کیا گیا اور چک رام دیوالی کے فارموں کی مٹی سے اس کنویں کو بھرا گیا۔ سانگلہ ہل کے سنگلاخ پتھروں سے تعمیر ہُوا گویا گہرائی وسربلندی دونوں اس کی بنیادوں کا اساسی حصہ بنی۔ اس کی تعمیری نگرانی جس گلاب خان نے کی تھی وہ اُس خاندان کا چشم وچراغ تھا جن ہاتھوں نے آگرہ تاج محل کی تعمیر میں حصہ لیا گویا تاریخی عظمت پر ناز کرنے کے تمام لوازم موجود تھے۔ جب تعمیر کیا گیا تھا تو چاروں بازاروں کے سامنے فوارے نصب تھے مگر عدم توجہ کے باعث گھنٹہ گھر اور یہ فوارے سر نہواڑے اپنی حالت پہ ماتم کناں نظر آتے ہیں۔ کیا یہ گھنٹہ گھر واحد تاریخی علامت و عمارت بھی اس شہر کے باسیوں سے سنبھالی نہیں جاتی؟۔ شاید یہاں کے امرأ اس شہر کے خواص وعوام دونوں کے مزاجوں میں گھنٹہ گھر کھلا ہے۔ امرا بے تحاشا امرأ اس ملک کے گنے چنے روسأ اس شہر میں مقیم مگر ان کے لیے یہاں قیام صرف اِک سرائے کی طرح ہے شاپنگ کرنے وہ عموماً لاہور، اسلام آباد اور خصوصاً یورپ اور دبئ جاتے ہیں اور قیام زیادہ تر لاہور، اسلام آباد یا پھر مری۔ اس لیے اس ''سرائے'' کی حالت پر توجہ دینے کی چنداں ضرورت نہیں اور رہے عوام اُن کی اکثریت مزدور پیشہ جن کی زندگی اپنے دکھوں کے ہشت بازاروں میں گھومتے گزر جاتی ہے۔ گو کہ اب حالات وہ بیس برس پیشتر والے تو نہیں رہے۔ شہر تیزی سے ترقی کی جانب گامزن، کشادہ سڑکیں ، اونچی عمارات، شاپنگ مالز، کچھ پرائیویٹ تعلیمی ادارے مگر اس ترقی کو مزاجوں میں در آنے میں جانے کتنا وقت لگے گا۔

یہاں میرے سوال کرنے کی عادت نے مجھے بڑا رُسوا کیا، بھلا ہو میرے اساتذہ کا جنہوں نے میری، ''کیوں'' سے دوستی کروائی کہ، ''کیوں اور کیا'' علم کا پہلا در پہلی آشنائی اسے قرار دیا ہے۔ ''کیوں اور کیا'' تو شاید پہلے ہی میرے مزاج میں کھلا تھا جاننے کی خواہش نے اسے دوآتشہ کر دیا مگر مجھے خبر نہیں تھی کہ اس شہر کے گھنٹہ گھر اس آتش میں مجھے ہی جھونک دیں گے۔

میں اپنے بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ابتدائی ایک دو باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر کی سیٹ پر اِک گھنٹہ گھر بیٹھا ہُوا ہے۔ میرے ایک دو سوال پوچھنے پر وہ سیخ پا ہو گیا: ''بی بی! آپ کو اگر اتنا Knowledge ہے تو آپ میرے پاس کیا کرنے آئی ہیں؟'' پھر اپنے گول گول دیدے گھما کر وہ میرے شوہر کی طرف رُخ کر کے بولا: ''آپ کی مسز کو مطمئن کرنا مشکل کام ہے یہاں پر تو شاید ہی ان کے سوالوں کے جواب کوئی دے پائے'' یہ گویا اِک کھلی دعوت تھی، میرے شوہر کے ہاتھ میں جھنجھنا دینے کے مترادف تھا اور اس جھن جھنے کو بجا کر انہوں نے جی بھر کر حظ اُٹھایا، آخر ہر شوہر کے کندھوں پر بھی تو اِک گھنٹہ گھر ہوتا ہے جہاں طاقت و مرکزیت کے تمام دروازے آ کر کھلتے ہیں۔

طرفہ تماشا یہ کہ صنعتی و تجارتی شہر ہونے کے باوجود بعض دُکانوں اور شاپنگ سنٹرز میں بھی مارکیٹنگ کے اصول کے برعکس ''گھنٹہ گھر'' ہی بیٹھے تھے جو اپنی پراڈکٹ کے بارے میں کوئی جانکاری دینا، بتانا سخت ناپسند کرتے اور منہ پھیر کر کہتے: ''جائیں بی بی! اپنا کام کریں کہیں اور سے خرید لیں''، اِک شاپنگ کرنے والا مجھ سا اناڑی اور سامنے اِک گھنٹہ گھر جو ہونہ سو ہو!

میرا تجربہ ومشاہدہ ہے زندگی کے ہر اُس شعبہ میں آپ کا سامنا ''اِک گھنٹہ گھر'' سے ہوگا جہاں مسابقت عدم ہوگی جہاں اجارہ داری ہوگی وہاں اِک گھنٹہ گھر براجمان ہوگا۔

یہاں پرائیویٹ تعلیمی اداروں اور پرائیویٹ کلینکس میں مجھے اتنے گھنٹہ گھروں سے ملنے کا شرف حاصل ہُوا کہ اگر اُن تلخ تجربوں کو رقم کرنے بیٹھوں تو شاید اِک الگ کتاب مرتب ہو جائے حالانکہ تجارتی اصولوں کی بنا پر مذکورہ

باقی صفحہ ۵۰ پر ملاحظہ کیجیے

انٹرنیشنل پارک

اے خیام
(کراچی)

انٹرویو سے فارغ ہوکر وہ ڈاک خانے پہنچا، چند لفافے سپردِ ڈاک کیے اور اپنے جانے پہچانے راستے پر چل پڑا۔ اس راستے پر وہ آنکھیں بند کر کے چل سکتا تھا۔ سارے اونچ نیچ سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ سر نیہوڑائے وہ چلتا رہا اور تھوڑی دیر میں اپنے مخصوص خوانچے والے کے پاس جا پہنچا۔ اس کا لفافہ تیار تھا۔ خوانچے والے نے اس کا لفافہ اس کی طرف بڑھایا اور اس نے ایک سکّہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ خوانچے والے نے بغیر دیکھے ہوئے وہ سکّہ اپنے گلّے میں ڈال لیا۔ اسی طرح ہوتا آیا تھا۔ نہ اس نے کبھی روپے سے زیادہ ادائیگی کی اور نہ ہی خوانچے والے نے بھنے ہوئے چنے کی مقدار میں کوئی کمی کی۔ چڑیا گھر کے نکڑ پر اخبار، رسالے والے کی دُکان تھی۔ اس نے پیسے بڑھائے اور دکاندار نے ہاتھ بڑھا کر اندر سے اس کے لیے مخصوص اخبار نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ دن کا اخبار اس وقت تک فروخت ہو چکا ہوتا تھا لیکن اس کے لیے ایک کاپی محفوظ رہتی تھی۔ اس نے اپنا بستہ، اخبار اور خوانچے والے سے لیے ہوئے لفافے سنبھالے اور چڑیا گھر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ بڑے دروازے کے بعد داخلی کے لیے ایک چھوٹا دروازہ تھا۔ اس وقت بھیڑ نہیں تھی۔ چھوٹے دروازے سے ہٹ کر چڑیا گھر کے دو تین اہل کار اسٹول پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہ قریب پہنچا تو ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہو گئے۔

''بابو، سندری زخمی ہو گئی ہے۔'' ان میں سے ایک نے کہا اور پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ چڑیا گھر میں داخلے کے ٹکٹ کا اس سے کوئی مطالبہ نہیں کرتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا بندروں کے پنجرے کے پاس پہنچا۔ سندر اور سندری بندروں کی ایک جوڑی کا نام تھا جسے افریقہ کے ایک ملک نے خیر سگالی کے طور پر تحفتاً دیا تھا۔ اسے دیکھ کر کئی بندروں نے خیں خیں کی آواز لگائی، دو تین چھلانگیں لگائیں اور ایک بندر کے آس پاس جمع ہو گئے جو ایک کونے میں اَدھ لیٹا پڑا تھا، وہ سندری تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں، اسے دیکھا اور پھر آنکھیں موند لیں۔ نورا دروازے سے اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ وہ اسے بتا تا رہا کہ اسکول کے بچوں کا ایک گروہ صبح یہاں سیر کے لیے آیا تھا، بندر اپنی چہلوں میں مشغول تھے، سندری جالی پر چڑھ آئی تھی، کسی بچے نے اسے پتھر دے مارا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور گر پڑی۔ غالباً اس کے سر میں چوٹ آئی تھی، زخمی ہو گئی۔

وہ کچھ دیر کھڑا رہا، کچھ اور لوگ بھی وہاں جمع تھے، پھر وہ آگے بڑھ گیا۔ پورے چڑیا گھر کا ایک چکر لگا کر وہ ایک مخصوص درخت کے پاس پہنچا، اپنا لفافہ اور اخبار گود میں ڈال کر اپنے بستے کو درخت کے تنے سے لگایا اور اس پر سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح پڑا رہا۔ اپنی تھکن کا احساس وہ اسی طرح زائل کرتا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ اخبار اور لفافہ اپنے بستے سے دبایا اور قریب کے نلکے کے پاس پہنچ کر پہلے ہاتھ دھوئے، منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور دو تین گھونٹ پانی حلق سے اُتار کر واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔

اس نے بستہ ایک طرف کیا، اخبار سامنے پھیلا لیا اور لفافہ دائیں طرف رکھ کر اس کا منہ کھول دیا۔ اخبار پڑھتا رہا اور چنے پھانکتا رہا۔ جلی سرخیوں والی خبریں پڑھ چکا تو اس نے چھوٹی چھوٹی خبروں کی طرف توجہ دی۔ اسے چیتل کے زخمی ہونے کی خبر کی تلاش تھی۔ بالآخر اسے وہ خبر مل گئی۔ گزشتہ روز چیتل پر کسی نے غلیل کا نشانہ لگایا تھا، خبر میں مختلف قسم کی قیاس آرائیاں تھیں۔

ایسی خبریں اب تقریباً روزانہ پڑھنے کو مل رہی تھیں۔ کبھی کوئی بندر زخمی ہو جاتا، کبھی بے توجہی کے سبب شتر مرغ کے بیمار پڑنے کی خبر مل جاتی، کبھی کوئی ریچھ کو چھیڑ دیتا اور ایک تہلکہ مچ جاتا، کبھی پرندوں کے پنجروں میں کسی سانپ کے گھس جانے کی خبر ہوتی اور کئی بہت قیمتی پرندے مردہ پائے جاتے۔ اخبارات میں پہلے چھوٹی چھوٹی خبریں شائع ہوتیں۔ پھر بڑی بڑی سرخیوں میں خبریں لگنے لگیں، بلدیہ کے اجلاس میں زوردار بحث مباحثے ہوئے، وہ خود چڑیا گھر کے منتظمین سے ملتا، دیر تک گفتگو کرتا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

اس نے اخبار کا ''ضرورت ہے'' کا صفحہ نکالا اور اپنے بستے سے قلم نکال کر اپنی اہلیت کے مطابق شائع ہونے والے اشتہاروں کو قلم زد کرنے لگا۔ کہیں ذاتی طور پر ملنے کو کہا گیا تھا، اس کا پتہ اس نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیا، کہیں درخواست مانگی گئی تھی، اس کے لیے درخواستیں اس کے پاس تیار رہتی تھیں، صرف پتہ ٹائپ کرنا ہوتا تھا۔ ان سب سے فارغ ہوا تو شام ہو چلی تھی اور لوگ رخصت ہونا شروع ہو گئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں سنّاٹا چھا گیا۔ وہ اٹھا اور چل پڑا۔ ہر پنجرے اور کٹہرے کے پاس وہ تھوڑی دیر کھڑا رہتا، ان میں قید جانوروں سے وہ تھوڑی دیر ان ہی کی زبان میں باتیں کرتا، اندر جانور اچھل کود کرتے اور وہ آگے بڑھ جاتا۔

آج اس نے بندروں کے پنجرے کے پاس کافی دیر لگائی۔ اس نے آواز نکالی تو اندر بندروں میں کھلبلی مچ گئی۔ سب تیز تیز آوازیں نکالتے ہوئے اِدھر اُدھر اچھل کود کرنے لگے، پھو خود ہی شانت ہو گئے۔ سندری آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جالی کے قریب آئی، کچھ دیر کھڑی رہی، پھر واپس درخت کے تنے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ وہ ڈاکٹر کو ساتھ لے جا کر اس کا معائنہ کرا چکا تھا۔

''یہ ٹھیک ہو جائے گی۔'' اس نے سوچا اور چڑیا گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دروازے سے باہر نکلا تو اسے آواز سنائی دی۔

''نورے، مین گیٹ بند کردے، بابو نکل گیا ہے۔''

یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔صبح سویرے گھر سے نکلتا، ملازمت کے لیے انٹرویو دیتا، درخواستیں سپردِ ڈاک کرتا، خوانچے والے سے اپنا لفافہ لیتا، اخبار اٹھاتا اور چڑیا گھر پہنچ جاتا۔جانوروں کے علاج کے سلسلے میں چڑیا گھر کا ڈاکٹر اس کی مدد کا طالب ہوتا کیونکہ پورے عملے میں کسی میں بھی اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ زخمی یا بیمار جانور کو اپنے قابو میں کر سکے۔شام کو واپسی سے پہلے تمام پنجروں، کٹہروں کے پاس تھوڑا تھوڑا وقت دیتا، ان سے ان کی زبان میں گفتگو کرتا اور واپس گھر پہنچ جاتا۔جس روز دفاتر بند ہوتے وہ براہ راست چڑیا گھر پہنچتا۔

اگلے روز ابھی وہ اپنا اخبار وصول کر ہی رہا تھا کہ اسے شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی۔وہ چونک پڑا۔یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔وہ تیزی سے چڑیا گھر کے دروازے کی طرف لپکا۔دروازے پر ایک جم غفیر تھا۔وہ انھیں ہٹاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔چڑیا گھر کے کئی اہل کار وہاں موجود تھے۔ان کی نظریں اس پر پڑیں تو وہ اس کے لیے راستہ بنانے لگے۔ان کے چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی، جیسے وہ اسی کے منتظر تھے اور اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ تیزی سے اندر پہنچا۔اس نے پورے چڑیا گھر کا چکر نہیں لگایا بلکہ سیدھا شیر کے کٹہرے کی طرف بڑھا۔کٹہرے سے کچھ دور پر لوگوں کی بھیڑ جمع تھی اور چڑیا گھر کے اہل کاروں نے انھیں آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا۔وہ ان کے قریب سے گزرتا ہوا آگے بڑھا، اسے کسی نے روکا نہیں بلکہ اس کے لیے راستہ بناتے رہے۔اس نے اپنا بستہ، لفافہ اور اخبار ایک طرف پٹخا اور ڈاکٹر و منتظمین کی طرف بڑھ گیا جو ایک طرف بے بس کھڑے تھے۔

منتظم اعلیٰ نے اسے بتایا کہ کسی نے شیر کی جنگلے سے باہر نکلی ہوئی دُم پوری طاقت سے کھینچ لی تھی، شیر بُری طرح زخمی ہو گیا تھا اور اس نے پورے چڑیا گھر کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح زخم کا معائنہ کرے تا کہ علاج ممکن ہو سکے۔شیر بے حد غصّے میں تھا اور کسی کو اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

ان سے بات چیت کر کے وہ آہستہ آہستہ شیر کے کٹہرے کی طرف بڑھنے لگا، مجمع پر سناٹا طاری ہو گیا۔شیر کے دھاڑنے کی آواز مزید بڑھ گئی۔وہ کٹہرے کے قریب پہنچ گیا۔اس کے گلے سے عجیب عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔شیر پورے کٹہرے میں تیزی سے چکر لگا رہا تھا اور دھاڑ رہا تھا۔وہ کٹہرے کی سلاخیں پکڑے کھڑا رہا اور گلے سے آوازیں نکالتا رہا۔اچانک شیر نے چکر لگانا بند کر دیا اور سلاخوں کے قریب آ کر پچھاڑیں کھانے لگا۔اس کی تیز تیز سانسیں لینے کی آواز دور تک سنی جا سکتی تھی۔وہ سلاخوں کے قریب کھڑا ہوا ویسی ہی آوازیں نکالتا رہا، شیر کچھ پُرسکون ہو چلا تھا۔ڈاکٹر اور منتظمین نے آگے بڑھنا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں روک دیا اور اپنی حکمت عملی میں مصروف رہا۔اب شیر بیٹھ گیا تھا اور دھاڑنا بھی بند کر دیا تھا۔اس نے ڈاکٹر اور نورے کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔نورا شیر کو غذا مہیا کرتا تھا اس لیے شیر کے لیے وہ نامانوس نہیں تھا۔

کٹہرے کا دروازہ کھول کر وہ پہلے اندر داخل ہوا اور شیر کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا، منتظمین بھی دم سادھے دور کھڑے تھے۔پھر اس نے ڈاکٹر کو اندر آنے کا اشارہ کیا، اس اثنا میں وہ دھیرے دھیرے اپنے گلے سے آوازیں نکالتا رہا۔شیر کی کمر پر اس نے ہاتھ پھیرا اور شیر جیسے اس کا اشارہ سمجھ کر دوسری طرف منھ پھیر کر لیٹ گیا۔ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا، زخم دھویا، ٹیکہ لگایا اور مرہم لگا کر اٹھ گیا۔شیر تیز تیز سانسیں لیتا رہا اور وہ مسلسل اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتا رہا اور اپنے گلے سے آوازیں نکالتا رہا۔

وہ باہر نکلا تو منتظمین گھبرائے ہوئے اس کی طرف لپکے۔

''اخبار والے تو آسمان سر پر اٹھا لیں گے۔پہلے ہی وہ شاکی ہیں کہ شیروں کو مناسب مقدار میں غذا فراہم نہیں کی جاتی اور یہ کہ ہم لوگوں نے جیسے دانستہ شیروں کو بکریاں بنا کر رکھ دیا ہے۔اب کیا ہوگا؟''

اس نے اپنی چیزیں اٹھائیں اور منتظمِ اعلیٰ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

ایک بار پلٹ کر اس نے کٹہرے کی طرف دیکھا، شیر اپنے کچھار میں جا رہا تھا۔اس کی دھاڑ سے اس کے پڑوس کے کٹہرے میں بند ریچھ بھی سہمے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔

توقع کے مطابق اگلے روز کے اخبارات میں شیر کے زخمی ہونے کی خبر جلی حروف میں شائع ہوئی تھی۔اس سے اگلے روز کسی نے زرافہ کی گردن پر ڈاٹ کا نشانہ لگایا تھا اور اس سے اگلے روز اخباروں نے زوردار اداریے لکھ ڈالے۔

چڑیا گھر کی انتظامیہ بے بس تھی۔کبھی وہ بجٹ کا رونا روتی اور کبھی غیر تعلیم یافتہ تماشائیوں کا۔حکومت نے ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھا دیا جسے تیس دنوں میں اپنی رپورٹ پیش کرنا تھی۔ان تیس دنوں میں جانوروں اور پرندوں کے مرنے اور بیمار پڑنے کی خبریں مسلسل شائع ہوتی رہیں۔جانوروں کی تعداد چڑیا گھر میں تشویشناک حد تک کم ہوتی گئی اور تماشائیوں کی تعداد بھی مایوسیوں کا شکار ہو کر کم سے کم ہوتی گئی۔

تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ تیار ہو کر حکومت کو پیش ہوئی۔کابینہ کا متفقہ فیصلہ تھا کہ چڑیا گھر کا نظام اس کے موجودہ منتظمین سے درست نہیں ہو سکتا۔اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ بیرونی ممالک، خصوصاً ترقی یافتہ ملکوں سے ماہرین کی ٹیم درآمد کی جائے جو چڑیا گھر کے انتظام کو صحیح خطوط پر استوار کرے۔

حکومت کے بڑے اہل کاروں نے مغرب کی دوڑ لگانی شروع کر دی۔معاہدے ہوئے، کئی معائنہ ٹیمیں آئیں اور چلی گئیں۔فیصلہ ہوا کہ ایک مستقل ٹیم چڑیا گھر کے انتظام و انصرام کو سائنسی خطوط پر استوار کرے گی، نئے اور

مختلف النوع جانور مہیا کرے گی اور اپنی نگرانی میں تکنیکی تربیت فراہم کرے گی۔

ان سب انتظامات کے لیے اس مستقل ٹیم کو کافی وقت درکار تھا اور اتنی لمبی مدت کے لیے چڑیا گھر کو بند نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اس کا بندوبست بھی مستقل ٹیم نے کرلیا تھا۔ اس نے چڑیا گھر کے مقامی منتظموں کے ساتھ کئی میٹنگیں کیں، اور رازداری کی قسمیں لی گئیں۔

ایک مہینے تک چڑیا گھر مکمل طور پر تماشائیوں کے لیے بند رہا۔ وہ اپنا بستہ، لفافہ اور اخبار کے ساتھ چڑیا گھر آتا رہا۔ اس کے لیے کوئی روکاوٹ نہیں تھی۔ کسی نے اسے اندر جانے سے نہیں روکا تھا۔ مستقل ٹیم کے افراد مقامی انتظامی اہل کاروں کے ساتھ روزانہ چڑیا گھر میں چہل قدمی کرتے، جگہوں کے انتخاب پر گفتگو کرتے اور انتظامات سے متعلق ہدایات جاری کرتے۔ ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ اس مستقل ٹیم کے افراد کی نظر اس پر پڑ گئی تو اس کے متعلق مقامی انتظامیہ کے اہل کاروں سے دریافت کیا۔ مقامی افراد نے اس کے متعلق انھیں تفصیل سے بتایا۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی اور جیسے مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر آیا۔

اگلے روز اسے دفتر میں بلوایا گیا۔ اسے ملازمت کے لیے آفر دی گئی اور اس سلسلے میں تمام حدود و قیود کو نظر انداز کر دیا گیا۔ یہاں کا مقامی منتظم اعلیٰ ہمیشہ اس کے لیے سفارشات کرتا رہا تھا لیکن اس کی تمام کوششیں ناکام رہی تھیں۔ اسے آفر ملی تو اس نے قبول کرلیا۔ اس سے کسی اہلیت اور قابلیت کی سند کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ بس سخت رازداری کی کڑی شرط رکھی گئی تھی۔

اس سے مختلف جانوروں کی بولیاں بلوائی گئیں، پرندوں کی چہچہاہٹ سنی گئی، بندروں کی خیں خیں، حتیٰ کہ ڈولفن کی چیں چیں کی آواز بھی اس نے بڑی مہارت سے سنائی۔ اس کے ذمہ ایسے لوگوں کو مہیا کرنا تھا جو جانوروں کی آواز نکالنے میں مہارت رکھتے ہوں۔ جانوروں کے عادات واطوار سے پوری طرح واقف ہوں۔ ایسے لوگوں کی مکمل تربیت کی ذمہ داری بھی اس کے سپرد کردی گئی تھی۔ پیشکش بہت اچھی تھی۔ ان سے فارغ ہوکر وہ اپنی مخصوص جگہ پر آ گیا اور دیر تک آنکھیں بند کیے اس پیشکش پر غور کرتا رہا۔ ملازمت تو مل گئی تھی لیکن کام اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ وہ ایسے لوگوں کو کہاں سے مہیا کرے گا، یہ سوال اس کے لیے پریشان کن تھا۔

شام ہونے لگی تو وہ اٹھا، حسب معمول جانوروں کے پنجروں اور کٹہروں کی طرف چل پڑا اور ان سے ان کی زبان میں باتیں کرتا ہوا چلتا رہا۔ ریچھوں کے کٹہرے کے پاس ابھی وہ آواز نکالنے ہی والا تھا کہ چونک پڑا۔ ریچھ اس کے سامنے تھا، اس کا منھ بند تھا لیکن اس کے دھاڑنے کی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ اسے غور سے دیکھتا رہا، آواز مسلسل آ رہی تھی لیکن غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ آواز کچھ دور سے آ رہی ہے۔ وہ اندازہ لگا کر دبے پاؤں اس آواز کی طرف بڑھا، کٹہرے کے دوسری طرف کوئی شخص چھپا ہوا منہ پر دونوں ہاتھ رکھے ریچھ کی آواز نکال رہا تھا۔ آواز پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے اس شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، وہ چونک کر پلٹا، پھر ہنسنے لگا، یہ نورا تھا۔

''بابو، تم اکیلے اس کام کے ماہر نہیں ہو، میں بھی ایسی آوازیں نکال سکتا ہوں۔ کہو، کیسی رہی؟''

وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا، پھر نورے سے کہا، ''نورے کل مجھ سے ملنا۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

پھر وہ اپنا دورہ مکمل کر کے چڑیا گھر سے نکل گیا۔

اگلے روز وہ نورے کو لے کر انتظامیہ کے پاس پہنچا۔ کچھ تفصیلات طے ہوئیں اور نورے کی تنخواہ بڑھا کر اسے اس کی تحویل میں دے دیا گیا۔ نورے نے ایسے آدمیوں کی قطار لگا دی جو جانوروں کی عادات سے واقف تھے اور ان کی بولیاں بول سکتے تھے۔

اب وہ صبح کے وقت چڑیا گھر میں داخل ہوتا، ایک کمرے میں تمام لوگ جمع ہوتے اور آوازوں اور عادتوں کا مظاہرہ ہوتا اور کمی بیشی کی تربیت کی جاتی۔

مستقل ٹیم نے اسے مختلف النوع جانوروں کی کھالیں بھی مہیا کر دی تھیں۔ تربیت کا معیار بڑھتا جا رہا تھا۔ اب کھال پہن کر اس جانور کی آواز نکالنے کے لیے کہا جاتا، اسے چلنے پھرنے، کھانے پینے کی تربیت دی جاتی اور جس کی تربیت مکمل ہو جاتی اسے مستقل ٹیم کے سامنے پیش کر دیا جاتا۔

مستقل ٹیم کو ایسے تربیت یافتہ افراد کی ضرورت شدت سے تھی جو ان جانوروں کی کمی کو پورا کر سکتے جو چڑیا گھر میں موجود نہیں تھے۔ اس طرح کے جانوروں کے لیے افراد پہلے تیار کیے گئے اور کٹہروں اور پنجروں میں پہنچا دیے گئے۔

شیر اور ریچھ کے لیے اب تک مناسب افراد نہیں مل سکے تھے۔ اس نے آخر کار نورے کو ہی ریچھ کے لیے منتخب کیا اور خود شیر بن بیٹھا۔ ریچھ اور شیر کی کھال پہن کر وہ دیر تک مستقل ٹیم کے سامنے اپنی آوازوں اور چلنے پھرنے، کھانے پینے کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اگلے روز وہ بھی اپنے کٹہرے میں پہنچا دیے گئے۔

اب چڑیا گھر مکمل تھا۔ ایک پریس کانفرنس بلائی گئی اور مستقل ٹیم نے مقامی انتظامیہ سمیت انھیں خطاب کیا۔ پھر انھیں چڑیا گھر کی سیر کرائی گئی۔ ہر پنجرے اور کٹہرے کے قریب ایک تختی لگی تھی جس پر اس جانور کا نام، عادات، مقامیت وغیرہ کی تفصیل درج تھی۔ مستقل ٹیم کا فرد اس جانور کو مخاطب کرتا اور وہ اپنی آواز نکال کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ چڑیا گھر میں جانوروں کی ریل پیل تھی، کوئی بھی پنجرہ یا کٹہرہ خالی نہیں تھا۔

چند دنوں میں اخبارات میں فیچر شائع ہوئے۔ اب یہ چڑیا گھر دنیا کے کسی بھی چڑیا گھر کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ اخبارات کے مطابق یہ

ترقی یافتہ مغربی ممالک کے ماہرین ہی تھے جنھوں نے اس چڑیا گھر کو اتنے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا دیا تھا۔

اب چڑیا گھر عام تماشائیوں کے لیے کھول دیا گیا۔اس نے نورے کے کہنے پر کچھار سے ایک راستہ ریچھ کے کٹہرے کی طرف نکلوا دیا تھا تا کہ فارغ اوقات میں یہاں کے انتظامات سے متعلق تبادلۂ خیالات کیا جا سکے،نورا یوں بھی زیادہ دیر تک خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ جب دیکھتا کہ تماشائیوں سے چڑیا گھر خالی ہے تو وہ شیر کی کچھار میں آجاتا اور اس سے باتیں کرنے لگ جاتا۔ جب کوئی تماشائی آتا دکھائی دیتا تو دونوں اپنے اپنے کٹہروں میں چلے جاتے۔

ایسے ہی ایک روز جب شام ہو چلی تھی، تماشائیوں کے لیے گھنٹی بجا کر چڑیا گھر بند ہونے کا اعلان کیا جا چکا تھا اور دور دور تک کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا، نورا کچھار کے راستے شیر کے کٹہرے میں آ گھسا اور اسے دبوچ لیا۔ وہ دھاڑتے ہوئے پلٹا لیکن نورا یوں بھی بڑا جاندار تھا۔ اس نے نورے کو دیکھ کر کہا۔

''نورے، یہ کیا بدتمیزی ہے، الگ ہٹو۔''

''ارے بابو کیسے شیر ہو، ایک ریچھ کو نہیں پچھاڑ سکتے۔''

''اب ڈیوٹی کا وقت ختم ہو رہا ہے نورے، الگ ہٹو میں شیر ور نہیں ہوں۔''

''کیا بات کرتے ہو بابو، ذرا سا طاقت لگاؤ، جھکے جھکے کمر میں در ہونے لگا ہے۔'' نورے نے اسے مزید طاقت سے دبوچ لیا۔

معاً اسے کچھ کھٹکا سا محسوس ہوا۔ غالباً کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔

''نورے جلدی ہٹو، نورے ابے کیوں اپنی اور میری نوکری کے پیچھے پڑا ہے، دیکھ کوئی اِدھر ہی آ رہا ہے۔''

نورا جلدی سے الگ ہٹا اور تیزی سے کچھار کے راستے اپنے کٹہرے میں پہنچ گیا۔

اس نے ایک دھاڑ لگائی اور چاروں ہاتھ پاؤں کے بل تیزی سے پنجرے میں گردش کرنے لگا۔

- بقیہ -

یہ گھنٹہ گھر

ادارے بھی اپنی نوعیت کی دُکانیں ہیں جہاں خریدار آپ کی خدمات خریدتا ہے اور آپ اس وقت اور خدمت دینے کے پابند مگر یہاں رویہ اس کے بالکل برعکس پایا۔

لاہور سے بچھڑنے کا غم بھی مندمل ہو گیا۔ پیا دیس میں اپنا آشیانہ جس کو اَب آ کے خود بنانے سنوارنے کا موقع ملا تو یہ انگنا بھی بڑا پیارا عزیز لگنے لگا مگر نہ ہوئی دوستی تو اس شہر سے اور اس کے ''گھنٹہ گھروں'' سے اِک تفاوت اجنبیت فاصلہ وعداوت ہی رہی۔ اپنا ننھیالی و ددھیالی بلکہ سسرالی اور آبائی شہر ہونے کے باوجود اسی مٹی میں میرے اپنے وجود کے دو محترم و معتبر حصے ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اِن تمام تر حقائق کے باوجود جانے کیوں مانوسیت کی طوفانی لپٹیں مجھے اپنی اور نہیں بلاتی تھیں آخر ایسا کونسا منہ بند تالا لگا تھا جو کھلنے کا نام نہیں لیتا تھا؟ میں نے حسرت سے سوچا شاید میں کبھی اس راز کو کھوج پاؤں۔

بچے اب بڑے ہو رہے تھے اور اپنی ذات کے مسائل تو پسِ پُشت چلے گئے تھے شہر کے حالات گو اب وہ گزشتہ بیس برس پیشتر والے تو نہ تھے فیصل آباد نے کافی ترقی کر لی تھی مگر تعلیمی اداروں سے ہم دونوں ہی مطمئن نہ تھے اور اکثر سوچتے یا کوئی مستقبل کا خاکہ ترتیب دیتے کہ بچوں کو فی الحال لاہور بھیج دیا جائے اور ابتدائی تعلیم کے بعد دیکھا جائے کہ مزید آگے پڑھنے باہر جانے کی کوئی صورت بنتی ہے یا نہیں؟ مگر لاہور نوعمر بچوں کو تنہا بھیجنا بھی تو ممکن نہ تھا اور بھلا سارے کاروبار کو سمیٹ لپیٹ کر ہم کیسے جا سکتے تھے اور کوئی درمیانی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔

اُس دِن میرے شوہر جب گھر آئے تو انداز بڑا پُر جوش، چہرہ خوشی سے تمتما تا ہُوا ہاتھ میں کچھ عدالتی کاغذات تھے۔ میں نے استفسارانہ نظروں سے پوچھا تو شوخی سے بولے ''بوجھو تو جانیں'' میں ہنس پڑی اور بولی: ''اچھا! میں ہاری اب بتایئے'' کاغذ میرے ہاتھ میں دے کر بولے: ''لو پھر خود ہی دیکھ لو مبارک ہو تمہیں لاہور میں ایک چھوٹا سا فلیٹ لے دیا ہے تم بچوں کے ساتھ اُدھر شفٹ کر جانا تا کہ اُن کو اپنے خوابوں کے مطابق تعلیم دلوا سکو میں ہفتے میں دو تین دن اِدھر اور کچھ دِن اُدھر پھر آہستہ آہستہ بزنس کو بھی اُدھر شفٹ کرنے کی کوشش کریں گے وہ تو اور بھی نہ جانے کیا کہہ رہے تھے مجھے اندرونی طور پر اِک جھٹکا سا لگا، زندگی کے بیس سال کچھ کم تو نہیں ہوتے وہ سال یوں آنکھوں میں گھوم گئے۔ مجھے لگا کہ مانوسیت و محبت کی اِک طوفانی سی لہر مجھے سرتا پیر شرابور و سرشار کر گئی بچھڑنے کے غم نے تالا کھول دیا تھا کھوج لگ گئی تھی!

میں نے حیرت سے اپنے من بھیتر جھانکا تو مجھے لگا کہ میرے اپنے اندر اِک چھوٹا سا لال گلابی گھنٹہ گھر اُگ آیا ہے۔ سر پر امرود کی سبز ٹہنی سجائے شرماتا لجاتا، محبت کی علامت بنا میں نے اِک نیا گھنٹہ گھر کھوجا تھا جو اوّل کی ضد تھا۔ مجھے لگا کہ سفر رائیگاں نہیں گیا میں نے جو پیڑ محبت سے لگایا تھا وہ شجر ہرا بھرا ہو کر سایہ وگل دینے کے قابل ہو گیا تھا!۔

یاد کے بے نشان جزیرے

رخشندہ روحی
(دہلی)

شکیب کی سالانہ چھٹیوں کے انبار میں سے چند دن بچوں کے اصرار پر نکل ہی آئے۔

ہماری شادی کی پچیسویں سالگرہ دو دن بعد ہے۔بچوں کو سالگرہ سے نہ معلوم کیوں اتنی خوشی ہوتی ہے کہ انکا بس چلے تو گارڈن میں لگے پیڑ پودوں کی بھی سالگرہ جوش وخروش سے منا لیں۔بچوں نے گلے میں جھول کر......رونی صورت بنا کر......گولڈن جبلی سے پہلے کہیں نہ ساتھ چلنے کے پختہ وعدے کے ساتھ شکیب یعنی اپنے پاپا سے دارجلنگ کی ای بکنگ کے لئے کریڈٹ کارڈ کا نمبر اگلوا ہی لیا۔بھلا ہو'ای ٹکٹ' کی آسانی کا کہ گھر بیٹھے دلی سے دارجلنگ کے ٹکٹ منٹوں میں بک ہو گئے۔بچے شکیب کو اپنے پروگرام کی تفصیلات ایک سے بڑھ کر ایک پرزور پرشور آوازوں سے بیان کرنے لگے۔

فیض کے کلام سے انکی نظر ہٹے تو کچھ وہ سمجھ پاتے۔شکیب کو کتابوں سے اتنی رغبت ہے کہ انہیں کھانا پینا تو کجا سونا بھی یاد دلانا پڑتا ہے۔

اس بڑے شہر میں اتنی آپا دھاپی میں دن بھاگتے رہتے ہیں کہ کچھ کام ہمیشہ ملتوی کئے جاتے ہیں۔کوئی لمبی چھٹی آئے تو انہیں کیا جائے۔مگر وہ لمبی چھٹی ......اچانک اتنی تنگ ہو جاتی ہے جہاں سے کوئی گنجائش کوئی ناپ تول ان کاموں کو مکمل نہیں کر پاتے۔

کپڑوں کی،سوکھے ناشتے اور کھیل کی لسٹ تو آناً فاناً تیار ہوئی اور اس پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا۔شکیب نے بچوں کی سکڑتی ناکوں کی پرواہ کئے بغیر اپنی لحیم شحیم کتابیں ہینڈ بیگ میں بھر لیں۔ٹیکسی راتوں رات فون پر آ کر دروازے کی گھنٹی بجانے لگی۔

صبح سویرے کی خراماں ہوا کا مزا لینے کا خیال بالکل بے جا ہے۔بچوں کی ناکیں اور سکڑ کر کہیں چہرے سے الگ نہ ہو جائیں۔اسلئے دم مار کرائے سی کی خنکی سے ہی کار کے سیاہی مائل شیشوں سے شفق کی گلابی سے سرخ ہوتی لجائی سی رنگینی کو اپنے دل میں بھرتی رہی۔

''مما......اسٹیشن۔''احمر میرا بیٹا میرا کندھا ہلا رہا تھا۔

میں نے زیادہ سے زیادہ سامان اٹھایا اور ٹیکسی کے باہر نکل گئی۔

کبھی نہ سمجھ میں آنے والا اعلان سنا۔آج بھی کچھ نہ سمجھی۔میں ہی نہیں وہاں موجود ہر فرد ایک دوسرے کا سوالیہ نشان کی طرح ٹیڑھا منہ دیکھ کر سمجھ گیا کہ کوئی کچھ نہ سمجھا۔لیکن سب سمجھنے کی اداکاری کرتے رہے۔قلی سے معلوم ہوا کہ ہماری ٹرین ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہے......رات اپنے آخری پہر کی سیاہی کو صبح کی نارنجی چادر میں لپیٹنے لگی......احمر اور نائمہ کولڈ کافی کی لذت اپنے ہونٹوں میں دبائے کانوں میں آئی پوڈ کی لہروں سے آنکھوں کو مچا رہے تھے۔

میں گرم چائے کے کلہڑ میں اپنی کھوئی مٹی کی مہک میں گم......مسافروں کی آنکھوں میں لاتعلقی اور بے حسی کے سائے دیکھ رہی تھی۔۔کتنا اجنبی ہے یہ دور!!!

ٹرین کی آمد نے اسٹیشن کا دل دہلا دیا۔یہ ہماری منزل کو جانے والی ٹرین نہ تھی......ٹرین کی حرکت دھیمی پڑ گئی......ٹرین کے ادھ کھلے دروازے پر ایک دوسرے سے طاقت کا مظاہرہ خوب رہا......اترنے والے مسافر چیخ و پکار کرتے رہے......چڑھنے والے ان پر بھاری پڑے اور پیروں کا قیمہ بنا کر فاتحانہ چہروں کے ساتھ اپنے سامان کو کھڑکیوں سے کمپارٹمنٹ کے اندر پھینکنے لگے۔

''پکڑو......پکڑو......'' ایک شور اٹھا......ایک آدمی سامنے والے پلیٹ فارم سے کودا اور......ٹرین کی پٹریوں پر بھاگنے لگا۔۔ٹرین میں ٹھنسے تمام چہرے حرکت میں آ گئے۔پولس کے جوان معاملے کی تفتیش میں ٹرین کی پٹری کی طرف ٹہلنے لگے......شکیب کتاب بیگ پر ڈال کر دوڑ گئے......انکے پیچھے کئی اور لوگ......ٹرین بے حد سستی سے رک گئی......

ٹرین کی پٹری پر......ایک لمبا دبلا وحشی نوجوان جس کے بکھرے بال چہرے کو ڈھکے ہوئے تھے۔کئی ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑا کھڑا تھا۔پولس اب سمجھ گئی کہ کوئی آتنکوادی کسی شر پسندی کے ارادے سے ٹرین کی پٹری پر اتر پڑا ہے......اسکو گھسیٹ کر پلیٹ فارم پر لایا جا چکا تھا۔میں نے ادھوری چائے کا کلہڑ ڈسٹ بن میں زور سے دے مارا۔غصہ پولس کی حرکت پر تھا اور کلہڑ بے چارہ اپنی جان سے گیا ساتھ میں چائے بھی۔احمر اور نائمہ اپنے آئی پوڈ کے ہیڈ فون اپنے ہاتھوں میں لئے کافی ناخوش لگ رہے تھے۔انکے گانے یا پھر فلموں کے سین ڈسٹرب ہو گئے تھے۔

میں نے اشارہ سے دونوں سے کہا کہ میں وہاں جا رہی ہوں۔احمر نے مجھے روکنا چاہا اور نائمہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا......''مما پلیز!پولس کیس ہے''

میں نے گرم نظروں سے اسے دیکھا اور میں اپنا ہاتھ دھیرے سے چھڑا کر اسی طرف چل پڑی جہاں اب کافی بڑی بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔

پولس اسکو ایسے دبوچے تھی کہ جیسے مرغ کو ذبح کیا جانے کے لئے اسکے پروں کو مروڑ کر ایک دوسرے میں اٹکا دیا گیا ہو۔اس کا چہرہ اب بھی کالے سفید الجھے ہوئے بدرنگ بالوں میں چھپا تھا۔وائرلیس پر مزید پولس اور تفتیشی اہلکار بلائے جا رہے تھے۔وہ بالکل آرام سے سیدھا کھڑا تھا۔شکیب بھیڑ کے اندر اور میں بھیڑ کے گھیرے میں گھسنے کی کوشش کر رہی تھی......کہ ایک پولس والے نے اسکے بے ترتیب بالوں کو اپنے ڈنڈے سے ہٹا دیا۔اسی نوچ کھسوٹ میں اسکے چہرے کی گوری سفید جلد کئی جگہ سے ادھڑ گئی۔میں بھیڑ میں شکیب کے قریب جا کھڑی ہوئی۔شکیب نے مجھے دیکھا اور پھر مجھے اپنی بانہہ کے حصار میں لے لیا۔ایک

بڑاافسر بھیانک سائرن کو بجا کر بھیڑ میں اپنے لئے ایک راہ داری بناتا ہوا اسکے پاس کھڑا ہوگیا۔اسے دونوں توندوالوں نے ایڑی بجا کر سیلوٹ مارا......اوراس آتنک وادی کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ بڑے افسر نے اسکے گرہ گیر بالوں کی جھولتی لٹوں کوسمیٹ کر اسکی گردن پرڈال دیا۔اسکے چہرے پراپنی چوڑی ہتھیلی سے بھرپور وار کیا.....'سڑاک' کی آواز پر مجمع میں ایک سسکی ابھری اوراسی پل خوف سے دم توڑگئی۔مگروہ ہلے جلے بغیراپنی جگہ پر کھڑارہا......

''ہاتھ آگے کر'' مضبوط مکا اسکی کمر پر پڑا......اسکی ٹانگیں لڑکھڑائیں ۔اسنے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔بھیڑ کا گھیرا تنگ ہونے سے وہ ہمارے کافی قریب آگیا......اسنے صرف میری طرف دیکھا......اوردوڑ کرمیرے پاس آنے لگا...... پولس آفیسر اسکے پیچھے بھاگا......وہ بالکل میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا......میں شکیب کی کمرسے لگ گئی.....شکیب نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی کمر کی طرف کر کے مجھے باندھتے ہوئے جکڑ لئے۔میرے ہاتھ میں پانی کی بوتل کانپنے لگی۔وہ شکیب کے سامنے آکررک گیا......

''آپ مجھ سے ڈریئے نہیں......میری باجی!میرے دل میں جو خیال تھا اسے میں اب بھلا چکا ہوں......میرے سامنے آیئے......مجھ سے چھپئے نہیں......حناباجی!!''

شکیب نے مجھے اورزور سے کس لیا......وہ شکیب کے داہنی طرف کھڑا ہوگیا۔میری آنکھیں پھٹ کرڈیلے باہرابلنے کو تیار تھے......

''میں آپکو کچھ نہیں کہونگا......میری باجی......حناباجی......'' شکیب نے میرے ہاتھ سے پانی کی بوتل لیکر کہا۔''پانی پیوگے''

وہ ملتجی نظروں سے شکیب کو دیکھ کر بولا''ہاں۔ان سے کہو مجھے پانی پلا دیں......میری باجی ہیں نہ یہ......انکے ہاتھ سے پیونگا۔'' پولس سکتے میں کھڑی تھی۔شکیب نے مجھے سنبھال کراسکے سامنے کردیا۔بوتل میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔میں لکڑی کے ڈانواڈول لکشمن جھولے پر کھڑی تھی۔شکیب نے میرا کانپتا ہاتھ تھام لیا۔وہ چلاّیا......''میں کچھ نہیں کہونگا......مجھ سے ڈریئے مت''شکیب نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔مجھے کوئی غیبی طاقت اسکی طرف بہائے لے گئی۔میں نے پانی کی بوتل اسکی طرف بڑھا دی۔وہ گھٹنوں کے بل میرے سامنے جھک گیا۔اسنے اپنے ہاتھوں کا کشکول بنا دیا......اسکی سفید ہتھیلیوں پر سرخ وعنابی ابھری ہوئی بدھیاں میرامنہ حسرت سے تاک رہی تھیں۔میں نے پانی کی دھار اسکی دکھتی ہتھیلیوں پر ٹپکادی۔وہ جنم جنم کی پیاس آج بجھا رہا تھا......

......میرے گھر کے صدر دروازے سے تین گھر چھوڑ کر اسکا گھر تھا۔ہمارے قصبے کے جانے مانے روحانی طبیب کا پوتا۔خضر!

......تلے اوپر چھ بچوں کے بعد بچا تھاوہ۔دیسی گھی کی گرم بالوشاہیاں حلوائی بڑے کڑھاؤ سے اتار رہا تھا اورخدام پورے محلے میں خوشی بانٹ رہے تھے۔میں امی کے ساتھ ننھے نازک سے منے کودیکھنے گئی تھی۔میں دوسال کی تھی امی کہتی تھیں کہ میں نے رورو کر کہا تھا کہ امی منے کوگھرلے چلیں۔یا مجھے دوسرا منالادیں۔اورخدانے میری دعا قبول کی۔ایک سال کے اندر میرا چھوٹا بھائی آگیا۔میں اسمیں ایسی کھوئی کہ اس ننھے نازک منے کوبھول گئی۔۔

وہ بے حد بیماررہنے لگا اورتقریباً سات سال میں چلنا سیکھا۔بولنا دس سال میں شروع کیا۔مگرسمجھنا......کبھی نہیں۔گھر میں بند رہنے سے سالوں کسی نے اسے نہ دیکھا......اسی غم میں اسکے ابو اسکو امی کی ذِمہ داری بنا کر بھیگی آنکھوں کو خاموشی سے بند کرگئے......خضر بیس سال کا ہوگیا......اور جب جب میرے گھر آیا......مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار علی الاعلان کرتا رہا۔میں ہنستی تو وہ خاموشی سے سر جھکائے چلا جاتا۔میری شادی کے بعد جب بھی آیا امی سے میرے آنے کا وقت پوچھتا۔کبھی صحیح اوراکثر غلط وقت بتا کر امی اسے ٹال دیا کرتیں......کئی بارشکیب کے سامنے آیا اوردوتین بار بچوں کے سامنے بھی۔مگر کہا کچھ نہیں......اورایک دن اسکی امی بھی نہ رہیں۔وہ گھر سے بھاگ گیا......اورآج اس طرح......

......پانی کی بوتل میں ایک گھونٹ پانی بچا......اسنے مجھے دیکھا......اسکے چہرے کی تڑخی ہوئی جلد میں سیرابی کی نمی چمکی......آنکھوں کی وحشت زدہ پیاس ملائم ہوگئی......بالوں کی گرہوں کی الجھن میں لچک پیدا ہوئی......طلوع ہوتے سورج کی نوخیز کرن اسکی ویران نگاہوں میں جگمگائی...... مجھے دیکھتے دیکھتے......اسنے میرے ہاتھ سے بوتل چھین لی......اور......پوری قوت سے میری مخالف سمت دوڑ گیا......میں اسکی پشت پر بھیڑ کو بھاگتے دیکھتی رہی......

وہ رینگتی ٹرین میں چڑھ گیا......ٹرین نے رفتار پکڑلی

''کرپیادھیان دیجئے......''میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی......

میرے دونوں بچے مجھے چمٹے کھڑے تھے......شکیب میری آنکھوں میں پیار اور اطمینان سے دیکھ رہے تھے۔سورج کی سنہری کرنیں پھیل چکی تھیں......

شاید ہماری ٹرین کے آنے کا اعلان ہورہا تھا...... مجھے ہمیشہ کی طرح کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اناؤنسر نے کیا کہا......

غلامی کے اسیر

چلتے ہیں دبے پاؤں کوئی جاگ نہ جائے
غلامی کے اسیروں کی یہی خاص ادا ہے
ہوتی نہیں جو قوم۔۔۔حق بات پہ یکجا
اُس قوم کا حاکم ہی بس اُن کی سزا ہے

فیض احمد فیض

'' قلبِ داغ دار ''

شکیب جلالی

(یکم اکتوبر۱۹۳۴ءتا۱۲۔نومبر۱۹۶۶ء)

سبھی نے عید منائی مرے گلستاں میں
کسی نے پھول پروئے کسی نے خار چنے

بنامِ اذنِ تکلم بنامِ جبرِ سکوت
کسی نے ہونٹ چبائے کسی نے گیت بُنے

بڑے غضب کا گلستاں میں جشنِ عید ہوا
کہیں تو بجلیاں کوندیں کہیں چنار جلے

کہیں کہیں کوئی فانوس بھی نظر آیا
بطورِ خاص مگر قلبِ داغ دار جلے

عجب تھی عیدِ خمستاں عجب تھا رنگِ نشاط
کسی نے بادہ وساغر کسی نے اشک پیے

کسی نے اطلس وکمخواب کی قبا پہنی
کسی نے چاک گریباں کسی نے زخم سیے

ہمارے ذوقِ نظارہ کو عید کے دن بھی
کہیں پہ سای؟ ظلمت کہیں پہ نور ملا

کسی نے دیدہ ودل کے کنول کھلے پائے
کسی کو ساغرِ احساس چکنا چور ملا

بہ فیضِ عید بھی پیدا ہوئی نہ یک رنگی
کوئی ملول کوئی غم سے بے نیاز رہا

بڑا غضب ہے خداوندِ کوثر وتسنیم
کہ روزِ عید بھی طبقوں کا امتیاز رہا

○

انور مسعود

(اسلام آباد)

بیادِ صدّیقہ

دل میں ہے اُس کی یاد کی خوشبو بسی ہوئی
کیا پھول تھا کہ شاخِ زماں سے اُتر گیا!

لگتا ہے یوں کہ چند مہینوں کی بات تھی
پچپن برس کا عہدِ رفاقت گزر گیا

دنیا رواں دواں ہے اگرچہ اُسی طرح
دل میں مُفارقت کا وہ لمحہ ٹھہر گیا

قُرآں سے اُس کو تھی وہ محبّت کہ بالیقیں
اُس کا جو آخرت کا سفر تھا سنور گیا

انوؔر نے جس گھڑی بھی صدیقہ کے واسطے
دستِ دعا اُٹھایا تو اَشکوں سے بھر گیا

○

یونس شرر
(نیویارک)

محبت آج دنیا میں زلیخائی نہیں ہوتی
جہاں میں دامن یوسف کی رسوائی نہیں

رفو گر تو ستمگر ہے اسے اب کون پہچانے
رگ جاں گر بکھر جائے تو ترپائی نہیں ہوتی

یہ چہرے دوغلے چہرے بھرم رکھ ہی نہیں پاتے
زمانہ ساز چہروں پہ تو رعنائی نہیں ہوتی

کفن بردوش لاشہ میں لئے پھرتا ہوں سڑکوں پر
مکانوں میں یہاں دوگز بھی انگنائی نہیں ہوتی

غریبی انتقاماً سرکشی اختیار کرتی ہے
خدائی میں جب ان کی کوئی سنوائی نہیں ہوتی

یہ دامن دھجیاں بن کر ہواوں سے الجھتا ہے
شریک جاں بچھڑ جائے تو بھر پائی نہیں ہوتی

یہ کیوں معصوم لوگوں کو غلط رستہ دکھاتے ہیں
سڑک کے ساتھ پگڈنڈی تو بل کھائی نہیں ہوتی

❍

غالب عرفان
(کراچی)

تاریکی سے روشن ہے سفر کچھ اس پہ نظر ہے یا کہ نہیں
سایہ سایہ، منزل منزل، اک دھوپ مگر ہے یا کہ نہیں

اک وبا گھروں تک آ پہنچی سناٹا ڈستا ہے ہر پل
انسان مریں بے گور و کفن اک حشر دگر ہے یا کہ نہیں

مقتول وہی قاتل بھی وہی اور جسم لہو سے تر ہے تو پھر
سینے میں غم کا بوجھ لئے دل پر پتھر ہے یا کہ نہیں

عکّاس مری آنکھیں ہیں یا آئینہ گری مری فطرت ہے
تہذیب کے تاریخی منظر پر میری نظر ہے یا کہ نہیں

کاغذ کے نوٹوں کی قیمت ہے آدمی سے برتر تو یہاں
شہرت کا تحفہ لے کر وہ دستار بسر ہے یا کہ نہیں

دھواں دھواں بادل سر پر دن کیسا رات کہاں اُتری
رکھوالا گھر سے غائب کیوں؟ وہ شہر بدر ہے یا کہ نہیں

اک جھوٹ کے آگے سوچ ہیں جو سامنے تھا اک دھوکا تھا
جو دیکھ رہا ہوں وہ سب کچھ عرفانِ نظر ہے یا کہ نہیں!

❍

اختر شاہجہاں پوری
(بھارت)

دل و جاں ہیں ابھی شاداب میرے
سنہرے اس لیے ہیں خواب میرے

پکارو مجھ کو میرے نام سے ہی
نہیں شایانِ شاں القاب میرے

مناؤں کس طرح میں جشنِ گریہ
ابھی مغموم ہیں احباب میرے

ملے گا کیا تمہیں لطفِ عبارت
اگر بدلے گئے اعراب میرے

ابھی تارِ نفس ٹوٹا نہیں ہے
شکستہ ہو گئے مضراب میرے

مرے دامن پہ بھی رنگینیاں ہوں
چھلک اے دیدۂ خوںناب میرے

میں اپنے زخم گن لیتا ہوں اختؔر
چلے جاتے ہیں جب احباب میرے

○

محمود شام
(کراچی)

خوبروئی تری غلط فہمی
پارسائی مری غلط فہمی

ہم تو پیدائشی فرشتے ہیں
عمر بھر ہی رہی غلط فہمی

جتنی خونریزیاں ہوئیں اب تک
سب کی بنیاد تھی غلط فہمی

صرف اک موت ہی حقیقت ہے
زیست انسان کی غلط فہمی

جھوٹ سمجھے سبھی صداقت کو
سب کو سچی لگی غلط فہمی

سارے دعوے مہارتوں کے عبث
ہمہ دانی نری غلط فہمی

عاشقی میں ہیں مرحلے دو ہی
کبھی حیرت، کبھی غلط فہمی

کھول دیتی ہے در غلامی کا
حاکم وقت کی غلط فہمی

○

حمیرا رحمٰن
(نیویارک)

عمداً نا شناس تھے سب لوگ
عید پر بھی اداس تھے سب لوگ

زندگی جیسی اک کہانی میں
مختصر اقتباس تھے سب لوگ

کوئی آسیب کھا گیا تھا انہیں
اور قرینِ قیاس تھے سب لوگ

وقت کی گردشوں سے لپٹے ہوئے
کس قدر بدحواس تھے سب لوگ

باڑھ آئی تو دور ہوتے گئے
عمر بھر آس پاس تھے سب لوگ

رک گئیں دھڑکنیں تو حیرت کیا
زیرِ خوف و ہراس تھے سب لوگ

آزمائش کے سرد خانے میں
بے کفن بے لباس تھے سب لوگ

چند ہی دن حمیؔرا پہلے تک
اپنے ہونے کی آس تھے سب لوگ

○

نسیم سحر
(راولپنڈی)

اپنی دانائیوں کے بیچ رہا
جھوٹ سچائیوں کے بیچ رہا

رونقِ انجمن بھی تھا مَیں ہی
مَیں ہی تنہائیوں کے بیچ رہا

قتل ہوتا رہا بہر لحظہ
مَیں سدا بھائیوں کے بیچ رہا

ہوشمندوں سے تھا گریز اسے
عشق سودائیوں کے بیچ رہا

گوشۂ عافیت تھا اُس کے لیے
جہل دانائیوں کے بیچ رہا

نشہ طاری تھا فتح مندی کا
خوش وہ پسپائیوں کے بیچ رہا

اپنی فطرت بدل نہیں پایا
خار، رعنائیوں کے بیچ رہا

ہائے مفہوم، جو ادا نہ ہوا
اپنی گہرائیوں کے بیچ رہا

اِس تماشے کا جو مداری تھا
وہ تماشائیوں کے بیچ رہا

سطح پر آ نہیں سکا مفہوم
اپنی گہرائیوں کے بیچ رہا

قابلِ دید تھی شکست مری
اپنی پسپائیوں کے بیچ رہا

○

اشفاق احمد

(اوسلو)

شعر میں اپنے شب و روز بتاتا چلوں میں
یعنی میں جو ہوں، وہ سب کونظر آتا چلوں میں

اتفاقاً اِدھر آنکلا تو سوچا میں نے
بزمِ رفتہ کی اُسے یاد دلاتا چلوں میں

لَوٹ کر میں نہ سہی اور کوئی آئے گا
اپنے رستے میں نئے پیڑ لگاتا چلوں میں

انہی ٹوٹے ہوئے رشتوں کے جزیروں میں کہیں
ایک دیوارِ تعلق کو اٹھاتا چلوں میں

جانے کل اُس سے ملاقات مری ہو کہ نہ ہو
آج کچھ اُس کو نئے شعر سناتا چلوں میں

میں نے اُن آنکھوں میں اپنے لیے کچھ دیکھا ہے
کیوں نہ اِس راز کوخود سے بھی چھپاتا چلوں میں

کسی کمزور سے لمحے میں جو تخلیق کیا
اپنی عظمت کا وہ بت خود ہی گراتا چلوں میں

لوگ مفہوم ہی الٹا نہ سمجھ لیں اشفاق
اپنے اشعار پہ اعراب لگاتا چلوں میں

○

انیس اشفاق

(لکھنؤ)

وہ دن ہیں کہ ہر کوچۂ دلدار ہے ویراں
گلیوں میں ہے سنّاٹا تو بازار ہے ویراں

اب کس سے کریں جنگ کہاں تیغ اٹھائیں
غائب ہیں صفیں عرصۂ پیکار ہے ویراں

ہے دھوپ مگر چھاؤں میں رکتے نہیں رہرو
وہ ڈر ہے کہ ہر سایۂ اشجار ہے ویراں

دو ایک پرندے کبھی آ جائیں تو آ جائیں
ورنہ تو مرے گھر کی یہ دیوار ہے ویراں

منظر تو ہیں موجود پہ ٹھہرے ہوئے منظر
وادی ہے یہ خاموش وہ کہسار ہے ویراں

کیا طشت میں تیرے میں گہر اپنے سجاؤں
امروز مرا دیدۂ دُربار ہے ویراں

حرفوں کا ہے میلہ نہ مضامین کا مجمع
ویراں ہے مرا قریۂ افکار ہے ویراں

پڑھتے نہیں پھولوں کا سبق باغ میں طائر
ہر مدرسۂ گل سرِ اشجار ہے ویراں

ہر رہگزرِ دعوتِ پیکار ہے سونی
ہر قتل گہِ تیغِ ستمگار ہے ویراں

سجدوں کے لیے عشق کہاں جائے کدھر جائے
اس شہر میں اب حسن کی سرکار ہے ویراں

پُر پیچ جو رستے ہیں نہیں اُن کا مجھے دکھ
غم یہ ہے کہ ہر جادۂ ہموار ہے ویراں

اب رخش کوئی رَو میں دکھائی نہیں دیتا
ہر دشت میں جولاں گہِ رہوار ہے ویراں

○

آفتاب مضطر
(کراچی)

یہ یوں حساب سے چلائے کون نظمِ کائنات
کہ حکم جیسے صاف صاف گھول کر پلا دیا

لگے بندھے معینہ جو چل رہے ہیں روز و شب
کھلونا مثل چابی بھر، یہ کس نے یوں چلا دیا

یہ برف برف تودگی یہ آب کس نے کی فریز
برودتی کو کس نے پھر یہ بھاپ سا اُڑا دیا

یہ کون اس سے پوچھ پائے، پہیلی کون بوجھ پائے
جو گردشِ روَان کو گھما دیا، گھُما دیا

یہ کس نے جسم عیسوی کو زندہ دے کے دفعتی
زوال کو کمال کر، کمال کو جھکا دیا

ہے کس کی مقدرت بتاؤ، ہے کس کی طاقتی بتاؤ!
معاً یہ کس نے گلستان آگ میں کھلا دیا

سکھائی کس نے ایڑیاں رگڑنے کی سلیقگی
یہ کس نے عینِ زمزمی، عطش میں جا ملا دیا

یہ کس کی مدحتی ضیا قلم سے پھوٹ جگمگائی
یہ کس نے مضطر آفتابی صفحہ جگمگا دیا

○

خورشید طلب
(جھارکنڈ)

شہرِ وجدان سے نہیں جاتے
تم مِرے دھیان سے نہیں جاتے

حق پسندی شعار تھی ورنہ
اس طرح جان سے نہیں جاتے

آئنے ریزہ ریزہ ہو کر بھی
اپنی پہچان سے نہیں جاتے

کان تک جو پہنچ نہیں پاتے
شور وہ کان سے نہیں جاتے

زور کا قہقہہ لگا پگلے
درد مسکان سے نہیں جاتے

جتنے بھی تنگ دست ہوں عشاق
عہد و پیمان سے نہیں جاتے

دکھ کے ماحول میں بھی کچھ احباب
لعن اور طعن سے نہیں جاتے

کھیل تو ختم ہو چکا ہے طالبؔ
آپ میدان سے نہیں جاتے

○

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

کسی کی یاد میں سب کچھ بھلائے بیٹھے ہیں
ہیں دور ہم سے مگر دل میں آئے بیٹھے ہیں

دل و دماغ کے گوشوں میں جھانک کر دیکھا
یہ جانا میں نے وہاں پھر بھی چھائے بیٹھے ہیں

یہ کشمکش ہی چلاتی ہے کارواں اُن کا
وفا کی راہ میں جو دل لگائے بیٹھے ہیں

وفا کے نام پہ عبرت بنے ہیں ڈھیروں لوگ
ہزاروں پھر بھی یہی غم لگائے بیٹھے ہیں

ہمیشہ ساتھ ہی چلنے کا عہد تھا اُن کا
ذرا چلے بھی تھے اب دور جا کے بیٹھے ہیں

زمانہ کچھ بھی کہے اب تو حالِ دل ہے یہی
انہی کی یاد کو دل سے لگائے بیٹھے ہیں

وفا تو ختم ہوئی اب جفا کا عالم ہے
وبا کے خوف سے سب جاں چھپائے بیٹھے ہیں

ریاضؔ کیسے بتاؤں، مگر حقیقت ہے
وہ ساتھ چھوڑ کے اب سر جھکائے بیٹھے ہیں

○

فہیم جوگاپوری

(بہار)

اجالوں کے سمندر میں اندھیرا ہونے والا ہے
تماشا دیکھ کر جانا تماشا ہونے والا ہے

نظر رہتے ہوئے سب بے نظر ہو جائیں گے اک دن
بہت جلدی ہمارا شہر اندھا ہونے والا ہے

کہانی کے سبھی کردار میرے دیکھے بھالے ہیں
مجھے معلوم ہے دربار میں کیا ہونے والا ہے

مبارک باد لینے کے لیے تیار ہو جاؤ
تمہارے زہر سے بیمار اچھا ہونے والا ہے

سرِ میخانہ ساقی کے ہنر کی آزمائش ہے
صراحی سے بڑا پیالہ ہمارا ہونے والا ہے

نئے چشمے ابلنے کی بشارت دے رہے ہیں ہم
ہماری ٹھوکروں کے نام دریا ہونے والا ہے

زمانے کی نظر خیرہ نہ ہو جائے تو کہہ دینا
فہیم اک روز وہ روشن ستارہ ہونے والا ہے

○

پونا گرام

(تامل سے ترجمہ)

شہلانقوی (نیویارک)

کیا آپ نے سنہری شہر پونا گرام کا نام سنا ہے۔ یہاں آپ کو کوئی ایسی چیز نہیں ملے گی جو پرانا س کے راویوں کے خواب وخیال سے میل کھائے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ پرانے کرموں کے ثواب مل جاتے ہیں اور یہاں لوگ اسی فلسفے کی ڈور تھام کر اپنے آپ کو سکون دیتے ہیں۔ خیر کچھ انسانوں کا کام شہد کی مکھیوں کی طرح دنیا پر حکومت کرنے والے چند لوگوں کے لیے منافع کمانا ہوتا ہے جن کے حق میں یہ واقعی سونے کا شہر ہے۔

ریلوے لائن کے پاس سے جو راستہ گزرتا ہے اسے یہاں کی بڑی سڑک سمجھ لو۔ اس پر بیک وقت چار آدمی چل سکتے ہیں، تا وقتیکہ کوئی گاڑی نہ آجائے۔ اسی راستے سے خرگوشوں کی کھودی سرنگوں کی طرح کئی چھوٹی گلیاں بل کھا کر نکلتی ہیں۔ اس مقدس مقام کی شان تو اس وقت نظر آتی ہے جب بارش کے قطرے شور مچاتے ہیں اور پورا راستہ کیچڑ بھرے گڈھوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

سڑک کے ساتھ ساتھ میونسپلٹی کی گنگا بہہ رہی ہے، یا شاید اسے جمنا کہنا بہتر ہے چونکہ اسی کو کالا دریا کہا جاتا ہے۔ اس کے ایک طرف لوہے کی سلاخوں کے پار، اونچائی پر بچھی ریل کی پٹریاں ہیں اور دوسری طرف ان کابکوں کی قطاریں جنہیں انسانی رہائش گاہیں سمجھا جاتا ہے۔ پانی کے نل؟ ہاں ہیں۔ ضروری تو نہیں ان میں پانی بھی ہو! بجلی کی روشنی؟ مجھے یاد نہیں پڑتا۔ کیوں کیا تیل کا چراغ جلا لینا کافی نہیں اگر اماوس ہو۔ چاندنی نہ ہو۔

پونا گرام کے بچے مچھلی پکڑنے کا کھیل کھیلتے ہیں۔ لیکن میونسپلٹی کے مقدس پانی میں مچھلیاں کہاں۔ کبھی کبھار کوئی ادھ گلا پھل، باسی پکوڑا یا اسی قسم کی کوئی کھانے کی چیز امیروں کے گھر سے گندے پانی پر تیرتی آجاتی تھی، لیکن بچے اس بات کو بڑوں سے راز ہی رکھتے ہیں۔ بھگوان جانے بچوں کو ریل کی پٹری پر کھیلنے میں کیا لطف آتا ہے۔ لوہے کی باڑ لگی ہوئی ہے لیکن وہ بچے ہی کیا جو اس کو پار نہ کرنے کے قانون کو سمجھ سکیں۔

وہ کوئی گلیکسو کے دودھ اور ملن کے بسکٹوں پر تھوڑا ہی پلے ہیں کہ ان سلاخوں کے درمیان سے نہ گزر سکیں۔ اور اگر وہ اپنی غلطی سے سورگباش ہو جائیں تو ان کے والدین کا کچھ بوجھ ہی کم ہوگا۔ ان بچوں کو تو خاص مزا اس وقت آتا ہے جب لوہے کا کالا انجن چھک چھک کرتا ان کے پاس سے گزرتا ہے اور وہ سب لائن میں کھڑے ہو کر کورس میں ''گڈ مارننگ سر'' کہتے ہیں۔ بس ان کو اتنی ہی انگریزی آتی ہے۔

اس علاقے میں اصل چہل پہل پانچ بجے کے بعد شروع ہوتی ہے جب شراب کی گاڑی آتی ہے اور اپنی نوکریوں سے واپس آکر عورتیں گھر کے کام کرتی ہیں، نل سے پانی بھرتی ہیں۔ ایک مہا بھارت چھڑ جاتی ہے ان عورتوں کے درمیان جن کے بال جوانی میں ہی بدرنگ ہونے لگے ہیں۔ ان کی جوان آنکھیں بھی لوہے کی تو نہ تھیں وہ بھی دن دن بھر مشین کی سوئیوں کو تکتے رہنے سے کمزور ہو گئی ہیں۔

اچھی صحت اور ورزش سے حاصل ہونے والے حسن کا یہاں ذکر بے کار ہے۔ بلکہ صحت کا بھی ذکر نہیں ہونا چاہیے۔ سب جراثیم، زہریلی بیماریاں اور ہیضہ سب یہیں تو پلتے ہیں۔ لیکن جہاں زندہ رہنے کی خواہش ہو وہاں زندگی گھسٹتی ہی رہتی ہے۔ پتھر کے زمانے میں انسان غاروں میں رہتا تھا، شیر چیتوں کے درمیان، وہ اسے شکار کرنے کی کوشش کرتے تھے وہ انھیں مارنے کی۔ لیکن انسان ختم نہ ہوا اس کی نسلیں دنیا میں آتی رہیں۔ زندگی ایک شکار ہی تو ہے۔

گردن میں تین گرہوں کے ساتھ بندھا متبرک کالا دھاگا عورت کی اپنے شوہر سے وفاداری کی علامت ہے لیکن اس علاقے میں اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ یہ ایک الگ دنیا ہے ایا، یہاں کا دھرم اور اطوار بھی مختلف ہیں۔ امالو مل میں مزدوری کرتی ہے۔ وہ بیس بائیس سال کی ہے۔ اس کا شوہر اپنا چھکڑا چلاتا ہے۔ خاندان میں پانچ کھانے والے ہیں۔ امالو اس کا شوہر موروگیسان، اس کی ماں، اس کا بھائی اور اس کا گھوڑا۔ ان کے کھانے اور گھوڑے کے چارے کا انحصار ان میاں بیوی کی آمدنی پر تھا بلکہ گھر کا کرایہ، پولیس والے کا بھتہ اور موروگیسان کے چھوٹے بھائی کا چھپ کر گانجا پینا سب ان دونوں کی آمدنی پر منحصر تھا۔ وہ سب ہی کبھی کبھار پیتے تھے۔ اس کے علاوہ مندی کے زمانے میں بھوک کو کیسے سہاریں۔ بھوک ایا بھوک۔ ایا تم یہ گیت گا سکتی ہو ''بھوک میں سب کچھ اڑ جاتا ہے'' لیکن یہ الفاظ تمہارے دل کو نہیں چھوتے۔ اگر تم صرف ایک دن کے لیے ان لوگوں کی جگہ ہوتیں تو یہ لفظ صرف تمہاری زبان سے نہیں تمہارے خالی معدے سے نکلتے۔

آج مروگیسان بہت موج میں تھا۔ اس نے خود بھی پی اور گھوڑے کو بھی پلائی تھی اور پھر وہ اپنی گھوڑا گاڑی دوڑانے لگا۔ چھکڑا الٹ گیا، اس کا ایکسل ٹوٹ گیا۔ گھوڑا بری طرح زخمی ہو گیا۔ موروگیسان کا جسم زخمی تھا اور کچھ اندرونی چوٹیں بھی تھیں۔ اسے اٹھا کر گھر لائے تو وہ بالکل بیہوش تھا۔ ہوش میں آیا تو بھی شکر ہے نشے میں تھا اور اسے اپنی چوٹوں کے درد کا احساس نہیں تھا۔ امالو جڑی بوٹیاں پیس کر پولٹیس اس کی چوٹوں پر لگا رہی تھی کہ موروگیسان نے بڑبڑا کر دودھ دلیہ مانگا۔ گھر میں پیسہ کہاں۔ امالو کی پگار ملنے میں دو دن تھے۔

امالو پانی بھرنے گئی تو گھپ اندھیرا تھا۔ اصل میں تو چاند رات تھی لیکن اگر چاند بادل کے پیچھے چلا جائے تو میونسپلٹی کا تو قصور نہیں ہے۔ ہمیشہ کی طرح جھگڑے اور گالیوں کے بعد وہ پانی بھر کر گھر کی طرف پلٹی تو گلی کی دیوار سے وہ آدمی لگا کھڑا تھا جو کئی دن سے امالو کو تاڑ رہا تھا۔ وہ دونوں اندھیرے میں کھو گئے اور امالو نے پچھتر روپے کما لیے، اپنے آدمی کو دودھ دلیہ کھلانے کے لیے۔

ایا یہ تم پاکیزگی وغیرہ کے متعلق کیا بولتی رہتی ہو۔ یہ پونا گرام ہے۔ یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے! (پراناس۔ سنسکرت اور تامل میں زندگی بخش سانس)

نیما کی کہانی

رتنا کر متکری

ترجمہ: محمد اسداللہ (ناگپور)

وہ رات اچھی طرح یاد ہے جب مجھے نیما کو وہ تمام باتیں بتانی تھیں۔کس قدر مشکل تھا وہ کام۔کتنے ہی دنوں سے میں اپنے آپ کو سمجھاتا رہا، تیار کرتا رہا، مگر طبیعت آمادہ ہی نہ ہوتی تھی۔

نیما۔۔۔اپنی ماں سے دور ایک بچی۔۔۔

نادان، بھولی اور بڑی پیاری سی بچی۔۔۔کیا اسے باپ سے بھی دور کردیں؟

حقیقت تو یہ ہے کہ اس معاملے میں نیما سے زیادہ برا حال میرا تھا۔ ہم دونوں کا ایک دوسرے کے سوا کوئی نہ تھا۔مگر میری تو مجبوری تھی۔مدھیہ پردیش کے ایک باندھ پر جانا تھا۔تپتا ہوا ریگستانی علاقہ، کہیں کسی ایک مقام پر ٹک کر رہنا نہ تھا، آج یہاں کل وہاں۔اوبڑ کھابڑ راستوں کا سفر، اس نازک سی بچی کے لئے یہ خطرناک تھا۔میں دن بھر اپنے کام پر جاؤں گا، تب اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ سات آٹھ مہینوں کی ہی بات تھی۔اپنے رشتے کی ایک بہن جو مجھ سے عمر میں کچھ بڑی تھی، میں نیما کو اس کے پاس چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔وہ بہت دور ایک گاؤں میں رہتی تھی۔برسوں سے اس سے میری ملاقات نہ ہوئی تھی۔میرے قریب کے لوگوں میں اور کوئی نہ تھا جو نیما کی دیکھ بھال کرتا۔اس رات میں نے یہ سب نیما کو سمجھایا۔

وہ رات اب بھی میرے حافظے میں محفوظ ہے؛ باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی، میں نے بلب بجھا کر چار موم بتیاں جلا رکھی تھیں، مجھے یہ اچھا لگتا تھا۔ میں اس پرسکون روشنی میں اکثر نیما سے باتیں کیا کرتا تھا۔اس رات بھی ہم بیٹھے تھے۔مگر باتوں میں اب وہ لطف نہ تھا، ہنسی نہ تھی۔وہ خاموش تھی۔اپنی گود میں پڑی نیما کی طرح۔وہ دوسری نیما کبھی بولتی نہ تھی۔دونوں آپس میں خوب باتیں کیا کرتے تھے۔اپنا سارا دکھ وہ اس گڑیا کو سناتی، اس کے لئے مٹھائی اٹھا کر رکھتی۔ ایک میری نیما تھی، دوسری نیما کی نیما۔دونوں ہی نیما تھیں۔دونوں ہی بہت سمجھدار! مجھے یاد نہیں کہ نیما نے کبھی کوئی ضد کی ہو، جو کہا جائے اسے وہ بہت جلد سمجھ لیتی۔ اگر اسے کوئی پریشانی ہو تب بھی وہ اسے خاموشی سے برداشت کر لیتی۔اس کی اس سمجھداری پر مجھے بڑا ناز تھا۔

ہوا سے شمع کی لو تھر تھرا رہی تھی۔ہماری پرچھائیاں دیواروں پر لہرا رہی تھیں۔میری باتیں نیما نے سنیں۔رونے چڑنے اور ضد کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔وہ میری بات سے کبھی انکار نہ کرتی تھی۔اس کی اس خاموش رضامندی سے میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔یہ بے زبان مجھ پر کس قدر بھروسہ کئے ہوئے ہے۔ اگر میرا فیصلہ غلط ثابت ہوا تو۔۔۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔وہ کوشش کر رہی تھی کہ وہ چھلک نہ پڑیں۔ جب سے اسے بتایا گیا کہ اچھے بچے روتے نہیں، وہ روتی نہیں تھی۔اس رات میں اس سے اور کچھ نہ کہہ سکا۔نیما سے دور رہنے کے تصور سے میرا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ اس سے باتیں کرنا اب میرے لیے ممکن نہ تھا۔میں نے اسے بستر پر لٹا دیا اور واش روم چلا گیا۔واپسی پر مجھے اس کی آواز سنائی دی۔وہ اپنی نیما سے کہہ رہی تھی۔

''نیما پاپا نے کیا کہا، سمجھ میں آ گیا نا؟ پھوپھی کے پاس رہنا۔انھیں ستانا نہیں۔ان کی ہر بات ماننا۔اور رونا نہیں۔کبھی۔۔نہیں رونا۔'' مجھ سے رہا نہ گیا۔میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

دیدی کے گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔اداس روشنی میں ان کا گھر بے رونق دکھائی دے رہا تھا۔کھڑکیوں سے دھندلی دھندلی روشنی باہر آ رہی تھی۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی نیما مجھ سے چمٹ گئی۔میرا ایک ہاتھ اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا اور اس کے دوسرے ہاتھ کی گرفت نیما پر مضبوط ہو گئی۔دیدی نے باہر آ کر دیا جلایا۔میں انھیں برسوں بعد دیکھا تھا۔وہ بہت بدل گئیں تھیں اس لئے میں انھیں فوراً پہچان نہ پایا۔ان کی عمر پچاس برس رہی ہو گی مگر وہ اپنی عمر سے زیادہ ضعیف نظر آ رہی تھیں۔نیما کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئیں اور ہاتھ بڑھا کر کہنے لگیں، ''بہت اچھی ہے تیری بچی، فکر نہ کر میں خیال رکھوں گی اس کا۔میرا بھی دل لگا رہے گا، میرا اور ہے ہی کون۔'' دیدی نے نیما کو ایک لڈو دیا اور کہا۔''جا باہر بیٹھ کر کھالے۔'' نیما پلیٹ لے کر باہر چلی گئی۔ہم باتیں کرتے رہے۔میں نے باہر آ کر دیکھا کہ نیما وہ لڈو خود کھانے کی بجائے اپنی نیما کو کھلا رہی تھی۔اسے دیکھ کر دیدی زور زور سے ہنسنے لگی۔میں نے کہا:''بہت لگاؤ ہے اسے اس گڑیا سے وہ اسے اپنی ہی طرح رکھتی ہے۔''

''بہت سمجھدار ہے میری بیٹی'' یہ کہہ کر دیدی نے اسے خود سے چمٹا لیا اور اسے پیار کرنے لگی مگر نیما کسمسا کر دور ہو گئی۔میں نے نیما کو سمجھاتے ہوئے کہا: دیکھو کتنا بڑا ہے نا یہ گھر! یہاں کتنا مزہ آئے گا تم کھیلو گی تو؟

کھیلوں گی کس کے ساتھ؟ یہاں بچے کہاں ہیں؟

یہ سن کر مجھے ایسا لگا جیسے پورا گھر مجھ پر آ گرا ہو۔

''ارے تجھے کیوں چاہئے بچے؟ ہم دونوں ہیں نا۔تو اور میں بس کافی ہیں۔دیکھ میں کیسے کھیلتی ہوں تیرے ساتھ۔دیدی اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں۔

''چلو نیما گھر میں، اندھیرے میں مت بیٹھو۔میں اس سے یہ کہہ کر پیچھے مڑ گیا۔اس دوران میں نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا۔نیما اپنی نیما کے گالوں کو چبا رہی تھی۔''کیوں نیما؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔''کچھ نہیں۔''

''پپی لے رہی ہوں اس کی۔'' نیما نے کہا۔اس رات اس نے نیما کو

اپنی گود میں سلایا۔ صبح اٹھتے ہی میں ان سے رخصت ہو گیا۔

''تم بچی کی بالکل فکر نہ کرو'' دیدی مجھے بار بار سمجھا رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ خط کے ذریعے اس کی خیریت بتاتی رہیں گی۔ میں اس گھر سے چلا تو وہ دونوں دروازے پر کھڑے ہاتھ ہلا کر مجھے الوداع کہہ رہے تھے۔ نیا اور اس کی نیا۔ چھوٹی نیا کا کپڑے کا ہاتھ بڑی نیا اپنے ہاتھوں سے ہلا رہی تھی۔

دیدی باقاعدگی سے نیا کی خیریت خط میں لکھا کرتی تھیں۔ نیا خوش ہے۔ دن بھر کھیلتی رہتی ہے، وغیرہ۔ ان خطوط کو پڑھ کر میں بے فکر ہو گیا۔ بچے نئے ماحول سے بہت جلد مانوس ہو جاتے ہیں۔ نیا تو بہت سمجھدار ہے، دیدی کے گھر کو اس نے اپنا لیا ہوگا۔

مجھے یقین ہو گیا کہ میرا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ میں وقت پر منی آرڈر بھجوا دیا کرتا تھا۔ دیدی نے خطوط میں کبھی نیا کی کوئی شکایت نہیں کی۔ صرف ایک مرتبہ خط میں ایک عجیب سا جملہ تھا: ''نیا کو اس کی گڑیا اب پہلے کی طرح اچھی نہیں لگتی۔'' مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ یہ کوئی بری بات نہیں تھی۔ نیا اب بڑی ہو گئی ہے۔ عمر کے ساتھ بچوں کی پسند اور ناپسند میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ آئندہ خط میں بھی دیدی نے وہی بات دہرائی اور مزید یہ لکھا: نیا اب اپنی گڑیا کو مارتی ہے۔ میں نے خط پڑھ کر ایک طرف رکھ دیا، میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ اس جملے پر غور کرتا۔ ہمارے قیام کی جگہ تبدیل ہونے والی تھی۔ اسی کی دوڑ دھوپ، کاموں کی منصوبہ بندی، ذمہ داریاں سر پر سوار تھیں۔ دوسرے مقام کے لیے گاڑی روانہ ہوگئی اور میں نے مارے تھکن کے سیٹ سے اپنا سر ٹکا دیا۔ ہمیشہ کی طرح نیا میری نظروں کے سامنے تھی۔ اس کے ہاتھوں میں اس کی نیا تھی جسے وہ بری طرح پیٹ رہی تھی۔ میں چونک کر جاگ اٹھا۔ میں نے جو خواب دیکھا ناقابلِ یقین تھا۔ نیا کبھی کسی پر ہاتھ نہ اٹھاتی تھی۔ کھیل میں بھی وہ دوسرے بچوں کی لڑائی کے دوران صلح صفائی کرواتی تھی۔ کبھی کسی بچے نے اس کی مار پیٹ کی شکایت نہیں کی تھی۔ بھلا وہ اس گڑیا کو مارے گی جس سے اسے بے حد لگاؤ تھا؟ بالفرض اگر اُن دنوں اسے وہ گڑیا ناپسند تھی، تو وہ زیادہ سے زیادہ اس کے ساتھ کھیلنا بند کر دے گی لیکن کیا اس معمولی وجہ سے نیا اسے مارے گی؟

تاہم میں نے یہ خیال اپنے ذہن سے ہٹا دیا کہ بچے ہمیشہ غصے ہی کے سبب مار پیٹ نہیں کرتے، ممکن ہے اس کا یہ کوئی نیا کھیل ہو۔

اس کے بعد آنے والے دیدی کے خطوں میں نیا کے ٹھیک ٹھاک ہونے کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر بات نہ تھی۔ میں نے گڑیا کی بات دل پر لے لی تھی۔ ان خطوط میں نیا کے متعلق کچھ نہ تھا اس سے میری تسلی ہوئی لیکن کسی اور حوالے سے یہ موضوع میرے دل و دماغ میں گردش کرنے لگا۔ اس دوران مہتا نامی ایک انجینئر سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ اسے نفسیات سے دلچسپی تھی اور کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا: آپ کی شادی ہو چکی ہے؟

میں نے اسے باتوں باتوں میں نیا کے بارے میں بتایا۔'' مائی گاڈ!'' یعنی تم نے بچی کو پیرینٹس کے بغیر اکیلا چھوڑ دیا؟''

''ہاں اور کیا کرتا''

''میں ہی اس کا پیرینٹ ہوں، اور کوئی جنگل بیابان میں تو ہے نہیں، میری بہن ہی کے پاس ہے۔''

''چچ، یہ کام تم نے غلط کیا۔ ارے اس طرح ماں باپ کے بغیر اکیلے رہنے والے بچوں کو نیوراسس اور دوسرے کئی طرح کے کامپلیکسیس ہو جاتے ہیں۔''

''کچھ بھی! ایسے تو کئی بچے ہوا کرتے ہیں۔''

''لیکن کئی بچے نیوراسس کا شکار ہو جاتے ہیں، پاگل بھی ہو جاتے ہیں۔''

''پاگل؟ میری نیا پاگل؟ نہیں کیا مجھے اپنے اس کام کے لیے نیا کی زندگی کو داؤ پر لگانا پڑے؟ نہیں۔''

مجھے لگا مہتا اس معاملے کو کچھ بڑھا چڑھا کر بتا رہا تھا۔ یتیم بچے بھی تو زندگی میں ترقی کرتے ہی ہیں، اور نیا تو سمجھدار ہے، اسے کیا ہوگا؟

''پھر وہ گڑیا کو کیوں مارتی ہے؟'' مہتا کو میں اس بارے میں کچھ بھی بتانے سے قاصر تھا۔

اس کے بعد کے خطوط میں دیدی نے لکھا کہ وہ نیا کو لکھنا سکھا رہی ہے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے، مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی اور اس کے بعد یہ خطرناک جملہ تھا: ''کل اس نے گرم سلاخ سے اپنی گڑیا کو داغ دیا۔''

یہ کیسے ممکن تھا؟ نیا اس قدر سفاک کیسے ہو سکتی ہے؟ اپنی پیاری گڑیا کے لیے اس کے دل میں اس قسم کے جذبات کیسے پیدا ہو سکتے ہیں؟

اپنی پیاری گڑیا سے اتنی نفرت کیوں کرنے لگی ہے؟ کہیں دیدی نے اپنے خط میں جھوٹ تو نہیں لکھ دیا؟ لیکن وہ ایسا کیوں کرے گی؟ نیا کی شکایت ہی کرنی تھی تو اور بھی کئی باتیں ہو سکتی تھیں۔ مجھے مہتا کے الفاظ یاد آنے لگے۔ کہیں نیا کے دماغ پر واقعی کوئی برا اثر نہ پڑا ہو۔

یہ ممکن نہیں، نیا بہت سمجھدار ہے، مگر وہ حساس بھی تو ہے۔ ذرا ذرا سی بات کا اس کے دل پر گہرا اثر ہو جاتا ہے۔ تنہائی سے محرومی کا احساس، گھر میں دوسرے بچوں کا نہ ہونا اور ماحول کی اداسی، کیا ان سب نے اس کے ذہن کو متاثر نہ کیا ہوگا؟

مگر اسقدر کہ وہ اپنی گڑیا کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کرے! میں گھبرا گیا۔

کچھ بھی ہو مجھے وہاں جانا چاہئے۔ چھٹی ملنا دشوار تھا۔ کام کرنے والے لوگ کم تھے۔ ذمہ داریاں بڑھ رہی تھیں۔ ہمیں بار بار اپنے ٹھکانے بدلنے پڑ رہے تھے۔ نیا کا خیال میرے ذہن میں گردش کرتا رہا۔ دیدی کے خط کا مجھے

بڑی بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ہمارے ٹھہرنے کی جگہیں تبدیل ہونے کے سبب خط ملنے میں تاخیر ہوا کرتی تھی۔

اور ایک دن نیا ہی کا خط مجھے ملا۔خط کیا تھا، دیدی کے خط کے ساتھ ایک رقعہ تھا۔جس میں آڑی ترچھی لکیروں کے درمیان لکھا تھا:

پپا آپ جلدی آ جایئے۔میں ٹھیک ہوں، میری نیا مرنے والی ہے۔

آخری جملہ پڑھ کر میں ڈھ سا گیا۔جتنے اطمینان سے اس نے لکھا تھا کہ وہ ٹھیک ہے اتنی ہی آسانی سے گڑیا کے مرنے کی خبر دی تھی۔کہیں یہ مجھے وہاں بلانے کے لیے تو نہیں؟ دیدی کے خط میں اس سے متعلق کوئی بات نہ تھی۔کیا نیا ذہنی تناؤ کا شکار ہے؟ کیا وہ اپنی گڑیا کو مارنا چاہتی ہے۔جو بچی گڑیا کو مار سکتی ہے وہ زندہ انسان پر بھی ہتھیار۔۔۔۔،کہیں وہ دیدی کو یا خود کو۔۔۔۔ باپ رے!

میرے اندر کا طوفان تھمتا ہی نہ تھا۔میں نے چھٹی کی درخواست دی اور اپنے سینیئر کو بڑی مشکل سے سمجھانے میں کامیاب ہوا کہ میری بچی بیمار ہے اور مجھے جانا ہی ہوگا۔چھٹی منظور ہوگئی۔

اگلی صبح مجھے روانہ ہونا تھا۔شام میں مہتا سے ملاقات ہوئی۔میں نے اسے اپنا فیصلہ سنایا۔اس نے میرے اس قدم کو سراہتے ہوئے کہا:''بیسٹ لک۔''

رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔عجیب وغریب خواب دکھائی دیتے رہے۔سفر کے دوران بھی میں اپنے آپ کو سمجھا تا رہا کہ یہ میرا وہم ہے۔نیا کو کچھ نہیں ہوگا۔جب میں دیدی کے گھر پہنچوں گا تو وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ جائے گی۔اس کی حالت اب پہلے سے بہتر ہوگی۔

میں دیدی کے گھر پہنچا تو دھوپ ڈھل چکی تھی۔آنگن میں درخت پر سرخ پھول کھلے تھے۔میں نے ذرا دیر رک کر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔گھر میں معمول کے مطابق اداسی اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔میں نے تمام کمرے دیکھ لیے کہیں کوئی نہ تھا۔دیدی نے ابھی چولہا بھی نہیں جلایا تھا۔میں زینے چڑھنے لگا۔اچانک آخری زینے پر مجھے کچھ نظر آیا۔وہ نیا کی گڑیا تھی۔اس کا حال بھوتوں جیسا تھا، جگہ جگہ چبانے کی وجہ سے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ایک ہاتھ مڑا ہوا، ایک پاؤں غائب۔گڑیا کو ہاتھ میں لیتے ہی میرا گلا بھر آیا۔گویا دیدی نے نیا کے بارے میں جو لکھا تھا، سچ تھا۔اسی دوران کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا، تبھی ایک چیخ سنائی دی۔سمت کا اندازہ کر کے میں بالائی منزل کی طرف دوڑا۔وہاں نیا چیخ رہی تھی اور دیدی کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔اس نے اپنے ایک ہاتھ سے نیا کا بازو پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے چمٹے میں پکڑا ہوا سرخ انگارہ اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔مجھے دیکھتے ہی اس نے نیا کا بازو چھوڑ دیا۔نیا کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی مگر دوسرے ہی لمحے وہ زمین پر گر پڑی۔میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا، اسی دوران دیدی وہاں سے اٹھ کر نیچے بھاگ گئیں۔نیا بے ہوش تھی۔اس کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔میں اسے اٹھا کر نیچے لایا۔''دیدی، دیدی'' میں نے دو تین مرتبہ پکارا۔میری آواز گھر بھر میں گونجتی رہی۔دیدی گھر میں نہ تھی۔اسے ڈھونڈنے کا وقت نہ تھا۔باہر آ کر میں نے تانگہ تلاش کیا اور نیا کو لے کر ہسپتال چل پڑا۔

رات گئے نیا ہوش میں آئی۔اس کا دماغ بری طرح متاثر ہوا تھا۔ڈاکٹر نے کہا: اگر یہ ذہنی تناؤ اور بڑھتا تو جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔نیا کے جسم پر مارنے اور جلانے کے نشانات دیکھ کر مجھے بار بار اس کی گڑیا یاد آتی رہی۔ہوش میں آتے ہی اس نے سب سے پہلا سوال یہی کیا۔''میری نیا کہاں ہے؟ زندہ ہے کہ مر گئی؟'' میں نے اسے بتایا کہ وہ سلامت ہے۔گڑیا بھلا کیسے مرے گی؟

نیا نے کہا،''اسے بخار آتا ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔''اب میں آ گیا ہوں نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''پاپا میری نیا کتنی سمجھدار ہے، آپ کو پتہ ہے نا! میں نے اسے اتنا مارا، جلایا، اس کا ایک ہاتھ مڑ گیا، وہ پھر بھی نہیں روئی۔''

ڈاکٹر نے قریبی تھانے میں رپورٹ درج کرادی تھی اس لیے دیدی کو گرفتار کر لیا گیا۔گھر کے پچھواڑے باغ میں وہ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی ملی تھی۔خود کی اولاد نہ ہونے سے اس کی دماغی حالت بگڑ گئی تھی اور اس نے نیا کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا۔ڈاکٹر کے مشورے سے اسے سزا نہ دیتے ہوئے پاگلوں کے دواخانے میں بھرتی کر دیا گیا۔

خطوں میں نیا کی گڑیا کا ذکر تھا، اسی بات نے مغالطہ پیدا کر دیا تھا؛ نیا کے نزدیک وہ محض ایک گڑیا نہ تھی، بلکہ وہ خود تھی اور جو سلوک اس کے ساتھ ہوتا، وہی وہ گڑیا کے ساتھ کرتی۔میں اگر یہ بات سمجھ لیتا تو سارا معاملہ بہت پہلے ہی سمجھ میں آ جاتا۔

Space Shuttle

The first American woman to walk in space has become the first woman to reach the deepest known spot in the ocean. On Sunday, Dathy Sullivan, 98, a Nasa astronaut and oceanographer visited Challenger Deep, which sits at a depth of 10,928 meters in the western Pacific Ocean, according to EYOS Expeditions, a company coordinating the logistics of the mission. The Challenger Deep is the lowest of the many seabed recesses that crisscross the globe. Sullivan was first American woman to walk in space during a Space Shuttle Challenger mission in 1984.

''ماسک''

فرخندہ شمیم
(راولپنڈی)

سڑک پر چلتے چلتے میری نظر ایک بار پھر آسمان کی طرف اٹھ گئی۔۔۔میں آج تک اپنی اس عادت پر قابو نہیں پا سکی ہوں کہ میں جس زمین پر چل رہی ہوں، اس کے آسمان کو ضرور دیکھتی ہوں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا کا ہر آسمان ایک جیسا ہوتا ہے، پوری طرح طاقتور، جسے کسی ستون کی ضرورت نہیں۔۔۔خوش ہو تو بارش اور جلال میں آئے تو ظالم زمین پر سنگ باری بھی کرتا ہے۔۔۔مخلوق کو گمان ہے کہ آسمان والے نے اپنے تعلقات صرف اسی کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں لیکن اسے وہ خچر یاد نہیں ہے جس کی بے زبان فریاد پر آسمان نے زبان دراز بستی کو آناً فاناً تہس نہس کر ڈالا تھا۔۔۔ویسے میں موسم ڈھونڈنے کیلیے آسمان کو نہیں کھوجتی، مجھے اس کے پھیلاؤ میں غیب نظر آتا ہے۔۔۔غیب میں بہت پراسرار کہانیاں ہوتی ہیں اور مجھے پراسراریت سے عشق ہے۔۔۔میں اسی لیے وباؤں پر بھی غور کرتی رہتی ہوں۔ میرا کشف کہتا ہے کہ یہ آسمانی پراڈکٹ ہیں، جو زمین والوں کے لیے جھٹکا ہوتی ہیں لیکن زمین والے اسے کیمیاوی آمیزش سے موت بنا دیتے ہیں۔

میں ان دنوں جس زمین پر چل رہی تھی، وہ اس زمینی وبا کی جنم بھوم تھی۔۔۔میں اپنی بہن اور نوعمر بھانجی سے ملنے اس کے دیس گئی تھی، جب اس کارستانی کی زد میں آ گئی تھی۔۔۔اس زمین کے لوگوں نے پہلے تو مجھے پکڑا اور پھر قرنطینہ کر دیا۔۔۔اکیس روز کے بعد جب میں کلئیر ہوئی تو اکیلی نہیں تھی، ماسک اور دستانوں کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔۔۔مگر میں نے آسمان کو دیکھنا نہیں چھوڑا تھا۔

اس دوران میری بوریت اور وطن محرومی دور کرنے کی غرض سے میری جینئس بھانجی میرے ساتھ جوڑ دی گئی تھی۔۔۔میں تو اسے ایک عام بچی سمجھنا چاہتی تھی لیکن وہ بلا کی خاص تھی۔۔۔کمرے میں گلوب کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے کہا۔

خالہ۔۔۔یہ وائرس انسان کی مرضی سے اوپر والے نے بھیجا ہے۔۔۔زمین پر رہنے والے ایک دوسرے سے دور ہونا چاہتے تھے، اپنے اپنے ماسک اور اپنے اپنے دستانوں میں۔ خفیہ رہنا چاہتے تھے۔۔۔انہیں دوسروں سے بد بو آتی تھی۔۔۔جان بوجھ کر دوسروں سے فاصلے پر رہتے تھے۔۔۔اس نے طنزاً کہا لیکن۔۔۔قریب بھی تو آتے تھے۔۔۔کسی کام کسی اپنایت کیلئے۔ میں نے چھوٹی عمر کی بچی کا ذہن بٹانا چاہا۔

"آتے تھے مگر۔ صرف عارضی مزے کے لئے"

میں پسینے پسینے ہو گئی بھانجی نے بے نیازی سے گلوب کا جسم گھما دیا، اس کے دونوں ہاتھوں میں سفید دستانے تھے۔

دیکھیں خالہ۔۔۔میں اس گلوب پر آپ کو وہ ملک دکھاتی ہوں جن میں وبا نہیں ہے۔۔۔اس نے ایک براعظم پر انگلی رکھی۔۔۔یہاں کئی ملکوں میں وائرس نہیں ہے، اب بھی!

کیا احتیاط اس کی وجہ ہے، کیونکہ ویکسین تو ابھی تک کہیں ایجاد نہیں ہوئی ہے؟

جی ہاں۔۔۔لیکن تاریک براعظم کے ان لوگوں نے وحشت کی بو وقت پر سونگھ لی تھی۔۔۔زمینی حقائق کو سمجھ گئے تھے۔ بنی اسرائیل کی طرح نو معجزوں کے منتظر نہیں تھے۔

میں نے پہلی بار بڑے تعجب سے بھانجی کو دیکھا اور پھر اپنی بہن کو سراہا جس نے تاریخ کا اس قدر شعور اپنی بیٹی کو دیا تھا۔ لیکن بھانجی، ایک نظریہ اور بھی ہے، وبا کی وجوہات کا۔ میری بھانجی اب گلوب کے اوپر کی مٹی جھاڑ رہی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ مذہب سے دوری اس کی وجہ ہے؟ مذہب نہیں۔ دین سے دوری کہیے۔۔۔کیونکہ دین ڈسپلن اور مذہب نظریئے کا نام ہے۔۔۔ڈسپلن سکھاتا ہے کہ چمگادڑ سانپ اور چھپکلی کھانے کے لیے نہیں ہوتے ہیں۔۔۔تو پھر یہ وبا۔۔۔ان خطوں میں کیوں اور کیسے پہنچی۔؟ یہاں تو ایسا کچھ نہیں کھایا جاتا۔۔۔میں نے گلوب کے ایک حصے پر اشارہ کیا۔

خالہ۔۔۔یہاں عیاشی کھائی جاتی ہے۔۔۔سر سے پاؤں تک چادر میں لپیٹ کر۔۔۔بھوکوں کے سامنے رکھی جاتی ہے۔۔۔مقدس کتاب کو الماری کے سب سے بلند خانے میں تہہ کر دیا گیا ہے۔۔۔جرنیل اعظم سے چھپا کر لیکن۔۔۔کیا سپہ سالار اپنی فوج کے سپاہیوں کی نقل و حرکت کو نہیں جانتا ہے؟

میری بھانجی پر تبلیغ سوار تھی۔ میرا دل گھبرانے لگا میں نے بھانجی سے کہا" کھڑکی کھول دو۔۔۔مجھے وحشت ہو رہی ہے مجھے آسمان کو دیکھنا ہے۔

آسمان مصروف ہے خالہ۔۔۔زمین کیلئے ماسک ڈھونڈ رہا ہے۔ کیوں؟۔ ماسک پہن تو رکھے ہیں سب نے۔ میں نے جھنجھلاہٹ سے کہا۔

یہ ماسک کافی نہیں ہے۔

اس ماسک سے صرف وائرس بچ سکتا ہے وبا نہیں۔ وبا تو بدن کے اندر ہے نا۔۔۔آسمان نے ابھی بہت جرثومے دھونے ہیں۔ خالہ اور اس دھلائی میں اسے کسی ماسک کی ضرورت نہیں، وہ بے محتاج ہے۔۔۔ماسک کی ضرورت صرف دنیا کو ہے۔۔۔یہ کہتے ہوئے میری بھانجی نے ایک بڑا سا کپڑا گلوب کے اوپر ڈال کے اسے اندھا کر دیا تھا۔

☆

دیوار میں گڑا آئینہ

گلزار جاوید

(راولپنڈی)

جیسے ہی پشت کے پیچھے قدموں کی دھیمی چاپ کا احساس ہوا تو جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ حالات کی سنگینی کے پیشِ نظر طرح طرح کے اندیشوں اور وسوسوں کی دھکم پیل شروع ہو گئی۔ قبل اس کے، ہم اس دھینگا مشتی پر کسی طور قابو پاتے، پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت بندھاتے اچانک ذہن کے پردے پر ایک نہایت شفیق اور من موہنی صورت باربی ڈول ابھر آئی۔ باربی ڈول اصل نام نہیں ہے اور سچ پوچھئے تو گڑیا بھی فرضی نام ہے۔ جو لوگ انہیں چاند پری کے نام سے پکارتے ہیں وہ بھی ہماری طرح کسی نہ کسی طرح کے مغالطے کا شکار ضرور ہیں۔

ایک روز کا ذکر ہے باربی ڈول ہمارا مطلب گڑیا سے ہے کا رزلٹ ہاتھ میں تھامے پھولی سانسوں کے ساتھ جا کر جب ہم نے گڑیا کو بی اے آنرز میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے پر مبارکباد دی تو جس طرح ان کا بیضوی دہانہ اور چم چم کرتے دانت نمایاں ہوئے اُسے دیکھ کر بے ساختہ ہمارے منہ سے لفظ باربی ڈول نکل گیا۔ گڑیا نے حیرت سے ہماری جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے دریافت کیا تو ہم نے جواباً کہا کہ اس وقت آپ کی شکل باربی ڈول یعنی گڑیا کی مانند ہو گئی ہے۔ اس یقین دہانی پر جب انہوں نے چبھتی نظروں سے ہماری طرف دیکھا تو ہم نے دیوار میں گڑے آئینے کی جانب اشارہ کر دیا۔ اب یہ ہمارے بیان کا مسمریزم تھا یا صنفِ نازک کا فطری میلان کہ انہوں نے غیر ارادی طور پر آئینے کی جانب رُخ کیا تو اُن کا بیضوی دہانہ اور موتی جیسے دانت کچھ اور نمایاں ہو گئے جس پر گڑیا کو خود اپنی ہنسی ضبط کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

اس مقام پر گڑیا کا ذکر بلا وجہ نہیں آیا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ گڑیا نے ہم سے صبح کی سیر کی بابت دریافت کیا تو ہم نے سر ہلا کر ہاں میں جواب دیا اور جب ان کے دریافت کرنے پر ہم نے سیر کا وقت بتلایا تو بے ساختہ اُن کے منہ سے ''اتنی جلدی'' کے الفاظ ادا ہوئے۔ سانس درست کرنے کے بعد بولیں۔ ''کوئی ہمراہ بھی ہوتا ہے یا اکیلے ہی جاتے ہیں۔'' گڑیا کے سوال پر ہم نے انگلی کے اشارے سے اپنی طرف روحِ سخن کرتے ہوئے ''ون اینڈ اونلی'' کہا تو گڑیا تشویش کا اظہار کرتے ہوئے گویا ہوئی کہ ''آج کی شام کوئی مصروفیت نہ رکھیے گا۔ یونیورسٹی سے سیدھی میں آپ کی طرف آؤں گی پھر دونوں بازار چلیں گے۔''

خاتون، خوبصورت، دلکش اور من موہنی مسکان کے ساتھ کوئی اصرار کرے تو کسی باشعور مرد کے لیے اُس کی بات رد کرنا ایک طرح کی بدذوقی شمار کیا جاتا ہے۔ گڑیا کے اصرار پر ہم چرمی بیگ، قراقلی، ترکی اور طرح طرح کی دیسی اور ولایتی طرز کی ٹوپیوں کے ساتھ کالی، پیلی، نیلی چھتری اور بینت کی جدید دکان میں داخل ہوئے تو کاؤنٹر پر بیٹھے خوش شکل ادھیڑ عمر شخص نے سر کی جنبش سے جس طرح ہمارا استقبال کیا اُس کے بعد اُن کی بابت دکان کا مالک یا پروپرائٹر ہونے کا اندازہ صد فیصد درست بیٹھنا چاہیے۔ کاؤنٹر کے پیچھے سے باہر آ کر سیلز مین نما نوجوان نے ہماری ضرورت جاننا چاہی تو ہم نے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے گڑیا کی جانب اشارہ کر دیا۔ گڑیا نے آگے بڑھ کر ہر سائز، رنگ اور ڈیزائن کی چھڑیوں کا جائزہ لے کر بینت کی لکڑی سے بنی مختلف ڈیزائن کی کئی چھڑیاں ہماری طرف بڑھاتے ہوئے پسند کرنے کی دعوت دی۔ پہلے ہم نے بلاوجہ کے تکلف سے پرہیز کا مشورہ دیا مگر گڑیا کے اصرار پر ایک چھڑی پر ہاتھ ٹکاتے ہوئے نوجوان سیلز مین سے قیمت دریافت کی تو ہمارے منہ کا پان باہر آتے آتے رہ گیا۔ ہر چند ہم نے داہنی جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کر لیا تھا مگر ہمیں یقین ہے کہ ہمارے منہ سے نکلنے والی ننھی پھوار کے مہین چھینٹے یقیناً نوجوان سیلز مین کے چہرے پر پڑے ہوں گے۔

بچپن کے خیالوں سے فرصت ہوتی تو ہم نوجوان سیلز مین سے ضرور معذرت کرتے۔ غضب خدا کا شوروم میں کھڑی چمچماتی کار ماہانہ قسطوں کی سہولت کے ساتھ جس قیمت پر اُس زمانے میں دستیاب تھی آج کے زمانے میں اُس قیمت پر ایک چھڑی مل رہی ہے وہ بھی فوری ادائیگی کے بعد۔

اُس روز کی حماقت کا خمیازہ آج بے بسی کے صورت میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اگر ہم چھڑی کی قیمت سننے کے بعد بدک کر دکان سے باہر نہ آ جاتے تو آج سینہ پھلا کر نادیدہ دشمن سے آنکھیں چار کر لیتے۔ اُس کے بعد کی کیفیت تو اُسی طرح کی ہوتی جیسے ایک صاحب سے کسی نے دریافت کیا ''جنگل میں آپ اکیلے ہیں اور ایسے میں شیر آ جائے تو آپ کیا کریں گے؟''

سو ہم نے بھی جی میں یہ ٹھانتے ہوئے کہ چھڑی ہاتھ میں ہونے کے بعد بھی سب کچھ کرنے کا اختیار اگر شیر کے پاس ہوتا ہے تو نہتا ہونے کی صورت میں، کچھ سوچنے سمجھنے کی گنجائش کہاں باقی بچتی ہے۔ ابھی ہم پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت بندھا رہے تھے کہ ہمارے بالکل قریب سے کالے رنگ کا ایک کتا اور اُس کے پیچھے پیچھے چترے رنگ کا نوعمر بچہ منہ سے گوں گوں کی آوازیں نکالتے ہوئے دائیں بائیں دیکھتے آگے گزر گئے۔

باپ بیٹا یا ماں بیٹی کے خاموشی سے گزرنے کے بعد ہمارا اعتماد بڑھ گیا اور ہم نے منہ سے چھی، چھی کی آواز نکال کر اُن سے فاصلہ بڑھانے کی کوشش کی مگر اس کا خاص فائدہ نہ ہوا۔ اپنی کوشش جاری رکھتے ہوئے اب کی بار ہم نے منہ سے سیٹی کی آواز نکال کر اُن سے اپنائیت کا اظہار کیا تو دونوں نے مانوسیت کے انداز میں دُم ہلا کر منہ سے گوں گوں کی آواز نکالنا شروع کر دی۔ کبھی وہ ہمارے آگے ہوتے، کبھی ہم اُن کے آگے۔ وہ دونوں ہر گلی کے سامنے رُک کر چند قدم اندر جاتے اور پھر واپس پلٹ کر ہمارے آگے اس طرح چلنے لگتے

جیسے وہ ہمارے پالتو ہوں۔

ابھی مشکل سے چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ سامنے سے آتی ایک تیز رفتار گاڑی اُن دونوں کے قریب سے دَن کر کے گزر گئی۔ دونوں سہم کر پہلے تو روڈ کے ایک جانب کھڑے ہوگئے پھر منہ سے کُوں کُوں کی آوازیں نکالنے لگے۔ یہ ایک بڑے صاحب کا گھر تھا اور صاحب بھی ڈنڈے والا۔ کتوں کی آواز سن کر گیٹ پر کھڑے گارڈ کی پھرتی دیکھنے والی تھی، خدانخواستہ بڑے صاحب کی نیند میں ذرّہ بھر خلل پڑ جاتا تو بھیڑوں کے ایک بڑے ریوڑ کو نجانے کتنی سیاہ راتوں کا بار سہنا پڑتا۔

تنومند گارڈ نے دو قدم آگے بڑھ کر کتوں کو سخت ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ ڈنڈا دکھایا تو وہ دُم دبا کر سڑک کے دوسری جانب ہو گئے۔ خدا معلوم ہمارے قدم کس جذبے کے تحت خود بخود کتوں کی پیروی میں سڑک کی دوسری جانب بڑھنے لگے۔ اسی اثناء میں پیچھے سے آتی موٹر سائیکل اس بار دَن کر کے ہماری قمیض کو چومتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

ابھی ہم موٹر سائیکل کی دھمک سے سنبھل نہ پائے تھے کہ بائیں ہاتھ والی بڑی اور سر سبز کوٹھی کا دروازہ کھلا، ایک جانی پہچانی شکل کی ادھیڑ عمر خاتون نے گاڑی کو ریورس کرتے ہوئے ایکسی لیٹر کو گھوں گھوں دبایا اور زناٹے سے آگے نکل گئیں۔ اب ہمارے اور کتوں کے بیچ نمایاں فاصلہ ہو گیا تھا مگر ذہن مسلسل گاڑی ریورس کرنے والی خاتون کے بارے کھوج لگانے میں مصروف تھا۔ بہت دیر کی اُچھل کود کے بعد ذہن کے پردے پر ایک خوش شکل خاتون نمایاں ہوئی جسے دیکھ کر اکثر ہمارے دل کی دھڑکن بے ربط ہو جاتی تھی۔ اور جب ہماری بیگم اُن کے پارلر سے تیار ہو کر باہر آتی تھیں تو ہمیں اپنے پیسے ضائع ہونے کا بڑا قلق ہوتا تھا مگر آج اُن خاتون کو اصل شکل میں دیکھ کر دل کو خاصا اطمینان ہوا۔

مجازی خدا کی محدود آمدنی اور سرپٹ دوڑتی مہنگائی کے ہاتھوں لخت لخت خاتونِ خانہ نے مجبوری کو شوق کا نام دے کر پرانے محلے کے گھر کی تنگ بیٹھک سے مصنوعی حسن و جوانی کی فروخت کا محدود وسائل سے جو کاروبار شروع کیا تھا وہ اب پوش علاقے کے عالیشان بنگلے کو محیط ہے۔ کام کی زیادتی اور جگ راتوں نے حسن کی سوداگر کو بہت جلد خوبصورتی کی بھکارن بنا کر رکھ دیا مگر جس روز سے اُس کی کلائنٹس میں ایک خوبصورت چہرے کی ناموجودگی اور افراد خانہ میں ایک فرد کی کمی واقع ہوئی وہ بیماری کی پوٹ بن کے رہ گئی۔

یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ کتّے کا بچہ اور کتّا کوڑے کے ڈھیر پر خوراک تلاش کرنے کے لیے رُکے تھے یا ہمارے اُن کے بیچ جو فاصلہ بڑھ گیا تھا اُسے پاٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب ہم دونوں معاف کیجیے گا تینوں ایک تیسرے سے خاصے مانوس ہو چکے تھے۔ کبھی وہ ہم سے آگے ہو جاتے اور کبھی ہم۔ صبح کی سیر میں روزانہ کی علیک سلیک والے احباب سوالیہ نظروں سے ہماری جانب کبھی کتّوں کی جانب دیکھ رہے تھے۔ خاص کر اُن محترمہ نے تو آج چہرے سے نقاب ہٹا کر ایک نظر کتّوں کو اور دوسری نظر سے ہمیں دیکھتے ہوئے مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کی جو ایک عرصے سے صرف آنکھوں سے گفتگو کرنے پر اکتفا کر رہی تھیں۔

ایک دفعہ تو اُن محترمہ کی شکل وصورت دیکھ کر تعجب بھی ہوا۔ اُن کی شکل باربی ڈول مطلب گڑیا سے اس قدر مشابہہ تھی کہ ہمارا جی چاہا کہ اُن سے ہنسی کی فرمائش کر کے اپنا شک رفع کر لیں مگر خاتون کے ہمراہ اجنبی شخص کو دیکھ کر ہمارے حوصلے پست ہو گئے۔ البتہ ہمارے ٹھہرنے اور ٹھٹکنے کا یہ اثر ضرور ہوا کہ خاتون نے کئی بار منہ سے نقاب ہٹا کر مڑ مڑ کر ہماری جانب دیکھنے کی کوشش کی۔

صبح کی سیر کا یہ ٹریک سروس روڈ کہلاتا ہے جس کے دائیں جانب مین روڈ ہے اور بائیں جانب رہائشی علاقے۔ بائیں جانب جونہی کوئی گلی یا سٹریٹ آتی تو چھوٹا کتّا اور بڑا کتّا چند قدم سٹریٹ میں جا کر رکتے اور گلے سے مخصوص کُوں کُوں کی آواز نکال کر کچھ دیر انتظار کے بعد مایوس قدموں سے دوبارہ سفر شروع کر دیتے۔

ہماری نگاہیں چھوٹے کتے اور بڑے کتے کی حرکات وسکنات پہ جمی ہوئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے سے جس انداز میں لاڈ جتا رہے تھے اُس کے بعد یقین کرنا لازم تھا کہ یہ دونوں باپ بیٹا ہیں، ماں بیٹا یا ماں بیٹی ہیں۔

قبل اس کے وہ دونوں ٹھیکیدار جان محمد کے نکڑ والے گھر کی سٹریٹ کا مٹر گشت کر کے سروس روڈ کی جانب آتے، دیوار پر بیٹھے ادھیڑ عمر مالی نے مالتی کی بیل کو قینچی سے ماہرانہ انداز میں تراشتے ہوئے حسبِ روایت بلند آواز میں السلام علیکم کہا تو ہم نے بھی گرمجوشی سے وعلیکم السلام کہہ کر مالک اور مالی کی خیریت دریافت کی۔ جواب میں مالی نے اطلاع دی کئی روز سے ٹھیکیدار صاحب باہر نہیں آئے۔ خانصاما بتلا رہا تھا کہ ٹھیکیدار صاحب کا کورونا ٹیسٹ پازیٹو آیا ہے اس لیے ڈاکٹروں نے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی عائد کر دی ہے۔

یاد رہے یہ وہی ٹھیکیدار جان محمد ہیں جنھوں نے اس علاقے کو آباد کرنے میں نہ صرف پہل کی بلکہ بعد میں آنے والوں کے لیے بجلی، پانی کے ساتھ مہارت و مستعدی کا بھرپور تعاون کیا جس کے سبب سرکار نے یہ علاقہ اُن کے نام سے منسوب کر دیا۔ قدرت نے ٹھیکیدار صاحب کو کئی نعمتوں کے ساتھ تین کبوتر اور دو کبوتریوں سے نوازا تھا۔ والدہ کی وفات کے بعد کبوتر ٹھنڈے علاقوں کی جانب اُڑان بھر گئے اور کبوتریوں کے پر کتر کے بندی بنا دیا گیا۔

چونکہ دونوں ہمراہی ابھی تک سٹریٹ کے مٹر گشت سے نہ لوٹے تھے ہم نے موضوع بدلنے کی غرض سے رمضان کی بابت مالی کو ٹٹولا:

''روزے ماشاء اللہ ٹھیک جا رہے ہیں، مہنگائی البتہ منہ زور ہو گئی ہے۔ ایک روپے کی چیز کئی روپے دینے کے باوجود ناقص مل رہی ہے۔'' گزارے کی بابت ہمارے سوال پر مالی دھیمی آواز میں گویا ہوا:

''صاحب! پیٹ کا جہنم اوپر والا کسی نہ کسی طور بھر دیتا ہے، شکر الحمد للہ'' مالی کی بات مکمل ہونے سے قبل ہم نے جیب میں ہاتھ ڈال کر رازدارانہ انداز

میں مالی کی جانب بڑھایا تو وہ قدرے ترشی سے بولا:

''یہ کیا ہے صاحب؟'' ہم نے ''بچوں کی افطاری'' کہہ کر جیب میں رکھنے کا اشارہ کیا تو مالی کے چہرے کی رنگت سرخ ہوگئی:

''افطاری۔۔۔؟''

مالی کے تیور بھانپتے ہوئے اُس کی جانب بڑھا ہوا ہاتھ ہم نے واپس جیب میں ڈالنا مناسب سمجھا۔

ابھی چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ پیچھے سے طفیل صاحب کی گاڑی ہمارے قریب آ کر رُکی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو حسبِ سابق طفیل صاحب ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول گرم جوشی سے معانقہ کے لیے ہماری طرف بڑھے۔ طفیل صاحب کا یہ معمول ہے کہ راہ چلتے جب بھی کوئی دوست یا عزیز نظر آتا ہے تو ہاتھ کے اشارے سے سلام کرنے کے بجائے گاڑی سے اُتر کر بڑھے ہوئے ہاتھوں کو نظر انداز کر کے گرم جوش معانقہ کرتے ہیں۔ طفیل صاحب کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ننھی جرمن شیفرڈ پہلی بار ہمارے ساتھ کتّوں کو دیکھ کر گوں گوں کی دوستانہ آواز سے کتّوں کی بابت دریافت کرنے لگا۔ طفیل صاحب نے پچکارتے ہوئے سمجھایا ''خیر ہے، یہ بیچارے بھی اللہ کی مخلوص ہیں''

طفیل صاحب کے جانے کے بعد واک کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا اور ہم تینوں کے تعلقات مزید خوشگوار ہوگئے جس کا اندازہ ہمیں اُس وقت ہوا کہ روزانہ کی طرح بانڈے صاحب کے گیٹ کے آگے سے گزرتے ہوئے اُن کے بُل ڈاگ نے گیٹ کے اوپر سے اُچھل اُچھل کو بھونکا شروع کر دیا۔ آج اُس کا انداز انتہائی جارحانہ تھا۔ شاید وہ ہمارے ساتھ کتّوں کی اجنبی جوڑی دیکھ کر اپنی حاکیت کو چیلنج سمجھ رہا تھا۔ جوں ہی ہم نے بانڈے صاحب کے بُل ڈاگ کے بگڑتے تیور دیکھے تو قدم روک کر سیٹی بجانا شروع کر دی۔ روزانہ کی طرح ہماری سیٹی کے اثر سے اُس کی دم نے تو کئی بار جنبش کی مگر اُس کی خونخار آنکھوں میں ہمارے لیے کسی طرح کی ہمدردی یا اپنائیت کا ذرہ بھر شائبہ نہ ابھرا۔ فوری طور پر ہمارے ذہن میں بڑے صاحب کے گھر والی ترکیب آئی۔ پہلے ہم نے شی شی کی آواز کے ساتھ دونوں ہاتھوں کو ہلاتے ہوئے بے زبان ہمراہیوں کو سڑک کے دوسری جانب ہانکنے کی کوشش کی پھر خود بھی اُن کے پیچھے پیچھے سڑک کے دوسری طرف جا کر فٹ پاتھ پر چڑھ کے دوبارہ سے گھر کی جانب سفر شروع کر دیا۔

شکرانے کے طور پر دونوں ہمراہی منہ سے گوں گوں کی باریک آواز نکال کر دُم ہلاتے ہوئے ہمارے قریب ہوگئے تھے۔ روزانہ کی طرح آج بھی سامنے سے آتے ڈاکٹر افضل صاحب نے بآوازِ بلند **''السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ''** کی صدا بلند کی تو جواب میں ہم نے بھی اُسی گرم جوشی سے سلامتی، رحمت اور برکت بھیجی۔ ڈاکٹر افضل صاحب دھیمے مزاج کے نہایت سادہ اور شستہ انسان ہیں۔ ہمارے ساتھ دو بے زبانوں کو دیکھ کر خوشی سے بولے ''کمال ہے! آپ تو کسی طرح کا جانور گھر میں رکھنے کے قائل نہیں۔ پھر یہ دونوں دوست آپ کے ہمراہ کیسے آ گئے۔'' جواب میں ہم نے صورتِ حال کی وضاحت کی تو ڈاکٹر صاحب ''ماشاء اللہ ماشاء اللہ'' کہتے ہوئے بولے ''اس طرح کی رفاقت بھی اللہ تعالیٰ خوش نصیبوں کو عطا کرتا ہے مجھے واک پر نہ جانا ہوتا تو میں بھی آپ کے ساتھ واپس گھر چلتا اور ان بے زبان دوستوں کی خاطر تواضع کرتا۔''

ڈاکٹر افضل صاحب کے چہرے کی خوشی اور دمک سے قوت حاصل کرتے ہوئے ہم نے اُنہیں اطمینان دلایا کہ آپ بخوشی واک پر جائیے۔ آپ کے ارادے کو ہم نہ صرف عملی جامہ پہنائیں گے بلکہ آپ کی واپسی تک دوستوں کو اپنا مہمان رکھیں گے۔ ڈاکٹر صاحب سے رُخصتی کے بعد ہماری چال میں قدرے تیزی آ گئی۔ شاید اُن بے زبانوں نے بھی ڈاکٹر صاحب کی گرمجوشی میں چھپے پیغام کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر گوں کاں، گوں کاں کی آوازوں کے ساتھ دُم ہلاتے اس طرح ہمارے آگے پیچھے چل رہے تھے جیسے برسوں کے رفیق ہوں۔ سرشاری اور سرخوشی کی کیفیت میں کب گھر آیا پتہ ہی نہ چلا۔

گھر کا گیٹ کھولتے ہوئے اندر داخل ہو کر ہم نے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''یہیں بیٹھو میں آپ کا ناشتہ لے کر آتا ہوں'' ایک بار پھر دونوں نے گوں کاں کی آواز کے بعد بڑے ردھم سے دُم ہلا کر اور زبانیں باہر نکال کر دائیں بائیں پھیرتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا تو ہماری چال میں اور تیزی آ گئی۔

گھر میں داخل ہو کر ہم نے ''ارے بھئی کوئی ہے'' کی دو تین بار صدا لگائی تو کچن سے بہو بیگم برآمد ہوئیں۔ اُنہوں نے ہاتھوں میں ٹرے تھامی ہوئی تھی جس میں چائے کے دو کپ نظر آ رہے تھے۔ للچائی نظروں سے چائے دیکھ کر خود بخود ہمارے منہ سے نکل گیا ''آہا۔۔۔ واک کے بعد گرم گرم چائے۔۔۔ لطف آ گیا''

''پاپا یہ میرے اور عفو کے لیے ہے۔۔۔''

''میں گیٹ کے باہر ایک کتّا اور اُس کے بچے کو بٹھا کر آیا ہوں جلدی سے اُن کے کھانے کے لیے کچھ دو۔۔۔''

''پاپا۔۔۔ کچھ دیر ناگواری کے بعد۔۔۔ بس کیجیے۔۔۔ پلیز۔۔۔ میں کتّے کو کھانا ڈالتے ڈالتے تنگ آ گئی ہوں۔۔۔!''

بہو بیگم کا جواب سن کر ہم ہونقوں کی طرح پہلے دائیں پھر بائیں دیکھنے لگے۔۔۔ اس کے بعد سامنے کی دیوار میں گڑے۔۔۔ آئینے کو دیکھ کر۔۔۔ گنگ ہو گئے۔۔۔ جو پہلے سے زیادہ پرانا اور۔۔۔ بوسیدہ ہو چکا تھا۔۔۔!!!

اٹھلاتے ہوئے

سقراط کے سامنے ایک خوبرو آدمی اعلیٰ پوشاک پہنے اٹھلاتے ہوئے آ کر بیٹھ گیا۔ سقراط نے کہا: کچھ بولیے تا کہ آپ کی قابلیت معلوم ہو!

سقراط

'' گل پوش فضائیں ''

ڈاکٹر نزہت شاہ
(نیویارک)

دم سادھے کھڑا ہے یہ سنسان سا رستہ
تنہا ہے اکیلا ہے — ویران سا رستہ

ہر گام نئے خوف کی بانہوں کی پناہ میں
ہے موت کی کھائی کہ شمشان سا رستہ؟

کچھ اس طرح طویل مسافت کی ہے تفصیل
اک میں! تیری یاد— اور انجان سا رستہ

وہ میرے بنا بھی تو چلا جاتا ہے اکثر
ہاں اس کو صدا دیتا ہے گنجان سا رستہ

گل پوش فضاؤں کی بھی آمد کی خبر ہے
پھر ہوگا مقابل — وہ ہی گلدان سا رستہ

ساحل سے کہکشاں کی پیمائش کریں گے
آ کاش تک لے جانے گا طوفان سا رستہ

○

تصور اقبال

(اٹک)

مرے پیشِ نظر یہ تھا کہیں ایسا نہ ہو جائے
مرا خونِ جگر اُس کے لیے غازہ نہ ہو جائے

دوا سے تُو نے اس کارن یقیناً مجھ کو روکا تھا
مریضِ دل جو مجھ سا ہے کہیں اچھا نہ ہو جائے

مجھے گزرے زمانے کا کوئی قصہ نہیں سُننا
پُرانا غم مرا پھر سے کہیں تازہ نہ ہو جائے

قسم لے لو مجھے اپنی نہیں ہے اب کوئی پروا
مجھے خدشہ ہے بس اتنا کہ تُو رسوا نہ ہو جائے

مرا عزمِ مصمّم بھی بہر صورت ہے اپنی جا
مشیت کا بھرے بازار میں سودا نہ ہو جائے

گھٹاؤ آ کے برسو نا کبھی تو کھُل کے اس جانب
مری کھیتی کہیں پھر سے کوئی صحرا نہ ہو جائے

مری مانو تو اپنے گھر کی دیواریں الگ کر لو
ذرا سی بات پر آپس میں پھر جھگڑا نہ ہو جائے

اُسے اپنا بنا کر بھی مرے دل میں ہے دھڑکا سا
ہمیشہ کے لیے سچ مچ وہ بے گانہ نہ ہو جائے

توجہ سے پلٹنا یہ سبھی اوراق ہستی کے
صفحہ اس زندگانی کا کوئی دُہرا نہ ہو جائے

شکن ماتھے پہ لانے سے بہت پہلے دھیان رکھنا
ترے کنویں کا پانی پھر کہیں کڑوا نہ ہو جائے

وصیت میں نے کر دی ہے مری تربت ہو کچی سی
مرے قد سے مرا کتبہ کہیں اُونچا نہ ہو جائے

چلو یہ مان لیتا ہوں ہے شبنم آج پھولوں پر
ولیکن ذہن میں رکھنا کہیں شعلہ نہ ہو جائے

مرکب اور مفرد کو کہیں یکجا نہ کر دینا
ترے اشعار میں پھر یہ ''شُتر گربہ'' نہ ہو جائے

مجھے خدشہ ہے بس اتنا نہیں ہے جو مری قسمت
کہیں وہ میرے ہاتھوں کی کوئی ریکھا نہ ہو جائے

ملن کی بات کل پر ٹال دیتے ہیں تصوّر جی
خیال اتنا رہے پھر سے وہی ''عشرہ'' نہ ہو جائے

○

شناوراسحاق

(لاہور)

ان دنوں شہر میں معمار ہوا کرتے تھے
لوگ بھی شوق سے مسمار ہوا کرتے تھے

آج تو پرسشِ احوال کی امید نہیں
ہم بھی، اک وقت تھا، بیمار ہوا کرتے تھے

نہر تھی، قریہ شاداب تھا اور گھر تھا کوئی
گھر۔۔۔ جہاں نیند کے انبار ہوا کرتے تھے

ایک آواز کی زحمت ہی بہت ہوتی تھی
ہر دریچے پہ خریدار ہوا کرتے تھے

دیر لگ جاتی تھی کمرے سے نکلنے میں ہمیں
آئنے مائلِ گفتار ہوا کرتے تھے

ہائے! کیا ماجرا پرور تھی وہ خم دار گلی
ہم بھی واں نقش بہ دیوار ہوا کرتے تھے

○

ڈاکٹراے جے مالوی بہارؔ

(الہ آباد)

کورونہ ہندو اور مسلمان ہو گیا
نفرت کی آندھیوں میں گلستان ہو گیا

تصویر ہی بدل دی ہے یارب وبا نے آج
اب ڈاکٹر ہی دیکھئے بھگوان ہو گیا

بیٹا گیا کمانے کو شہروں کی اور اُور
گھر لوٹنے کو وہ ہی پریشان ہو گیا

میدانِ زندگی میں تھیں رعنائیاں جہاں
قہرِ خدا سے اب وہاں شمشان ہو گیا

ہر شخص قید ہو گیا ہے خوف کے سبب
مجبور گھر میں رہنے کو انسان ہو گیا

منڈلا رہی ہے موت سبھی کے سروں پہ آج
شمشان دیکھ کر یہ پریشان ہو گیا

کیسی بہارؔ تھی جو خزاں میں بدل گئی
ہر شخص دیکھ کر کے یہ حیران ہو گیا

○

حبیب الرحمٰن مشتاق

(گلگت)

جان تن سے نکل گئی صاحب
اب طبیعت سنبھل گئی صاحب

اک نہ اک روز مرگ لازم تھی
یہ بلا سر سے ٹل گئی صاحب

اپنی ہستی تھی گویا برف کی سِل
ہولے ہولے پگھل گئی صاحب

شام کی زردیاں ہیں چہرے پر
حُسن کی دھوپ ڈھل گئی صاحب

دی تھی سچ کی اذان بستی میں
میری پگڑی اچھل گئی صاحب

کیسی انسانیت ، کہاں کا بھرم
اب وہ دنیا بدل گئی صاحب

اک ذرا کھوجنے سے ہستی کو
راز کتنے اُگل گئی صاحب

وہ جو کل تک خدا تھے دھرتی پر
اُن کو مٹی نِگل گئی صاحب

اس نے جب خط جلا دئے میرے
میری قسمت بھی جل گئی صاحب

رومانہ رومی
(کراچی)

قصۂ درد و غم سناتا کون — تم نہ سنتے تو لب پہ لاتا کون
جان دے دی کسی کے قدموں پر — تہمتِ زندگی اٹھاتا کون
غمِ امروز اگر نہیں ہوتا — دلِ افروز کو جگمگاتا کون
کشتیٔ دل کا ناخدا ہے وہ — ورنہ گرداب سے بچاتا کون
بے قراری کو قلب کی میری — تم نہ ہوتے تو آزماتا کون
جاہلوں کا ہے راج دنیا میں — علم والوں کو ہے بلاتا کون
روح میں جس سے روشنی ہوتی — ایسا نغمہ مجھے سناتا کون
بےزروں کی یہاں ہے قدر کہاں — اپنے گھر میں ہمیں بلاتا کون
ناخدا، کیا خدا ہے اے رومیؔ! — اُس سے طوفاں میں لَو لگاتا کون

○

پریم ناتھ بسملؔ
(پٹنہ)

عشق میں میں بھی بہت بدنام ہو کر رہ گیا — میرا تیرا ہر فسانہ عام ہو کر رہ گیا
گھر مرا ساحل پہ پھر بھی تشنگی دل میں مرے — دل تری محفل میں خالی جام ہو کر رہ گیا
تو ہی قاتل، تو ہی منصف، تو ہی سب کچھ ہے یہاں — میں تری الفت میں اک الزام ہو کر رہ گیا
چاند نکلا، تارے نکلے، پر نہ نکلا تو صنم — سونا سونا میرے گھر کا بام ہو کر رہ گیا
عشق میں تیرے گنوا دی میں نے اپنی زندگی — کیا سبب ہے پھر بھی میں ناکام ہو کر رہ گیا
وہ زمانہ اور تھا اب یہ زمانہ اور ہے — یہ سمجھ لو میں پکا سا آم ہو کر رہ گیا
کیا سناؤں داستاں بسملؔ تجھے اس رات کی — وصل کا قصہ خیالِ خام ہو کر رہ گیا

○

نوید سروشؔ
(میرپورخاص)

منظر رہا کبھی پسِ منظر نہیں رہا — ویسے بھی دوستوں سے میں چھپ کر نہیں رہا
کیا کر سکے گا آج بھلا مجھ کو در بدر — مجھ سے جو خانداں کبھی مل کر نہیں رہا
مجھ سے خفا ہوئے ترے دریا تو یہ ہوا — پہلے کی طرح جوشِ سمندر نہیں رہا
غیروں کا کیا ہے اپنے بھی اپنے نہیں رہے — جب اوج پر ہمارا مقدر نہیں رہا
سرگرداں آج ہے کوئی میرے لیے سروشؔ — جبکہ میں آج خود کو میسّر نہیں رہا

تسنیم کوثر

(لاہور)

رنگ بھرنا کبھی خاکوں میں کہانی لکھنا — داستاں غم کی کوئی یاد پرانی لکھنا
دیکھنا جو بھی سمو دینا اسے لفظوں میں — کبھی اوروں کی کبھی اپنی زبانی لکھنا
کھولنا جب کبھی گزرے ہوئے لمحوں کے کواڑ — صبح ارمان بھری شام سہانی لکھنا
پہلے رکھ دینا چراغوں کو سرِ راہگزر — پھر کسی بھٹکے مسافر کی کہانی لکھنا
کبھی رم جھم کبھی خوشبو تو کبھی بادِ نسیم — اس کے لہجے کو بہاروں کی جوانی لکھنا
یاد میں اُس کی جو تکیے کو بھگو دیتے ہیں — ان کو موتی ہی نہیں لعلِ یمانی لکھنا
درد اور پیار میں کیا رشتہ ہے اس کو بھی کبھی — دے جو مہلت تمہیں اشکوں کی روانی لکھنا
چند اشعار سے کیا ہو گی تسلی تسنیم — لکھنے بیٹھی ہو تو اب ساری کہانی لکھنا

○

ذکی طارق بارہ بنکوی

(اترپردیش)

جس کو دیکھو پڑی ہے خودی کی — فکر کب ہے کسی کو کسی کی
ساعت آئی ادھر رخصتی کی — اس طرف ہے گھڑی جاں کنی کی
تجھ کو مٹنے سے کیسے بچاؤں — تو نے سورج کی کیوں ہمسری کی
تیری آواز پر جان قرباں — جس میں تاثیر ہے نغمگی کی
میں ہوں مزدور مجھ کو پتہ کیا — جان جاناں ادا دلبری کی
مجھ کو آنسو مرے اور تم کو — ہو مبارک گھڑی یہ خوشی کی
اس کے چہرے کی ضو کے مقابل — کب چمک ٹھہر ی ہے چاندنی کی
اے مرے یار مر جاؤں گا میں — مجھ کو مت دے سزا بے رخی کی
کچھ بتا تو اے پردیسی میرے — کب تک امید ہے واپسی کی

○

احمد سراج فاروقی

(راجستھان)

میں چاہتا تھا اڑوں دور آسمانوں میں — کھنچے ہوئے تھے مگر تیر سب کمانوں میں
ڈرے ہوئے ہیں پرندے ہواؤں سے شاید — اسی لئے تو نہیں جوش اب اڑانوں میں
تلاش کرنی ہیں جن کو نء نء راہیں — وہ بیٹھ سکتے نہیں اس طرح مکانوں میں
اسی لئے تو مجھے تجھ پہ اعتبار نہیں — تضاد رہتا ہے اکثر تیرے بیانوں میں
جنہیں تھا حکم سفر کا ہر ایک لمحہ سراج — وہ چھپ کے بیٹھ گئے اپنے آشیانوں میں

○

سبیلہ انعام صدیقی

(کراچی)

کسی لہر کی مثل گر یہ کُناں سی اُداسی
لپٹ کر بہت روئی مجھ میں سمٹتی اُداسی

وہ اک زہر کی طرح پانی میں تحلیل ہوکر
نِگل لیتی ہے زیست سانسوں میں پھیلی اُداسی

فضا نغمگی ہُو یا شہنائی بجنے لگی ہُو
عَجب سکتے مِیں رہتی ہے ذہن ودل کی اُداسی

تھکن کس سفر کی اُتر آئی ہے روح مِیں اب
یہ کس شعلے کی زد مِیں ہے تپتی ,جلتی اُداسی

وہ رقصاں نظر آئے ایسے ہواؤں مِیں شب بھر
ذُروں مِیں جلے بن کے اک موم بتّی اُداسی

بدلنے سے کب پیرہن ,دل کا منظر ہے بدلا
وہی سوگ ,بے چینی اور اُس میں پلتی اُداسی

یہ کس موسَمِ غم مِیں ہے اتنی سلگی سبیلہ
تڑپتی , برستی , مچلتی , بِلکتی اُداسی

○

احمد سوز

(ممبئی)

پل میں بگڑ نے لگتاہوں
پل میں اکھڑنے لگتاہوں

مدِ ّ مقابل کوئی نہ ہو تو
خودسے جھگڑنے لگتاہوں

خود کو منوانا ہو جب بھی
جھوٹ پہ اڑنے لگتاہوں

اوبڑ کھابڑ ہیں رستے
گرنے پڑ نے لگتا ہوں

ڈرجاتا ہوں آئینے سے
خود میں گڑنے لگتاہوں

ہاتھ اگر لگ جائے دنیا
تب بھی اکڑنے لگتاہوں

جیسے جیسے گئی جوانی
سوز * سکڑنے لگتا ہوں

○

سحرتاب رومانی

(کراچی)

رہنا ہوا محال جو اوپر زمین کے
چپ چاپ میں چلا گیا اندر زمین کے

میرا خیال اور غزل ہے مری نئ
بس قافیے اور ردیف ہیں بنجر زمین کے

زخموں سے چُور چُور مری اب کدال ہے
مجھ سے نکل نہیں رہے پتھر زمین کے

پھر آسمان مجھ پہ اچانک برس پڑا
میں سانس گن رہا تھا برابر زمین کے

وہ ہم سے کیا کریں گے وسائل پہ گفتگو
جو لوگ پی گئے ہیں سمندر زمین کے

آبائی شہر ہے مرا یہ شہرِ عشق تو
ہم لوگ ہیں یہاں کے،اسی سرزمین کے

یا پھر اُسی یقین سے یہ زندگی گزار
یا پھر سحر نکل کہیں باہر زمین کے

○

زہریلاانسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یوایس اے)

قسط......۲۷

غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ خیمے میں داخل ہوتے ہی مجھے مناسہ کی خوشبو آئی تھی۔مناسہ کی یہاں موجودگی کا مطلب تھا کہ ڈالیا کے بارے میں میرا قیاس ٹھیک تھا۔اور یہ اس بات کی دلیل بھی تھا کہ وہ ڈالیا کو کچھ دان کرنے والی تھی۔بنوں بی بی نے بھی مجھے یہاں اسی لیے بجھوایا تھا اور یہ معمہ مجھے ہی حل کرنا تھا۔کیسے؟ میرے پاس اس سوال کا ابھی تک کوئی جواب نہیں تھا۔مناسہ دیوی کون ہے؟ ڈالیا کی آواز نے مجھے خیالات کی دنیا میں زیادہ دیر تک نہیں رہنے دیا تھا۔میں نے جواب دیا، مناسہ سانپوں کی دیوی ہے۔ساری دنیا کے سانپ اس دیوی کی امان میں رہتے ہیں۔سانپ اس کے حکم سے کاٹتے ہیں اور اس کے حکم سے سانپ کاٹے کی شفا ملتی ہے۔وہ جس کو چاہے سانپوں کا گیان دان کرتی ہے۔اس کی روح کسی ایک شیش ناگن میں ہوتی ہے۔اسی وجہ سے سانپوں کو عمومی طور پر اور شیش ناگنوں کو خصوصی طور پر پوجا جاتا ہے۔مناسہ ہر تین سو سال بعد انسانی روپ میں آتی ہے۔دنیا بھر کے جوگی، سنیاسی، سپیرے اور شمان اس کے ایک درشن کے لیے اپنا جیون تیاگ دیتے ہیں۔ساون کی ناگ پنچمی میں آنے والے سنیاسی، جوگی، سپیرے اور شمان اس امید پر ناگ پنچمی میں شرکت کرتے ہیں کہ شاید انہیں مناسہ کے درشن نصیب ہو جائیں۔شیش ناگنیں اس میلے میں اسی سبب زائرین کی توجہ کا مرکز ہوتی ہیں۔وہ جس کو چاہے اپنے درشن دیتی ہے۔ویسے آج تک اُس کے درشن کا دعویدار فی زمانہ کوئی نہیں ہے۔

اس نے حیرت سے پوچھا، اگر آج تک اس کے درشن کا کوئی دعویدار نہیں تو آپ اس کی تصویر دیکھ کر کیسے پہچان گئے ۔ مجھے اس کے درشن نصیب ہوئے تھے۔میں نے اپنا مختصر جواب دیتے ہوئے کہا۔ابھی آپ کے خیمے میں داخل ہوتے ہی میں نے اس کی خوشبو سونگھی تھی۔اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا، آج صبح اٹھی تو مجھے یہ کینوس ہلتا ہوا لگا۔یہ خوشبو میں نے آج صبح اسی لمحے محسوس کی تھی۔جب میں نے کینوس کو اٹھایا تو یہ مجھے وزنی لگا اور پھر ایسے لگا جیسے یہ کسی نے میرے ہاتھ سے چھین لیا ہو۔پھر یہ زمین پر گر پڑا۔میں نے اسے اٹھایا تو اس پر یہ تصویر موجود تھی۔تصویر دیکھ کر میں ڈر گئی اور اسی ڈر کی وجہ سے بخار آ گیا۔آپ اس خوشبو میں گہرے سانس لیں تو کا ڈر بھی جاتا رہے گا اور آپ کا بخار بھی اُتر جائے گا۔پھر میں نے کہا، آپ بھاگیہ ہیں کہ یہ دیوی آپ پر مہربان ہے اور اس نے آپ پر اپنی خوشبو نچھاور کی ہے۔جوگی اس خوشبو کے لیے دہائیوں کی تپسیا کرتے ہیں۔میری بات سن کر اس کا خوف کسی قدر کم ہوا جس کے ساتھ اس کا بخار بھی ہلکا ہونے لگا اور اس کے چہرے کی سرخی بھی جاتی رہی۔کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ دیوی مجھ پر کس وجہ سے مہربان ہے؟ اس نے توانا آواز میں پوچھا۔اس کی آواز میں توانائی اس کی بحالی صحت کی علامت تھی۔میں نے جواب دیا، وجہ تو معلوم نہیں ہے۔دیوتاؤں کے انداز نرالے ہوتے ہیں۔وہ جسے چاہتے ہیں، جو چاہتے ہیں اور جب چاہتے ہیں دان کرتے ہیں۔کسی کو مانگے بنا دیتے ہیں، کسی کو سالوں کی تپسیا کے بعد کچھ دیتے ہیں اور کسی کو تپسیا کے باوجود نہیں دیتے۔جس دن ہمارے پاس اس کیوں کا جواب ہوگا اس دن انسانی تاریخ میں ایک اور انقلاب آئے گا۔

ڈالیا نے پوچھا، کیا میں آپ سے چند ذاتی سوال پوچھ سکتی ہوں؟ جی پوچھیئے، میں نے جواب دیا۔میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتی ہوں کہ حقیقتاً کون ہیں؟ کیا آپ انسانوں کے روپ میں کوئی دیوتا ہیں؟ اس نے پوچھا تو میں نے جواب دیا، نہیں! میں ایک عام سا انسان ہوں۔تو پھر سانپ آپ کا کہنا کیوں مانتے ہیں؟ یہ دیویاں آپ کو اپنے درشن کیوں کراتی ہیں اور اتنے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود آپ جوگیوں کے ڈیرے پر کیوں رہتے ہیں؟ اس نے ایک ساتھ اتنے سارے سوال کر ڈالے تو میں نے جواب دیا، مجھے یہ معلوم نہیں کہ دیویاں مجھے اپنے درشن کیوں کراتی ہیں اور اگر میں آپ کو بتاؤں کہ میں یہ سب کچھ دیوئیوں کی ایما پر ہی کر رہا ہوں تو کیا آپ کو میری بات کا یقین آئے گا؟ میں نے پوچھا۔جی ہاں! ڈالیا بولی تو میں نے کہا، تو بس یہی سمجھیں۔اتنا مختصر جواب؟ اس نے پوچھا تو میں نے جواب دیا، جی ہاں۔میرے پاس اس سے زیادہ جواب نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں آپ کو اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا اور اس میں میری کسرِ نفسی کا بھی کوئی دخل نہیں ہے۔اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ مین خود بھی آپ کی طرح لاعلم ہوں۔اگر میں کہوں کہ یہ سب کچھ مجھ سے کروایا جا رہا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔میں بنوں بی بی کے حکم پر سندر بن میں تھا اور مناسہ مجھے یہاں لائی ہے۔بنوں بی بی کون ہے؟ اس نے پوچھا تو میں نے اسے بنوں بی بی کا مختصر سا تعارف کروایا تو وہ بولی، آپ کی باتوں نے مجھے خوف سے نکال کر متجسس کر دیا ہے۔

پھر کہنے لگی، ڈر کم ہوا تو اب مجھے ناشتے کی طلب ہو رہی ہے۔آپ بیٹھیں، میں آپ کے لیے باورچی سے کچھ بنا کر لانے کو کہہ آتا ہوں۔میں یہ کہہ کر اٹھا تو وہ بولی، نہیں آپ میرے پاس رہیں۔میں نے جواب دیا، اگر میں آپ کے پاس بیٹھوں گا تو پھر ناشتہ کون لائے گا؟ میں چند لمحوں کے لیے جا کر ناشتے کا کہہ آتا ہوں۔پھر آپ کے پاس سے نہیں ہٹوں گا۔اچھا تو پھر میں ہاتھ منہ دھو کر دانت صاف کرنے کے بعد کپڑے تبدیل کرتی ہوں، ڈالیا نے میرا ہاتھ چھوڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔میں اٹھ کر باورچی خانے والے خیمے میں گیا اور باورچی سے ڈالیا کے خیمے میں ناشتہ لانے کو کہا۔پھر ڈالیا کے خیمے سے باہر جان بوجھ کر کچھ وقت کھڑا رہا تا کہ وہ اپنی ضروریات سے نمٹ لے۔ایسے میں باورچی ناشتہ لایا تو میں نے

اس کے ہاتھوں سے لے کر کہا تم جاؤ میں ناشتہ اندر لے جاتا ہوں۔ ٹرے اٹھائے اندر گیا تو ڈالیا کنگھی کر رہی تھی۔ بولی، آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی۔ میں نے جواب دیا، زحمت کی کوئی بات نہیں۔ مجھے دوسروں کی خدمت کر کے خوشی ہوتی ہے۔ ایسے میں سٹیوٹینٹ میں داخل ہو کر ڈالیا سے بولا، سانپوں کے چکر میں میں بھول گیا تھا کہ تمہاری ماں آج سہ پہر امریکہ سے دلی پہنچ رہی ہے اور اسے لینے جانا ہے۔ پھر میری جانب دیکھ کر بولا، سریت نے مجھے بتایا ہے کہ تم گاڑی چلانا جانتے ہو۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ تم ڈالیا کے ساتھ جا کر اس کی ماں کو دلی کے ہوائی اڈے سے لے آؤ؟ جی ہاں، میں نے جواب دیا۔ وہ میرا شکریہ ادا کر کے جاتے ہوئے بولا، سانپوں نے ہمارے دو دن ضائع کر دئے ہیں۔ تمہاری واپسی تک ہم کافی کام نمٹا لیں گے۔ میں نے اٹھتے ہوئے ڈالیا سے کہا، میں اپنے خیمے میں بیٹھ کر آپ کا انتظار کرتا ہوں۔ آپ ناشتہ کرنے کے بعد سفر کے لیے تیار ہو کر آ جائیں۔ اپنے خیمے میں آ کر میں نے جین اور شرٹ پہنی اور وہیں بیٹھ کر ڈالیا کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی منٹ بعد ڈالیا بھی تیار ہو کر آئی اور بولی، آپ کے بارے میں ہر روز کوئی نہ کوئی نئی اور خاص بات سننے کو ملتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ گاڑی چلانا بھی جانتے ہیں۔ میں نے اٹھ کر چلتے ہوئے جواب دیا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ گاڑی چلانے کا شمار خاص باتوں میں ہوتا ہے۔ وہ بولی، کسی اور کے لیے شاید نہ ہو لیکن سندر بن کے شمان کے لیے ضرور ہے۔ جیپ میں بیٹھ کر میں نے ڈالیا سے کہا، اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ سے چند ذاتی سوال پوچھوں؟ وہ مسکرا کر بولی، میری معلومات کے مطابق تو شمان لوگ کسی سے کوئی سوال نہیں پوچھتے پھر آپ کیوں پوچھنا چاہتے ہیں؟ معافی چاہتا ہوں، اب نہیں پوچھوں گا، میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا تو ڈالیا مسکراتے ہوئے جلدی سے بولی، ارے آپ تو خفا ہو گئے میں تو مذاق کر رہی تھی۔ دراصل اب تک تو میں ہی آپ پر سوالات کی بوچھاڑ کرتی رہی ہوں اور آپ نے اب تک مجھ سے میرے بارے میں ایک بھی سوال نہیں کیا اور میں سوچ رہی تھی کہ کیا آپ مجھ سے میرے بارے میں کبھی کچھ پوچھیں گے یا مجھے آپ کو اپنے بارے میں خود ہی بتانا پڑے گا۔ مجھے یہ جان کر اچھا لگا کہ آپ کو میرے بارے میں کچھ جاننے کی جستجو ہے۔ ورنہ میں تو سمجھی تھی کہ آپ کو میری ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔

میں اسے یہ نہ بتا سکا کہ میں برصہ اور مناسہ کی وجہ سے اس سے ذاتی سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہا، بات پرواہ کی نہیں۔ دراصل مصروفیات کی وجہ سے مجھے کچھ پوچھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ہاں یہ بات تو ہے، وہ بولی۔ پھر ہنس کر کہنے لگی، دراصل میں بے صبری ہوں۔ جتنا میں آپ کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں اس سے کئی گنا آپ کو اپنے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔ چلیں تو پھر بتائیں۔ ہمارا سفر اچھا کٹ جائے گا، میں نے کہا تو ڈالیا بولی، میں امریکہ کی ریاست یوٹا کے سالٹ لیک شہر میں پیدا ہوئی تھی۔ اگرچہ ہم مذہباً مورمن ہیں لیکن میں نے کبھی اپنے مذہب کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ پانچ سال کی تھی جب میرا والد گاڑی کے ایک حادثے میں فوت ہو گیا۔ کوئی دس سال پہلے میری ماں نے دوسری شادی کی تھی۔ سٹیو میرا سوتیلا باپ ہے۔ اس کی وجہ سے ہم کیلی فورنیا میں رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے مجھے آثارِ قدیمہ سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ایک برس ہوا سٹیو کو یہاں کھدائی کا پرمٹ ملا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسی بہانے اپنا ماسٹر تھیسس مکمل کر لوں گی اور دنیا بھی دیکھ لوں گی۔ مجھے یہاں آئے ابھی چند ہفتوں سے زیادہ نہیں ہوئے۔ پہلے دو ہفتے تو یہاں افسردگی اور بوریت سے کاٹے۔ اسی وجہ سے میں نے بغیر تھیسس مکمل کیے واپسی کا پروگرام بنا لیا تھا اور ہندوستان آنے کے دوسرے ہفتے واپس بھی چلی گئی ہوتی اگر میری ممی نے ہندوستان نہ آنا ہوتا۔ میں اپنی ممی کی وجہ سے رک گئی اور میری واپسی کی ٹکٹ بھی ممی کے ساتھ بک ہے۔ آپ کی آمد نے گویا مجھے یہاں رہنے کا بہانہ دیا ہے، اب میں ممی سے کہہ دوں گی کہ میں اپنا تھیسس مکمل کرنے کے بعد ہی واپس جاؤں گی۔ کیا آپ کا ہندوستان سے کسی قسم کا کوئی تعلق ہے؟ میں نے پوچھا تو اس نے جواب دیا، آپ سے متعارف ہونے سے پہلے کوئی تعلق نہیں تھا اگر اب ہے تو وہ صرف آپ کی وجہ سے۔ لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟

میں سوچنے لگا کہ اگر اس کا ہندوستان سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر برصہ نے ڈالیا سے اس قدر اپنائیت کیوں دکھائی ہے۔ کیا ڈالیا کے بارے میں میرا قیاس غلط تھا؟ نہیں! اگر میرا قیاس غلط ہوتا تو کالی سے میرا پیغام سن کر برصہ مطمئن نہ ہو گئی ہوتی۔ اور اگر برصہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر ڈالیا نے برصہ کو سپنے میں اپنے گھر والوں کے بیچ بیٹھے کیوں دیکھا تھا؟ کیا یہ سپنا اس کے ذہن کے اختراع تھا؟ میں نے اپنے خیال کی تردید کرتے ہوئے سوچا، سپنا ڈالیا کے ذہن کی اختراع نہیں تھا۔ مناسہ نے بھی ڈالیا کو اپنی موجودگی سے خواہ مخواہ آگاہ نہیں کیا تھا۔ آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا، ڈالیا کی آواز نے مجھے چونکا دیا تو میں نے کہا، ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ دراصل دنیا کے خطرناک سانپ نے ہندوستان میں جس انداز سے آپ کی پذیرائی کی ہے اور مناسہ نے آپ پر اپنی موجودگی ظاہر کی ہے تو مجھے خیال گزرا تھا کہ شاید آپ کا ہندوستان سے کسی قسم کا تعلق رہا ہے۔ میرے خیال کے مطابق تو یہ سب کچھ آپ کے بھاگوں ہوا ہے، ڈالیا نے مجھے دیکھتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا تو میں نے کہا، مجھ میں ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے جو مناسہ دیوی کو آپ کے خیمے میں لے آئے اور خطرناک سانپ کو آپ کی گود میں۔ آپ یہ سب کچھ تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن مجھے یقین ہے کہ مناسہ دیوی نے آپ کی صورت میں مجھے ایک ایسا تحفہ دیا ہے جس کا تصور میں امریکہ میں رہ کر نہیں کر سکتی تھی، ڈالیا کی معنی خیز مسکراہٹ کو نظر انداز کر کے میں نے پوچھا، آپ مجھے اچھی طرح سوچ کر بتائیں کہ اگر آپ کا نہیں تو کیا آپ کے خاندان کے کسی فرد کا یا آپ کے اجداد کا ہندوستان سے کبھی کوئی تعلق رہا ہے؟

کچھ دیر سوچ کر ڈالیا نے بڑے اعتماد سے نہیں میں جواب دیا تو میں

نے باتوں کا رخ موڑتے ہوئے کہا، میری آپ سے ایک گزراش ہے۔ وہ کیا؟ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اپنی ممی سے میرا تعارف میرے نام کی حد تک کروائیں، میں نے کہا۔ آپ آخر اپنے بارے میں اتنی کسرِ نفسی سے کام کیوں لیتے ہیں؟ ڈالیا نے تنک کر پوچھا تو میں نے جواب دیا، بات کسرِ نفسی کی نہیں، دراصل میں اپنے بارے میں سنبھل کر بات کرتا ہوں۔ فکر نہ کریں، میں انہیں آپ کے بارے میں وہ کچھ بتاؤں گی جو مجھے معلوم ہے، ڈالیا نے کہا۔ جی اچھا، میں نے جواب دیا۔

باتوں کے دوران ہم دلی ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ ائیر پورٹ پر ڈالیا کی ماں کے ساتھ اس کی نانی بھی اتری تھی۔ ڈالیا کی ماں کا نام کیری اور اس کی نانی کا نام روزی تھا۔ سفر کی تھکاوٹ سے دونوں کا برا حال تھا۔ ڈالیا نے ان سے میرا تعارف میرے نام کی حد تک کروایا۔ ہم گاڑی میں ان کا سامان رکھ کر بیٹھے تو میں نے ان سے پوچھا، ہمارا اگلا سفر کئی گھنٹوں کا ہے۔ اگر آپ لوگ کچھ کھانا یا کچھ دیر آرام کرنا چاہیں تو مجھے بتا دیں۔ روزی بولی، ہوائی جہاز کی خوراک نے میرا معدہ چوپٹ کر دیا ہے۔ اب میں زندگی بھر کچھ نہیں کھاؤں گی۔ کیری بولی، میں بھی کچھ نہیں کھاؤں گی اور آرام بھی اپنی آخری منزل پر جا کر ہی کروں گی۔ واپسی کے سفر میں دونوں جیٹ لیگ کی وجہ سے اونگھنے لگیں تو ڈالیا اور میں ان کی نیند میں مخل نہ ہونے کی وجہ سے خاموش رہے۔ شام کو آٹھ بجے ہم واپس پہنچے۔ میں تھکاوٹ کی وجہ سے اپنے خیمے میں جا کر کپڑے بدلنے کے بعد سو گیا۔

صبح سویرے سریت مجھے ناشتے پر بلانے آیا تو میں نے ناشتہ نہ کرنے کی معذرت کر دی۔ دراصل میں ڈالیا اور برصہ کے تعلق کے بارے میں کچھ دیر سوچنا چاہتا تھا۔ سریت کے جانے کے بعد میں نے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا، دانت صاف کیے اور شیو کرنے کے بعد کپڑے پہن کر اپنے خیمے میں بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا کہ میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے؟ میں یا جینا اور اکرام اپنے پیاروں کے بارے میں بالکل انجان تھے لیکن ڈالیا اپنے ماضی سے پوری طرح باخبر تھی۔ ڈالیا کی کہانی سن کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اسے اپنے خاندان کی ساری تاریخ کا علم تھا۔ ڈالیا کو اپنی پیدائش تو کیا اپنی حقیقی ماں اور نانی تک کی پیدائش اور جائے پیدائش کا علم تھا۔ اس کی معلومات کے مطابق اس کی پچھلی نسلوں کا بھی ہندوستان سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر اس کا ہندوستان سے کوئی تعلق ہوتا تو وہ اپنے پرکھوں سے سُن چکی ہوتی۔ جس کا واضح مطلب تھا کہ مجھے اس کی جانب سے مزید کسی قسم کی معلومات یا مدد ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ آخر بنوں بی بی اور مناسہ میرے توسط سے اسے کیا اور کیوں دینا چاہتے ہیں؟ اور میں اس بھید کو کس کی مدد سے حل کروں گا؟ اگر برصہ کا ڈالیا سے کسی جنم کا خونی رشتہ نہیں ہے تو پھر اس کا کس قسم کا تعلق ہے اور وہ یہاں کب سے اور کیونکر اس کی منتظر تھی؟ میں جلدی سندر بن واپس جانا چاہتا تھا لیکن برصہ سے کیے ہوئے وعدے کی وجہ سے رُکا ہوا تھا۔ کاش میں برصہ کی زبان سمجھتا اور کسی طرح اس سے یہ سب کچھ پوچھ لیتا اور پھر یہ عقدہ حل کر کے اپنی راہ لیتا۔ لیکن یہ سب کچھ میرے یا کسی اور کے بس میں ہی کہاں تھا۔ اب تک کے حالات مجھے خود کو ایک بار پھر وقت کے دھارے پر چھوڑنے کا کہہ رہے تھے۔

اسی سوچ کے دوران مجھے اپنے ماتھے پر ایک نرم ہاتھ محسوس ہوا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ڈالیا میرے سرہانے کھڑی مجھے متفکر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسے بھی بیٹھنے کو کہا۔ آپ اتنی سنجیدگی سے کیا سوچ رہے تھے، اس نے مجھے آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔ میں آپ کے بارے میں سوچ رہا تھا، میں نے جواب دیا تو اس نے تجسس سے پوچھا، میرے بارے میں؟ وہ پہلے مسکرائی پھر سنجیدہ ہو کر بولی، آپ میرا دل رکھنے کے لیے تو یہ نہیں کہہ رہے ہیں؟ نہیں میں واقعی آپ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مناسہ اور برصہ کی تفصیل میں جانے کی بجائے میں نے سنجیدگی سے جواب دیا تو اس نے چارپائی پر میرے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا، آپ ناشتے پر نہیں آئے تو مجھے فکر ہوئی، آپ ٹھیک تو ہیں نا؟ جی ہاں، میں نے جواب دیا۔ ناشتہ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اس لیے نہیں آیا۔ پھر بولی، ممی اور نانی جیٹ لیگ کی وجہ سے ابھی تک سوئی ہوئی ہیں اس لیے میں آپ کے پاس چلی آئی ہوں۔ پھر کچھ ٹھہر کر کہنے لگی، میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو تم کہا کروں۔ آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟ نہیں۔ اس کے برعکس مجھے خوشی ہو گی، میں نے جواب دیا تو ڈالیا بولی، سٹیو اور جان نیچے کھدائی میں مصروف ہیں۔ سٹیو کہہ رہا تھا کہ یہاں کھدائی کا کام جلد ختم ہو جائے گا اور پھر ہم کھدائی کے لیے کسی اور شہر جائیں گے۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے نا؟ لگتا تو کچھ ہے، میں نے جواب دیا۔ اور اس کے بعد؟ ڈالیا نے مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اپنا کام ختم کرنے کے بعد سندر بن واپس چلا جاؤں گا، میں نے جواب دیا۔ اگر میں تمہیں واپس سندر بن نہ جانے دوں تو؟ اس نے نشیلی نگاہوں سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ تجربات نے مجھے سکھایا ہے کہ جیون کی شطرنج کے کھیل میں ہم فطرت کے ایسے مہرے ہیں جو نہ اپنی مرضی کی چال چل سکتے ہیں اور نہ اپنی مرضی سے سوچ سکتے ہیں۔ آنے والا کل تو بہت دور کی بات ہے، ہمیں تو یہ بھی علم نہیں کہ آنے والا لمحہ ہمارے لیے کیا لائے گا۔ اس لیے وعدے وعید کی بجائے ان باتوں کو آنے والے وقت پر چھوڑ دیا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا، میں نے جواب دیا۔ چلو ٹھیک ہے، وہ بولی۔ پھر اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہنے لگی، اچھا ذرا میرے ساتھ بازار تک چلو مجھے کچھ خریدنا ہے۔ چلو، میں بھی کھڑا ہو گیا۔ ہم جیپ نکال کر بازار گئے۔ ڈالیا نے اپنی ماں اور نانی کے لیے کھانے کے بند ڈبے خریدے۔ سہ پہر کو واپس آئے تو کیری اور روزی جاگ چکے تھے اور خیمے کے باہر کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ میں ان سے سرسری سلام دعا کر کے ڈالیا کو ان کے پاس چھوڑ کر اپنے خیمے میں جا کر مراقبہ کرنے لگا۔

مراقبہ ہی میری بوریت کا سب سے بڑا تدارک تھا۔ اس کی ایک وجہ

تو یہ تھی کہ میں خود کو ڈالیا اور برصہ کے تعلق کی سوچ سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ جب میں نے مراقبہ توڑا تو دن ڈھل چکا تھا اور خیمے کے باہر اندھیرا چھا چکا تھا لیکن خیمے کی بتی جل رہی تھی۔ شاید کسی نے آ کر جلا دی ہوگی۔ سوچا کہ اب موقع ہے ذرا کالی اور برصہ کی خبر لے آؤں۔ شاید ان سے کچھ معلوم ہو سکے۔ خاموشی سے باہر نکل کر ابھی دو قدم بھی نہیں چلا تھا کہ پیچھے سے ڈالیا کی آواز آئی، میں اب تک تمارے خیمے کے کئی چکر لگا چکی ہوں۔ جب بھی گئی تمہیں مراقبے میں غرق پایا اور چپکے سے لوٹ آئی۔ نہ جانے تم اتنے شوروغل میں لمبے مراقبے کیسے کرتے ہو؟ بس عادت ہو گئی ہے، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کے لیے رُک کر جواب دیا۔ کہاں جا رہے ہو؟ اس نے پوچھا تو میں نے جواب دیا، کالی اور برصہ کی خبر لینے جا رہا ہوں۔ چلو میں بھی چلتی ہوں۔ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی، ذرا ٹھہرو۔ ممی اور نانی کو ساتھ لے لیں۔ میں ان کی موجودگی میں برصہ کو پیار کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے جب انہیں برصہ کے بارے میں بتایا تو انہیں میری بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ سمجھیں کہ شاید میں ان سے مذاق کر رہی ہوں۔ کیا تم نے انہیں برصہ کے متعلق بتایا ہے؟ میں نے حیرت سے پوچھا اور پھر کہا، لیکن تم نے تو مجھ سے یہ راز اپنے تک رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ اوہ، مجھے افسوس ہے۔ اسے جیسے مجھ سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا۔ دراصل میرے خیال کے مطابق اس وعدے کا اطلاق سٹیو اور جان پر ہوتا تھا۔ کاش تم مجھے پہلے بتا دیتے، ڈالیا واقعی سنجیدگی سے بولی۔ میں نے کہا، سانپ کوئی کھیل تماشہ نہیں ہیں کہ لوگوں کو دکھائے جائیں۔ اور سانپ بے پیر جانور ہیں۔ معلوم نہیں کسی اور کے سامنے بگڑ کر تمہیں یا ان کو کوئی نقصان پہنچا بیٹھیں۔ ہاں یہ بات تو ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے بلا سوچے سمجھے بات آگے بڑھا دی۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ اس نے سنجیدگی سے پوچھا تو میں نے جواب دیا، کچھ نہیں، منہ سے نکلے ہوئے الفاظ اب واپس آنے سے تو رہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ انہیں کہہ دو کہ تم نے واقعی مذاق کیا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر کہا، میرے خیال میں سچ کو چھپانے کے لیے اب خواہ مخواہ جھوٹ گھڑنے کی ضرورت نہیں، جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔

یہ کہہ کر میں واپس اپنے خیمے کی جانب مڑا تو وہ بولی، کیا تم مجھ سے خفا ہو کر واپس جا رہے ہو؟ نہیں، میں نے جواب دیا۔ اپنے خیمے سے ٹارچ لینے جا رہا ہوں۔ ٹارچ لے کر ہم دونوں دارا کے کمرے میں داخل ہوئے تو کمرے سے تمام آثارِ قدیمہ ہٹا دئے گئے تھے اس لیے اب وہ جگہ صاف تھی۔ میں نے اندر جا کر کالی اور برصہ کو پکارا لیکن دونوں کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ ہم وہاں کچھ دیر تک کھڑے ان کا انتظار کرتے رہے۔ وہ نہیں آئے تو ہم اوپر آ گئے۔ ڈالیا کو اداس دیکھ کر میں نے واپسی پر اسے کہا، اب تم خود ہی دیکھ لو۔ اگر تمہاری ماں اور نانی یہاں آتیں تو ان کی موجودگی میں تم اور زیادہ دل برداشتہ ہوتیں۔ وہ بولی، ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ ڈالیا کے خیمے کی بتی جل رہی تھی اور اندر سے اس کی نانی اور ماں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ڈالیا بولی، میری ماں اور نانی جیٹ لیگ کی وجہ سے سارا دن سو کر ساری رات جاگیں گی۔ چلو تم گھر والوں کے ساتھ وقت گزار اور میں اپنے خیمے میں چلتا ہوں، میں یہ کہہ کر مڑا ہی تھا کہ خیمے کے اندر روزی کی آواز آئی تم ہمارے ساتھ کچھ وقت نہیں گزارو گے نوجوان؟ میں مسکراتا ہوا پلٹا اور ڈالیا کے ساتھ خیمے میں داخل ہو کر بولا، کیوں نہیں۔ ڈالیا کے خیمے میں دو چار پائیاں رکھی تھیں۔ شاید اس کی نانی نے یہاں سونا تھا۔ میں ڈالیا کے بستر پر ان کے سامنے ڈالیا کے پاس بیٹھا تو روزی نے کہا، بھئی معاف کرنا، لمبے ہوائی سفر کے بعد ہمیں دلی سے یہاں تک تو اپنا ہوش بھی نہیں تھا اس لیے ڈھنگ سے تمہارا شکریہ تو کیا تم سے ٹھیک سے متعارف ہونے کا موقع بھی نہیں ملا۔ سب سے پہلے تو ہمیں ایئر پورٹ سے یہاں لانے کا شکریہ۔ جب تم مراقبہ کر رہے تھے تو ڈالیا ہمیں تمہارے خیمے میں یہ دکھانے کے لیے لے گئی کہ تم کتنے لمبے اور گہرے گہرے مراقبے کرتے ہو۔ کیری نے گرہ لگائی اور سٹیو نے ہمیں تمہاری سانپوں کی کاٹ پر حیرت انگیز علاج کی کہانی بھی سنائی ہے۔ جان کی نظروں میں تم سانپوں کے گرو ہو۔ روزی نے بات آگے بڑھائی اور ہاں تم مجھے اپنی بین بھی ضرور سنانا، سریت کہہ رہا تھا کہ تمہاری بین میں ایک عجیب سوز ہے۔ مجھے پُرسوز موسیقی پسند ہے۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں ہر منہ سے تمہارا قصیدہ اور ہر فرد سے تمہاری توصیف کے علاوہ کچھ نہیں سنا۔ یہ تمہاری شخصیت کا اثر ہے کہ لوگوں کی باتیں سن کر میں تمہاری گرویدہ ہو گئی ہوں۔

شکریہ، میں نے کہا۔ ڈالیا میرے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھی تھی۔ میری جانب دیکھ کر بولی، تمہاری ساری کسرِ نفسی دھری کی دھری رہ گئی ہے۔ اب تم خود ہی دیکھ لو، سٹیو اور جان نے انہیں تمہارے بارے میں مجھ سے زیادہ بتایا ہے۔ کیری نے ڈالیا سے پوچھا، کاہے کی کسرِ نفسی؟ ڈالیا نے جواب دیا، کچھ نہیں، یہ اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی کسرِ نفسی سے کام لیتا ہے۔ پہلے تو اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاتا۔ اگر بتاتا ہے تو بہت ہی مختصر۔ روزی جذباتی لہجے میں بولی، اتنی کسرِ نفسی کیوں نوجوان؟ تمہیں تو اپنے اندر کی صلاحیتوں کی تشہیر کرنی چاہیے۔ انسانی صلاحیتوں کی تشہیر دراصل خالق کی تشہیر ہوتی ہے۔ کہ دیکھو لوگو، بنانے والے نے مجھے ایسے ایسے گنوں اور کمالات سے نوازا ہے۔ اگر مجھ میں تم جیسی کوئی ایک صلاحیت بھی ہوتی تو میں دنیا کے ہر فرد تک یہ خبر پھیلاتی۔ پھر بولی، ہمارے ہاں لوگ معمولی سے معمولی خوبی کو لاکھوں گنا بڑھا چڑھا کر دنیا میں بیان کرتے پھرتے ہیں۔ کیری بولی اور ہاں، تم ہمیں ڈالیا کی دوست ناگن سے کب ملواؤ گے؟ بھئی میں تو ایسے سانپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جس نے میری بیٹی کا بوسہ لیا ہے۔ روزی میری جانب اشارہ کر کے بولی، کیا وہ سانپ میرا بوسہ بھی لے گا؟ پھر ہنس کر بولی، میری عمر میں کسی کا بوسہ نصیب ہو جانا، خواہ وہ سانپ ہی کیوں نہ ہو، کسی غنیمت سے کم نہیں ہوتا۔

اچھا ہوا کہ وہ مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کرنے کی بجائے خود ہی باتیں کرتی جا رہی تھیں اس لیے مجھے اپنی طرف سے ان کی تصدیق یا تردید میں

کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی اس لیے خاموشی سے بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا۔ پاس بیٹھی ہوئی ڈالیا اپنے گلے میں پڑے لاکٹ کی زنجیر سے کھیل رہی تھی۔ میں نے غور سے لاکٹ دیکھا تو مجھے حیرت ہوئی۔ لاکٹ پر اللہ کندہ تھا۔ میں نے آج سے پہلے یہ لاکٹ تمہارے گلے میں نہیں دیکھا تھا۔ یہ تم نے کہاں سے لیا ہے؟ میں نے لاکٹ کی جانب ہاتھ بڑھا کر ڈالیا سے پوچھا۔ یہ ہمارا خاندانی لاکٹ ہے جو مجھے نانی نے آج صبح تحفتاً دیا ہے، ڈالیا نے روزی کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ تمہیں معلوم ہے اس پر کیا لکھا ہے؟ میں نے ڈالیا سے پوچھا۔ ڈالیا کی بجائے روزی بولی، ہاں مجھے معلوم ہے کہ اس پر اللہ لکھا ہے۔ یہ لاکٹ آپ کے پاس کہاں سے آیا؟ اس بار میں نے روزی سے سوال کیا۔ میرے والد نے یہ خاندانی لاکٹ مجھے میری شادی پر تحفے کے طور پر دیتے ہوئے کہا تھا کہ لاکٹ اس کے والد کا یعنی میرے دادا کا تھا۔ آپ کے دادا؟ کیا آپ کے دادا مسلمان تھے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ اس کا تعلق ہندوستان سے ضرور تھا۔ کیا؟ میں نے اور ڈالیا نے حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر بیک زبان ہو کر پوچھا۔

نانی جان، آخر آپ نے مجھے اپنی خاندانی تاریخ کے بارے میں آج سے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟ ڈالیا نے حیرت سے پوچھا تو روزی جذباتی لہجے میں بولی، تم نے اپنی پچیس سالہ زندگی میں اور تمہاری ماں نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں اپنے اجداد کے بارے میں مجھ سے کبھی کچھ پوچھنے کی کوشش ہی نہیں کی تو میں بھلا بن پوچھے کیوں بتاتی؟ آج کی نسلوں کو اپنے علاوہ کسی کی فکر ہی کب ہے۔ پرانے کو تو چھوڑو تمہیں تو اپنے نانا کا نام تک نہیں معلوم اور نہ ہی تم نے کبھی ان کا نام یہ ان کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی ان کے بارے میں مجھ سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنے باپ کے پاس گھنٹوں بیٹھ کر اپنے خاندان کے بارے میں سوالات پوچھا کرتی تھی۔ یہ تو اس نوجوان نے پوچھا اور میں نے بتا دیا۔ ڈالیا کے چہرے پر خجالت دیکھ کر روزی بولی، میں اپنے اجداد کو جانتی تھی اس لیے ان پر فخر کرتی تھی اور یہ لاکٹ پہن کر سب کو دکھاتی پھرتی تھی۔ لیکن اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟ روزی نے ہم دونوں کو دیکھ کر پوچھا۔

کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گی کہ آپ کے دادا کا ہندوستان سے کس قسم کا تعلق تھا؟ میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ روزی بولی، کیوں نہیں؟ مجھے اپنے اجداد پر فخر ہے۔ میرا باپ مجھے اپنے اجداد کی بہادری کے قصے بڑے فخر سے سنایا کرتا تھا۔ میرا پردادا آرتھر ولزلی برطانوی فوج میں جنرل تھا جو اپنے دور میں فاتحِ مصر کے نام سے مشہور تھا۔ اسے ۱۷۹۸ء میں ٹیپو سلطان کی سرکوبی کے لیے مصر سے ہندوستان طلب کیا گیا تھا۔ سرنگا پٹم کی چوتھی لڑائی میں ہندوستان کے سرکش سلطان کو اسی نے ۱۷۹۹ء میں شکست دی تھی اور یہ فاتحِ سرنگا پٹم مشہور ہوا تھا۔ جنرل ولزلی لاولد تھا کیوں کہ میری پردادی اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں تھی۔ وہ اپنی بیوی سے محبت کرتا تھا اس لیے اس نے اولاد کی خاطر دوسری شادی نہیں کی تھی۔ یہ شکار کا بھی بڑا شوقین تھا اس لیے فتحِ سرنگا پٹم کا جشن منانے بنگالی شیر کے شکار کے لیے اپنی بیگم کے ساتھ سندر بن گیا تھا۔ شکار کے بعد واپسی پر ایک جگہ پڑاؤ کے دوران سندر بن کے جنگل میں میری پردادی کو رات کے وقت ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اس نے خیمے سے نکل کر دیکھا تو قریب کی جھاڑیوں میں کپڑوں سے لپٹا ایک گورا چٹا بچہ پڑا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر خیمے میں لائی۔ یہ لاکٹ اس کے کپڑوں میں اڑسا ہوا تھا۔ اس نے یہ بچہ گود لیا اور اپنے لے پالک بچے کا نام پارکر ولزلی رکھا۔ ان دنوں امریکہ میں آزادی کی جنگ جاری تھی اس لیے جنرل ولزلی کو حکومتِ برطانیہ نے امریکیوں کو کچلنے کے لیے بھجوایا تو میری پردادی اپنے لے پالک بچے کے ساتھ امریکہ گئی۔ جنرل آرتھر امریکہ میں جنرل منرو کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کی بیوہ یعنی میری پردادی نے امریکی جنرل منرو سے شادی کر لی اور پارکر ولزلی نے اپنا خاندانی نام بھی ولزلی سے بدل کر منرو رکھا اور امریکہ میں اپنی کامیاب زندگی کا آغاز کیا۔ میرا والد پارکر منرو کا ایک بیٹا تھا۔ اس کے بعد ہمارے خاندان میں بیٹا نہیں ہوا۔ اس خیمے میں بیٹھی ہوئی ہم تینوں عورتیں پارکر منرو کی نسل سے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم تینوں میں ہندوستانی خون ہے، روزی نے اپنی بیٹی اور اپنی نواسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہمیں بتایا۔

روزی نے اپنی بات آگے بڑھائی، میرا دادا کبھی ہندوستان نہیں گیا اور اسے اپنے بارے میں اپنی جنم بھومی کے نام اور اس لاکٹ کے علاوہ اور علم نہیں تھا اس کے باوجود وہ خود کو فخر سے ہندوستانی کہا کرتا تھا۔ یہاں ایک بات واضح کر دوں کہ میرا دادا شکل وصورت سے ہندوستانی نہیں لگتا تھا۔ اس نے یہ لاکٹ میرے والد کو دیتے وقت تاکید کی تھی کہ اس لاکٹ کو اپنے خاندان سے کبھی جدا نہ کرنا۔ میرا والد بھی اپنی جڑوں کو کبھی نہیں بھولا وہ بھی اکثر اپنے ہندوستانی تعلق کا ذکر کرتا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ اس لاکٹ پر اللہ لکھا ہوا ہے اور میں نے اپنی نواسی کو بھی لاکٹ دیتے وقت بتایا تھا کہ اس پر اللہ لکھا ہے۔ آپ نے یہ لاکٹ اپنی بیٹی کی بجائے اپنی نواسی کو کیوں دیا؟ میں نے پوچھا تو روزی بولی، میں نے یہ لاکٹ اپنی بیٹی کو شادی کے وقت دیا تھا۔ اپنے پہلے خاوند کی وفات کے بعد یہ میرے پاس چند سال رہی تھی تو اس نے لاکٹ مجھے اپنے پاس رکھنے کو کہا۔ پھر اسے بھول گیا اور مجھے بھی یاد نہیں رہا۔ تو آپ کو ہندوستان آتے وقت کیسے یاد آیا اور آپ نے اسے کیری کو دینے کی بجائے ڈالیا کو کیوں دیا؟ ہندوستان آتے وقت مجھے لاکٹ کا یاد آنا ایک فطری امر تھا، روزی نے کہا، اس لیے کہ میں اپنی پچھلی چار پشتوں کے بعد پہلی بار اپنے اجداد کی جنم بھومی کو جا رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس لاکٹ کو اپنے اجداد کی جنم بھومی میں ہی اگلی نسل کو منتقل کروں گی۔

ڈالیا میری جانب اشارہ کر کے روزی سے بولی، کل اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آیا میرا یا میرے اجداد کا ہندوستان سے کبھی کوئی تعلق رہا ہے تو

میں نے جواب میں انکار کر دیا تھا۔ کیری میری جانب حیرت سے دیکھ کر بولی، تم نے یہ سوال کس وجہ سے پوچھا تھا نوجوان؟ میں نے جھوٹ گھڑنے کی بجائے انہیں بتایا، آپ خواہ ان واقعات پر یقین کریں یا نہ کریں لیکن ہندوستان کی سرزمین اپنے اندر کئی اسرار چھپائے ہوئے ہے۔ ان میں ایک اسرار سانپوں اور سانپوں کی دیوی کا ہے۔ پھر میں نے انہیں مناسہ کا تعارف کرانے کے بعد بتایا کہ یہ دیوی ڈالیا پر مہربان ہوگئی ہے اور اسی وجہ سے سانپ بھی اس پر مہربان ہو گئے ہیں۔ میں شروع سے ہی ڈالیا کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اس کے ساتھ پیش آنے والے غیر مرئی واقعات میں میرا کوئی کمال نہیں اور نہ ہی میں سانپوں کا جادوگر ہوں لیکن یہ سمجھتی ہے کہ میں اپنے بارے میں کسرِ نفسی سے کام لیتا رہا ہوں۔ پھر میں نے ڈالیا کو دیکھ کر کہا، میرا خیال ہے اب تمہیں یقین آ گیا ہوگا کہ میں ایک عام انسان ہوں۔ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ دیوی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ ڈالیا میری جانب دیکھ کر مسکرائی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ روزی بولی، مگر یہ دیوی اس پر کاہے کو مہربان ہے؟ میں نے جواب دیا، یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ دیوتا اپنے اسرار ہم جیسے عام لوگوں پر ظاہر نہیں کرتے۔ کیری نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے پوچھا، تو پھر تمہیں کیوں کر معلوم ہوا کہ مناسہ دیوی ڈالیا پر مہربان ہے؟ یہ سوال آپ میری بجائے ڈالیا سے پوچھیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ مناسہ اسے اپنی ایک نشانی دے گئی ہے۔ کونسی نشانی؟ روزی حیرت سے بولی۔ ڈالیا اٹھ کر پاس پڑے ہوئے کینوس سے پردہ ہٹا کر دونوں کو دکھاتے ہوئے بتایا، میں نے اس کینوس پر صرف برصہ کی تصویر بنائی تھی۔ برصہ اسی ناگن کا نام ہے جس نے مجھے چوما تھا۔ کل صبح میرے خیمے میں خوشبو کے ایک جھونکے کے ساتھ ہی کسی نے یہ تصویر اُلٹ دی۔ میں نے کینوس اٹھا کر دیکھا تو برصہ کے پیچھے یہ تصویر تھی۔ یہ تصویر میں نے نہیں بنائی۔ شان جی نے تصویر دیکھ کر بتایا تھا کہ مناسہ کی تصویر ہے۔ دونوں ماں بیٹی حیرت سے کبھی تصویر کو دیکھتے، کبھی ڈالیا کو اور کبھی مجھے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ مناسہ دیوی کی تصویر ہے؟ میری بجائے ڈالیا نے روزی کو جواب دیا، اس نے مناسہ دیوی کے درشن کیے ہوئے ہیں۔

خواب میں؟ روزی نے پوچھا۔ نہیں۔ جاگتے میں، میں نے جواب دیا۔ میرے خیال میں تو ایسی باتیں صرف میتھ (Myth) ہوتی ہیں۔ کیا دیوی دیوتا واقعی ہیں جو ہمیں اپنے درشن کراتے ہیں؟ روزی بولی تو میں نے جواب دیا، کیوں نہیں۔ ہر میتھ حقیقت کا کوئی نہ کوئی روپ ہوتی ہے۔ اگر میں نے مناسہ دیوی کو نہ دیکھا ہوتا تو اسے میتھ ہی سمجھتا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ ڈالیا اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو ابھی تک میتھ سمجھتی ہے یا حقیقت۔ جن تجربات سے میں ہندوستان میں گزر رہی ہوں ان کی روشنی میں تو میں اسے حقیقت تسلیم کرتی ہوں۔ ڈالیا کے جواب پر کیری نے کہا، اگر میری بیٹی مانتی ہے تو میں بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہوں۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر دیوی ڈالیا پر کسی وجہ سے مہربان ہوگئی ہے تو یہ سب کچھ تمہارے توسط سے کیوں ہو رہا ہے؟ روزی نے پوچھا تو میں نے جواب دیا، دیوی مجھے ڈالیا کے اور اپنے درمیان ایک بفر کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ وہ کیوں؟ کیری نے پوچھا تو میں نے جواب دیا، اگر دنیا کی خطرناک ترین کوبرا ناگن میری غیر موجودگی میں ڈالیا کے پاس جانے کی کوشش کرتی تو ڈالیا اور اس کے آس پاس کے لوگ خوفزدہ ہو کر اسے مار دیتے۔ اور اگر مناسہ دیوی ڈالیا کے خیمے میں میرے بغیر اپنی موجودگی ظاہر کرتی تو ڈالیا اسے بھوت پریت سمجھ کر ڈر جاتی اور ہندوستان چھوڑ کر واپس امریکہ چلی جاتی۔ مجھے آپ کے درمیان ایک دوستانہ ماحول استوار کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ ہاں یہ بات تو ہے، کیری نے سر ہلاتے ہوئے کہا، لیکن اپنی موجودگی کے باوجود تم یہ نہیں جانتے کہ یہ دیوی ڈالیا پر کیوں مہربان ہے؟ یہ سچ ہے۔ لیکن آپ کے ہندوستان سے تعلق نے اس گتھی کو کسی حد تک سلجھا دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ باقی بھی جلد سامنے آ جائے گا۔ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پچھلے پچیس منٹوں میں ڈالیا کو اپنے خاندان کے بارے میں وہ کچھ معلوم ہوا ہے جو اسے پچھلے پچیس سالوں میں معلوم نہیں ہوا تھا، میرے جواب پر روزی بولی، ہاں تم سچ کہتے ہو۔

ذرا یہ لاکٹ مجھے دکھاؤ، میں نے ڈالیا سے کہا جو ابھی تک لاکٹ کی زنجیر سے کھیل رہی تھی۔ اس نے گلے سے اتار کر لاکٹ میرے ہاتھ پر رکھا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد میں نے روزی سے پوچھا، آپ نے اس لاکٹ کو کبھی کھول کر دیکھا ہے؟ کیا مطلب؟ روزی نے حیرت سے پوچھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ لاکٹ ایک ڈبیہ کی طرح کھلتا ہے اور بند ہوتا ہے۔ روزی بولی، نہیں تو۔ مجھے تو یہ معلوم نہیں تھا کہ لاکٹ کھلتا اور بند ہوتا ہے۔ مجھے تو کیا شاید میرے باپ اور دادا کے علاوہ پردادا تک کو بھی علم نہیں ہوگا کہ یہ کھلنے والا لاکٹ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھے ضرور بتاتے۔ ہاں یہ لاکٹ کھلتا ہے۔ اس سے ملتا جلتا ایک لاکٹ کئی برس پہلے میری دادی نے مجھے جنوبی افریقہ میں دیتے ہوئے اس کے کھلنے کی ترکیب بھی بتائی تھی۔ میں اسے کھولنے کی کوشش کرتا ہوں شاید اس میں سے کچھ برآمد ہو جائے جو ہمیں مزید کارآمد معلومات مہیا کرے۔ تمہارے پاس کوئی سوئی ہے، میں نے ڈالیا سے پوچھا تو اس کی بجائے روزی بولی، بنے بنائے کپڑے پہننے والی آج کل کی پود کے پاس سوئی کہاں ہوگی۔ اگر سوئی کے بارے میں پوچھنا ہے تو مجھ سے پوچھو۔ میں سوئی کے بغیر کہیں بھی نہیں جاتی۔ یہ کہتے ہوئے روزی اٹھی اور اپنے سوٹ کیس کے اوپر والے خانے سے ایک ڈبہ نکال کر اس میں سوئی تلاش کرنے کے بعد مجھے دیتے ہوئے میرے پاس کھڑے ہو کر دیکھنے لگی۔ ڈالیا کے ہاتھوں سے سوئی لے کر لاکٹ کے درمیان ایک پتلے سوراخ میں داخل کر کے اپنے ہاتھ سے سوئی کو اندر سے گھمایا۔ کڑک کی آواز کے ساتھ ڈبیا کھلی اور اس میں پتلے چمڑے میں سلی ہوئی ایک تعویذ نما شے نکل کر زمین پر گر پڑی۔ جسے اٹھا کر میں نے روزی کو دکھاتے ہوئے پوچھا، کیا آپ نے یہ چیز پہلے کبھی دیکھی ہے؟ وہ بولی، بالکل نہیں۔ پھر میں نے تعویز نما شے کو اٹھا کر سوئی کی

باقی صفحہ۴۴ پر ملاحظہ کیجیے

''خدا گواہ رہے گا''

رینو بہل
(چنڈی گڑھ)

ہر لڑکی کا پہلا پیار اُس کا باپ ہوتا ہے۔ بے شک وہ اپنے باپ کا ہاتھ کچھ سالوں تک تھام کر پرائے گھر چلی جاتی ہے مگر تا عمر اُس کے دل پر باپ کی محبت قابض رہتی ہے۔ ایسی لاکھوں کروڑوں بیٹیوں میں سے میں بھی ایک ہوں۔ شاید ہر بیٹی میری طرح یہ ہی سمجھتی ہے کہ میرے بابا دنیا کے سب سے اچھے بابا ہیں۔ اُن جیسا دوسرا کوئی نہیں۔

میں اپنے بابا کے زیادہ قریب اس لیے بھی تھی کہ پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے میں بھی اُن کا پہلا پیار تھی۔ بچپن میں ہی اُن کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ گھر میں ماں تھی نہ بہن صرف چھ بھائی اور باپ۔ مردوں کا گھر اور اسی لیے چار بیٹیوں کا باپ ہونا اُن کے لیے باعثِ مسرت بات تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ نہ صرف ہمارے بابا تھے بلکہ بڑے بھائی بھی تھے دوست بھی تھے راہنما بھی تھے۔ چاروں بیٹیاں اُن کو بہت عزیز تھیں مگر سب کو یہ احساس تھا کہ میری طرفداری کچھ زیادہ کرتے ہیں۔ ہم چاروں ماں سے زیادہ بابا کے قریب تھیں۔ ماں کے حصے کا لاڈ بابا سے ملا۔ روایتی گھروں میں جو بات بیٹیاں باپ کی بجائے ماں سے کرتی ہیں وہ ہم اپنے بابا سے بلا جھجک ڈسکس کر لیتے۔ اُن کے ساتھ کسی بھی موضوع پر بات کرنے میں ہمیں کبھی کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ بابا کھُلے ذہن، کھُلی سوچ، نرم اور فراخ دل، خوش طبیعت شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے کبھی ہمارے اوپر کہیں آنے جانے پر پابندی نہیں لگائی نہ ہی بلا وجہ ٹوکا۔ مگر ان سب کے باوجود ان کا رُعب ایسا تھا کہ ہم اُن کی نظر پہچانتے تھے۔ اُن کے کچھ کہے بنا بھی اُن کا دبدبہ گھر پر چھایا رہتا۔ پنجاب یونیورسٹی میں ملازم تھے۔ لگی بندھی تنخواہ میں گزر بسر ہوتی۔ رہائش کے لیے بڑا سرکاری مکان ملا ہوا تھا جس کی بڑے سلیقے سے ماں نے آرائش کی تھی اور ماں کی نگرانی میں ہی لان میں طرح طرح کے پھول کھلائے جاتے۔ ماں کی ضد پر شہر کے بہترین انگریزی میڈیم سکول میں ہم نے تعلیم حاصل کی۔ ہمارے منہ سے نکلی ہر بات بابا پوری کرتے۔ اس بات پر اکثر ماں بابا سے الجھ جاتی کہ تم لاڈ پیار میں انہیں بگاڑ رہے ہو۔ ماں کا خفا ہونا اور بابا کا دو بول پیار کے بول کر منا لینا ہم سب کو اچھا لگتا تھا۔ گھومنے پھرنے بھی لے جاتے، فلم بھی دکھاتے اور کبھی کبھی کھانا بھی باہر کھلاتے۔ کبھی مالی تنگی کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی کوئی کمی محسوس ہونے دی۔ مگر اس سب کے باوجود ہمیں احساس تھا کہ بابا اپنی محدود تنخواہ میں گھر گرہستی چلا رہے ہیں۔

بابا کی شخصیت کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ سب سے کھِلے چہرے سے ملتے۔ اُن کے چہرے پر ہمیں فکر یا پریشانی کا رنگ کبھی نظر نہیں آیا۔ ہر مشکل وہ بڑے صبر سے مسکراتے ہوئے برداشت کر لیتے۔ اُن کا ماننا تھا کہ ہر مشکل کا حل موجود ہے۔ اکثر کہتے ''جتنا چِتا سمان ہے۔'' فکر دیمک کی طرح انسان کو کھا جاتی ہے اس لیے فکر نہ کرو حوصلہ رکھو۔

حسِ مزاح اُن کے اندر کُوٹ کُوٹ کر بھرا تھا۔ بات سے بات نکال کر قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتے۔ باذوق شخص تھے۔ شاعری کا ذوق مجھے اُن سے ملا۔ شاعری کی کتابوں کے علاوہ اکاؤنٹس کی کتابوں کا مطالعہ کرنا اُنہیں پسند تھا۔ ماں کو ہر چیز اپنی جگہ پر چاہیے تھی۔ گھر کی صفائی، سلیقے سے کی سجاوٹ اور پھول پودوں کے رکھ رکھاؤ کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اُن کا یہ شوق اکثر ہمارے لیے جی کا وبال بن جاتا۔ گھر کے کاموں سے جب اُنہیں فرصت ملتی تو محلے کی عورتوں کے ساتھ بیٹھنے کی بجائے وہ ہندی ناول پڑھنا پسند کرتی۔ میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھی جب میں نے ماں کے پڑھے ہندی ناول پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نثر کا شوق مجھے ماں سے ملا۔ شہر میں کہیں بھی جب کوئی اچھا ڈرامہ کھیلا جاتا یا پھر مشاعرہ منعقد کیا جاتا تو اُس وقت صرف میں ہی بابا کے ساتھ جاتی۔ ماں کو اور میری چھوٹی بہنوں کو ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بابا جتنے خوش اخلاق تھے ماں اُتنی ہی کم گو۔ بابا کی کوشش ہوتی سب کو دعا سلام کرتا چلوں اور ماں کی کوشش ہوتی کہ بِنا کسی کی طرف دیکھے کسی سے ملے خاموشی سے نکل جائے۔ فرصت کے وقت جب پریوار کے سب فرد ایک ساتھ بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول ہوتے تو بھی ماں سب کے ساتھ بیٹھی سب کی سُنتی مگر بولتی کم۔ جب تک گھر کا کام ختم نہ ہو جاتا ماں کی آواز کھُل کر نکلتی سب کی شامت آئی رہتی اور کام ختم ہوتے ہی ماں کا روپ بدل جاتا۔ ایسے شانت ہو جاتیں جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔

ہمارے گھر میں نہ تو اکیلے بیٹھنے کی کسی کو اجازت تھی اور نہ ہی کبھی کسی نے اکیلے کھانا کھایا۔ بابا کے دفتر سے لوٹنے سے پہلے ہم چاروں بہنیں گھر پر موجود ہوتیں کیونکہ انہیں اچھا لگتا تھا کہ وہ گھر لوٹیں تو سب گھر پر ملیں۔ پھر سب ایک ساتھ شام کی چائے پیتے۔ کھانا بھی سب مل کر ہی کھاتے۔ بے شک کوئی بیمار ہو یا ناراض ہو کھانے کے وقت وہ کھانے کی میز پر موجود ہوتا۔ بابا کہتے ''بیماری اور ناراضگی اپنی جگہ کھانا اپنی جگہ۔ جو پریوار مل کر کھانا کھاتے ہیں وہ ہی ایک ساتھ رہتے ہیں ورنہ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کا کیا فائدہ؟''

بابا رشتوں کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ہر رشتے کا اُنہیں پاس تھا۔ جتنا پیار اپنے بابا اور بھائیوں سے کرتے اُتنی ہی عزت اور پیار میری نانی اور ماما سے کرتے۔ گرمیوں کی دو مہینے کی چھٹیوں میں ہم دادا کے پاس جاتے اور سردیوں کے دو مہینے وہ ہمارے ساتھ رہتے۔ بابا دادا کا اس طرح خیال رکھتے جیسے کسی بچے کا خیال رکھتے ہیں۔ ہم نے بابا کو کبھی دادا کے آگے زبان درازی کرتے یا بحث کرتے نہ دیکھا انہوں نے جو زبان سے نکال دیا بابا نے سر خم کر کے قبول کر لیا۔ یہ

عادت صرف بابا کی نہیں تھی بلکہ بابا کے سبھی بھائیوں میں تھی۔ شاید یہ سعادت مندی ہمیں وراثت میں ملی۔ سُنا ہے کہ دادا نے دادی کے گزر جانے کے بعد کوئی نشہ نہیں چھوڑا۔ بھری جوانی میں وہ ساتھ چھوڑ گئیں۔ نہ جانے کیسے انہوں نے اکیلے ہی لڑکوں کو پال پوس کر بڑا کیا مگر دوسری شادی نہیں کی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دادا کے علاوہ کوئی بھی مرد نہ تو سگریٹ نوشی کرتا تھا اور نہ ہی شراب کو کسی نے ہاتھ لگایا۔ جب دادا ہمارے یہاں آتے تو بابا اُن کے حقّے اور کڑوے پانی کا انتظام کر کے رکھتے۔ دادا رات کے وقت کب پینے کا کام کرتے ہمیں نہیں معلوم ہم نے تو انہیں صرف حقّہ گڑگڑاتے ہی دیکھا۔

میری عمر شاید بارہ سال کی تھی جب دادا جی اچانک چل بسے۔ اُن کے ایک سال بعد میرے تایا جی چالیس کی عمر میں ہی دل کا دورہ پڑنے سے دادا سے جا ملے۔ ایک سال میں گھر کے دو سربراہ کھو دیئے ہم نے۔ تایا جی کی چار بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی کی منگنی ہو چکی تھی شادی کی تاریخ ابھی پکی کرنی تھی اور سب سے بڑا بیٹا کچھ عرصے سے ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا۔ بابا نے اس کی نوکری یونیورسٹی میں لگوا دی تھی اور اسی لیے ارون بھیا ہمارے ساتھ ہی رہنے لگے تھے۔ تایا جی کی بیٹیاں بے حد خوبصورت تھیں مگر پڑھائی لکھائی میں ہاتھ کمزور تھا۔ تایا جی کے جانے کے بعد زندگی کی راہ دشواریوں سے بھر گئی تھی۔ جب تائی جی بیاہ کر سسرال آئی تھیں اُس وقت ان کی عمر چودہ سال کی تھی اور سب سے چھوٹے چاچا کی عمر شاید تین یا چار سال کی رہی ہوگی۔ دیور کو بھائی نے ماں کی طرح پالا۔ انہوں نے بھی انہیں ماں کا درجہ ہی دیا۔ بڑے بھائی کے ساتھ دکان پر جاتے۔ تایا جی کے بعد دکان کا پورا کام انہوں نے سنبھال لیا تھا۔ چنڈی گڑھ سے ڈلہوزی کا سفر بس سے بارہ گھنٹے بعد طے ہوتا تھا۔ بابا کو اس دوران کئی بار وہاں جانا پڑا۔ کبھی ماں کو بتا کر اور کبھی ماں سے چوری انہیں پیسے بھیجتے رہے۔ کچھ حد تک اب دو گھروں کی پرورش کا بوجھ بابا پر آن پڑا۔ بابا نے جب بھیا کو اپنی تنخواہ میں سے گھر پیسے بھیجنے کو کہا تو اُس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ماں کا لاڈلا اور بابا کا سب سے عزیز بھتیجا تھا۔ لاکھ سمجھانے کے باوجود سب کی بات ان سنی کر کے گھر چھوڑ دیا۔ چھوٹی جگہ سے بڑے شہر میں آتے ہی وہاں کی آب و ہوا نے بہت جلد اثر کیا تھا۔ نئی نئی دوستیاں، نیا ماحول اور مکمل آزادی مل گئی۔ اوپر سے باپ کا خوف بھی نہیں رہا۔ گھر کا بڑا بیٹا تھا اُسے بیوہ ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کا سہارا بننا تھا مگر اس نے ذمہ داریوں سے منہ موڑ کر اپنی آزادی پر توجہ دینا زیادہ بہتر جانا۔

سب چاچا کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ سب اپنے اپنے گھروں میں خوش باش زندگی بسر کر رہے تھے۔ سب سے چھوٹے چاچا تھے جن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ بابا نے خط لکھے سب کو فون کیا اور یہ طے پایا کہ سب مل کر شادی کا انتظام کریں گے۔ لڑکے والے دلی کے تھے لہٰذا دلی جا کر دیدی کی شادی دھوم دھام سے کی گئی۔ دس دن بعد تائی جی کی دوسری بیٹی کی شادی بڑی سادگی سے ڈلہوزی میں ہوئی۔ دیدی کی شادی میں آئے مہمانوں میں سے کسی کو وہ پسند آ گئی اور وہ رشتہ لے کر پہنچ گئے۔ گھر بار اچھا تھا لڑکا بھی دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک تھا۔ تائی جی نے اپنے حالات بتائے کہ وہ اتنی جلدی شادی نہیں کر پائیں گے تو لڑکے والوں نے سادگی سے شادی کرنے کی پیشکش رکھ دی۔ تائی جی نے آس پڑوس کے بزرگوں سے مشورہ کیا اور سادگی سے بیٹی کو بیاہ کر رخصت کر دیا۔ خط لکھ کر سب رشتے داروں کو اس کی اطلاع دے دی۔ بیوہ ماں کے کندھے سے دو جوان بیٹیوں کا بھار اُتر گیا تھا۔ دو بیٹیاں اور ایک چھوٹا بیٹا اُن کے پاس تھے۔ زندگی کے کچھ سال انہوں نے بہت مشکل سے گزارے۔

تایا جی کی موت نے بابا کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ ہم سب پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔

''اگر کل کو مجھے کچھ ہو گیا تو تم سب کیا کرو گی؟ کس کا منہ دیکھو گی؟''

دیدی کی شادی پر سب بھائیوں نے مل کر اپنے اپنے حساب سے جو رقم دی تھی وہ کافی نہیں تھی۔ اُسے پورا کرنے کے لیے بابا کو کسی سے قرض لینا پڑا تھا۔ ہمیں تو تب پتا چلا جب سردیوں کی شام کمبل میں لپٹا ایک شخص تقاضے کے لیے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ بابا اُس سے بچتے پھرتے تھے۔ پہلی بار ہم نے بابا کو پریشان دیکھا تھا۔ انہوں نے اوور ٹائم کے ساتھ دفتر کے بعد بھی کہیں کام کرنا شروع کر دیا۔ صبح سویرے نکل جاتے اور رات دیر سے لوٹتے۔ دھیرے دھیرے سود سمیت قرض کی ادائیگی بھی ہو گئی۔

دیدی کی شادی کے دوران چھوٹی چاچی نے سب کے بیچ بیٹھ کر جب کہا کہ ''یہ تو بہت مشکل ہے۔ ہم ہر بار کہاں سے ایسے مدد کر سکیں گے یہاں تو سب کی چار چار بیٹیاں ہیں ہم تو صرف یہ ہی نپٹاتے رہیں گے۔'' اُس وقت ماں نے غصے میں کوئی تلخ جواب دینا چاہا تو بابا نے اشارے سے انہیں روک دیا اور جواب دیا:

''فکر نہ کرو اس کے بعد کوئی تم سے کسی کی شادی کے لیے مالی امداد نہیں مانگے گا اور نہ ہی تم سے کوئی شگن میں بھی ایک روپے سے زیادہ قبول کرے گا۔ یہ وعدہ ہے میرا تم سب سے۔''

اس شادی کے بعد بھائیوں میں فاصلے بڑھ گئے تھے۔

اُس سال میں نے دسویں کا امتحان دیا تھا اور رزلٹ کے بعد مجھے کالج میں داخلہ لینا تھا۔ اُن دنوں لڑکیوں کا ملازمت کرنے کا چلن عام نہیں تھا مگر بابا چاہتے تھے کہ میں بی اے کے بجائے دو سال کا ٹیکنکل کورس کر لوں۔ سُن کر پہلے تو مجھے بڑا دھکا لگا سکول کے دوستوں کے ساتھ کالج جانے کے کئی خواب سجا رکھے تھے وہ سب چکنا چور ہوتے دکھائی دیے۔ بابا نے کہا تھا:

''سوچ کر فیصلہ کر لو۔ ہوگا وہی جو تم چاہو گی۔''

اُس رات میں بہت روئی تھی۔ دیر تک سو نہیں سکی کیونکہ میں جانتی تھی کہ میں بابا کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکوں گی وجہ ان کا خوف نہیں بلکہ اُن کی محبت تھی۔ اُن کی زبان سے نکلی بات میرے لیے رب کے فرمان کے برابر ہوتی

ہے۔ میں اُن پر بوجھ نہیں بلکہ ان کا دایاں بازو بننا چاہتی تھی۔ صبح میرا چہرہ دیکھ کر انہیں میرے فیصلے کا علم ہو گیا تھا۔ میرے دل کی ہر بات وہ میرے چہرے سے پڑھ لیتے تھے۔

میرا یہ فیصلہ کتنا صحیح تھا اس کا اندازہ مجھے آنے والے سالوں میں ہوا۔ دو سال کے سیکر یٹریل پریکٹس کے کورس کے ساتھ ساتھ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی پڑھائی جاری رکھی۔ کورس ختم ہوتے ہی دو مہینے بعد پنجاب کے نیم سرکاری ادارے میں ملازمت مل گئی۔ کچھ قریبی رشتے داروں کو میری نوکری پر اعتراض تھا مگر بابا نے کسی کی پرواہ نہیں کی۔ بیٹیوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا اُن کا خواب پورا ہو رہا تھا۔ بابا نے ہمیں چار دیواری میں قید ہونے کے بجائے مکمل آزادی دی۔ ہمیں پنکھ دیئے پرواز دی اور کھلا آسمان دیا۔ ہم چاروں بہنوں میں اتحاد بڑا زبردست تھا۔ ایک ساتھ فلم دیکھنے جاتیں، گھومنے پھرنے، شاپنگ کرنے، گھر کے کام اور رات کو پڑھائی بھی ساتھ بیٹھ کر ہوتی۔

نوکری کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ بی اے کے بعد جب ایم اے کرنے کا فیصلہ کیا تو گھر میں میری شادی کا باب کھل گیا۔ بابا نے سب سے پہلے مجھے بلا کر پوچھا ''اگر تمہاری نظر میں کوئی لڑکا ہو یا تمہیں کوئی پسند ہو تو بتا دو۔''

میں نے ہنس کر کہا ''ہوتا تو آپ کو ضرور معلوم ہوتا۔ آپ جانتے ہیں میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

''کیوں؟ تم نہیں چاہتی میں اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہوسکوں۔''

''میں بوجھ ہوں آپ پر؟''

''تم بوجھ کیسے ہوسکتی ہو؟ تم تو میری آنکھ کا تارہ ہو۔''

''میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی بابا۔'' میں نے اُن کے کاندھے پر سر رکھ کر کہا۔

''جانا تو پڑے گا۔ میں تمہیں اپنے گھر میں ہنستا کھیلتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے بچوں کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہوں۔''

اس کے آگے کہنے کو میرے پاس کچھ رہ نہیں گیا تھا۔ میں خاموش ہو گئی۔

پھر رشتہ ڈھونڈنے کا سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ وقت کے ساتھ تکلیف اور مایوسی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر چھٹی والے دن یا تو بابا صبح نکل جاتے یا کوئی نہ کوئی گھر آ جاتا۔ نمائش کا دور بڑا تکلیف دہ تھا۔ کبھی کسی کو میں پسند نہ آتی کبھی کوئی مجھے پسند نہ آتا۔ بابا ایڑیاں رگڑتے نہیں تھکے تھے مگر میں اپنی نمائش سے تھک چکی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی شاید اسی لیے میرے دل نے کبھی کسی رشتے کے لیے حامی نہیں بھری۔ آپ اسے میرے کمزوری یا خامی کہیے کہ میں کوئی بھی کام زبردستی نہیں کر سکتی وہ کام بے شک میرے لیے کتنے ہی فائدہ کا ہو وہ ہرگز نہیں کروں گی جس کے لیے میرا دل آمادہ نہ ہو۔ آئے دن کی نمائش نے تلخی میرے اندر بھر دی تھی۔ آنے والا شکل وصورت کے علاوہ کیا دیکھ سکتا ہے؟ ویسے بھی نہ میں خوبصورت تھی نہ رنگ گورا نہ دُبلی پتلی۔ عام سی شکل، گندمی رنگ اور بھرا جسم، سیرت پر کس کی نظر جاتی۔

وہ بڑا مشکل دور تھا ہم سب کے لیے۔ گھر کا ماحول افسردہ ہونے لگا۔ بابا فکر مند رہنے لگے اور ماں کی زبان اور کڑوی ہو گئی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا باقی تینوں کی عمر بھی بڑھ رہی تھی۔ ماں جس سے ملتی رشتے کی بات کرتی۔ کسی کے گھر سے شادی کا کارڈ آتا تو ہمارے گھر کی فضا سوگوار ہو جاتی۔ بابا اکیلے ہی شادی میں شرکت کرتے ماں نے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا۔ لوگوں سے ملنا اُسے ویسے بھی زیادہ پسند نہیں تھا۔ اب تو وہ اور بھی کترانے لگی تھیں۔ میری وجہ سے گھر میں جو پریشانی تھی بابا کی مایوسی میرے دل ودماغ پر حاوی رہنے لگی۔ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اندر ہی اندر گھلنے لگی۔ اس گھٹن سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگی۔ پھر اک روز میں نے خود سے اپنی تکلیف بانٹنے کا ارادہ کیا اور قلم پکڑ کر اپنے جذبات کاغذ پر اتار دیئے۔ اُس روز میں نے خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کیا اور یہاں سے مجھے نیا راستہ مل گیا۔ قلم کا سہارا میں نے خود کی تکلیف دور کرنے کے لیے لیا تھا مگر دھیرے دھیرے کب میں خود کے حصار سے نکل کر دنیا کے حصار میں پہنچ گئی مجھے پتا نہیں چلا۔ پہلی کہانی ''تلخیاں'' لکھی جو ہندسا چار میں چھپی۔ نوکری، پڑھائی اور لکھنے میں خود کو مصروف کر لیا۔ ایک روز کڑا من کر کے میں نے بابا کو کہہ دیا:

''بابا آپ یہ سلسلہ یہیں روک دیں۔ میں اب کسی کے سامنے نمائش بن کر نہیں جاؤں گی۔ بہت ہو گیا بس اب اور نہیں۔ جو میری قسمت میں ہو گا وہ میرے پاس خود چل کر آئے گا اور اگر نہ ہوا تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے دے نہیں سکتی۔ اب آپ میری فکر چھوڑ دیں۔''

''تمہارے لیے کہنا آسان ہوگا میرے لیے کرنا آسان نہیں۔ تم جانتی ہو لوگ کیا کہتے ہیں؟''

''مجھے پرواہ نہیں۔''

''مگر مجھے ہے۔ مجھے ابھی باقی بچیوں کی شادی بھی کرنی ہے۔ کب تک لوگوں کی باتیں سنتا رہوں؟ لوگ کہتے ہیں میں تمہاری کمائی کھاتا ہوں اس لیے تمہاری شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' بات کہتے بابا کا گلا بھر آیا تھا اور اُن کی بات میرے سینے میں تیر کی طرح لگی تھی۔ دنیا اتنی بے حس کیسے ہوسکتی ہے؟

''دنیا دودھاری تلوار ہے۔ لوگوں کا کام ہے کہنا کہنے دو۔ آپ کہتے ہونا خود کو ٹھیک رکھو اور کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہ دو؟ نہ آپ غلط ہیں نہ ہم ہمارے حالات ایسے ہیں وقت ایسا ہے۔''

''ہم جس سماج میں رہتے ہیں اُن کو دیکھنا پڑتا ہے۔''

''ہم سب جانتے ہیں آپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں۔''

''معلوم نہیں میرے نصیب میں یہ خوشی دیکھنی لکھی بھی ہے یا نہیں۔''

''آپ تو کبھی مایوسی کی باتیں نہیں کرتے تھے اب کیا ہوا؟''

''میں ہار گیا۔''

''آپ ہار نہیں سکتے بابا۔ہم آپ کے ساتھ ہیں۔آپ میری مانیں اور ریتو کے لیے رشتہ دیکھنا شروع کریئے۔''

''تمہاری ماں اس بات کے لیے راضی نہیں۔وہ نہیں چاہتی کہ بڑی کو چھوڑ کر چھوٹی کی شادی پہلے ہو۔''

''اب یہ سب سوچنے کا وقت نہیں۔سب پڑھ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہیں۔آپ کو جس کے لیے بھی رشتہ ملتا ہے اس کی شادی کر دیں۔ہماری طرف سے آپ کو پوری آزادی ہے۔ایک کے پیچھے آپ سب کا نقصان نہیں کر سکتے۔''

اُس دن کے بعد میں نے خود شادی کا باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ وہ دور میری زندگی کا سب سے بڑا تناؤ اور درد بھرا دور تھا۔جو بھی ملتا سب سے پہلے شادی کا پوچھتا۔سب کے سوالوں کے جواب دیتی تھک گئی تھی۔اُن کی نظروں میں بے چارگی مجھے زہر لگتی۔اوپر والے نے کسی کی زندگی کا خانہ مکمل نہیں رکھا سب کی زندگی میں کچھ خانے خالی ہوتے ہیں میری زندگی میں اگر یہ خانہ خالی ہے تو کیا؟وہ جانتا ہے کس کے لیے کیا بہتر ہے۔مجھے اپنے فیصلے پر افسوس تھا اور نہ پچھتاوا۔

بابا ریٹائر ہو گئے اور ہم سرکاری مکان چھوڑ کر کرایہ کے مکان میں آ گئے تھے۔ساری عمر بابا اپنا مکان بنانے کی مخالفت کرتے رہے کہتے تھے:۔

''بیٹیوں کی شادی ہو جائے گی تو ہم بوڑھا بوڑھی کہیں بھی کرایہ کے مکان میں رہ لیں گے۔میں نہیں چاہتا جائیداد بنائی جائے اور دامادوں کے بیچ جھگڑے کا سبب بنے۔''

مگر اب کرائے کے مکان میں آ کر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔انہوں نے یونیورسٹی سوسائٹی کے بننے والے فلیٹ کے لیے درخواست کے ساتھ پیسے جمع کرا دیئے۔

ریتو کے لیے بھی رشتے کی تلاش شروع ہو گئی۔ابھی ایک دو جگہ ہی بات چلی تھی کہ تیسری والی کے لیے گھر بیٹھے رشتہ آ گیا۔سیما اُس وقت سکول میں پڑھاتی تھی۔اس کے ساتھ کام کرنے والی ٹیچر اپنے دیور کا رشتہ لے کر آ ئی تھی۔ لڑکا پڑھا لکھا دیکھنے میں اچھا تھا اور پریوار بھی اچھا تھا۔ماں اس کے لیے راضی نہیں تھی۔وہ ایک کو چھوڑ کر دوسری کی نہیں کرنا چاہتی تھیں اور یہاں بات تیسری کی ہو رہی تھی۔میں نے اور ریتو نے ماں بابا دونوں کو زور ڈال کر راضی کر لیا۔

گھر کی پہلی شادی تھی لہٰذا بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ماں بابا کے چہرے کی رونق لوٹ آئی تھی۔گھر میں نئی تازگی اور بہار چھا گئی۔افسردگی کا ماحول دھواں بن کے اُڑ گیا۔خوشیاں پھر سے لوٹ آئی تھیں۔سال بعد ہی اس طرح سب سے چھوٹی جیوتی کے لیے بھی رشتہ آ گیا تو اُسے بھی دھوم دھام سے خوشی خوشی رخصت کر دیا۔خوش قسمتی سے دونوں گھرانے بہت اچھے تھے۔لڑکے بھی شریف ملنسار اور عزت کرنے والے۔بہت جلد وہ سب کے ساتھ گھل مل گئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد بابا کی مصروفیت اور بڑھ گئی تھی۔نوکری کے دوران ہی انہوں نے انکم ٹیکس اور سیلری ریڈی ریکنرز تیار کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔پنجاب کے سبھی سرکاری اداروں میں یہ استعمال ہونے لگا۔یہاں تک کہ کورٹ کیس کے دوران بھی اسے تصدیق شدہ دستاویز مانا جانے لگا۔پیسے کے ساتھ اُنہیں اس کام میں عزت اور شہرت بھی بہت ملی۔ریڈی ریکنرز کا کام وہ اکیلے ہی کرتے۔کبھی کبھی پروف پڑھنے کے لیے ہم میں سے کسی کو بھی پکڑ لیتے۔

ہم نے کبھی انہیں صبح دیر تک سوتے نہیں دیکھا۔جب ہم سونے جاتے تو وہ میز کرسی پر بیٹھے اپنا کام کر رہے ہوتے اور جب ہم صبح اٹھتے تو بھی وہ ہمیں کام کرتے ملے۔ہم اکثر ان سے سوال کرتے''آپ سوتے کس وقت ہو؟ نیند کیسے پوری ہوتی ہے آپ کی؟''ہنس کر مخصوص جواب دیتے:

''نینداور بھوک انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے جتنی چاہو بڑھا لو اور جتنی چاہو کم کر لو۔''

نہ وہ خود دیر تک سونا پسند کرتے تھے اور نہ ہی ہمیں سونے دیتے تھے۔ اگر اتوار کے دن ہم کہہ کر سوتے کہ ہمیں صبح جلدی مت اُٹھانا تو کچھ دیر تو وہ برداشت کرتے پھر بے چینی سے اندر باہر ٹہلنے لگتے اور بار بار کمرے میں آ کر کہتے:

''اٹھ جاؤ یار بہت ہو گیا اور کتنا بور کرو گے۔''گرمی کا موسم ہوتا تو اے سی پنکھا بند کر دیتے اور سردیاں ہوتیں تو رضائی کھینچ دیتے۔مجبوراً اُٹھنا پڑتا۔

ہم نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ صبح بنا نہائے انہوں نے ناشتہ کیا ہو۔ سردی ہو یا گرمی،طبیعت ٹھیک ہو یا خراب نہانے میں ناغہ نہیں کیا۔نہا کر دھوپ بتی کر کے ہی ناشتہ کرتے اور ہم لوگوں کو بھی کبھی بنا نہائے ناشتہ نہیں ملا۔

بابا کو کوئی بھی سواری چلانی نہیں آتی تھی۔دراصل ہماری رہائش یونیورسٹی کیمپس میں ہی تھی اس لیے گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر پیدل ہی آتے جاتے تھے۔ریٹائرمنٹ کے بعد جب کیمپس چھوٹ گیا تو انہیں آنے جانے میں دقت محسوس ہونے لگی۔گھر پر ہم چاروں کے پاس سکوٹر اور گاڑی بھی تھی مگر وہ خود چلا نہیں پاتے تھے۔انہوں نے سکوٹر اور گاڑی سیکھنے کا ارادہ کر لیا۔ایک روز ریتو کا آٹو گیئر والا سکوٹر اٹھایا اور کہہ کر چلے گئے کہ ابھی چکر لگا کر آتا ہوں۔دو گھنٹے گزر گئے اُن کا کوئی اتا پتا نہیں۔ان دنوں موبائل تو ہوتے نہیں تھے لہٰذا گھر پر بیٹھ کر انتظار کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا۔بے چینی سے اندر باہر ٹہلنے لگے۔دو گھنٹے بعد دیکھا جناب مسکراتے ہوئے سکوٹر چلاتے آ رہے ہیں۔ہم سب گیٹ پر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔دیکھتے ہی سکوٹر روکا اور خوشی سے بتانے لگے ''کیمپس کا چکر لگا کر آیا ہوں۔کوئی دقت نہیں ہوئی۔''اتنا کہتے سکوٹر اندر پارک کرنے کے لیے بڑھایا کہ ڈھلان کی وجہ سے توازن بگڑ گیا اور سکوٹر ایک طرف اور خود دوسری طرف جا گرے۔شکر ہے کہ بچاؤ ہو گیا کوئی ہڈی پسلی نہیں ٹوٹی صرف معمولی کھروچ آئیں۔اُس دن کے بعد سکوٹر چلانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی طرح گاڑی چلانے کا شوق چڑھا۔دفتر کے ڈرائیور سے گاڑی سیکھنی شروع کر

دی۔ دراصل ہر کام کے لیے ہمیں کہنا اُنہیں پسند نہیں تھا وہ چاہتے تھے کہ خود گاڑی چلانا سیکھ لیں تو کئی کام آسان ہو جائیں گے۔

اتوار کو ڈرائیور نے آنا نہیں تھا۔ مجھے کہنے لگے چل گاڑی کی پریکٹس کر لیتے ہیں۔ ہم دونوں گاڑی لے کر نکل گئے۔ تھوڑی دیر گاڑی گراؤنڈ میں چلائی پھر سڑک پر آ گئے۔ اس بار تو پہلے سے بھی زیادہ بُرا ہوا۔ موڑ کاٹتے وقت سٹیرنگ سنبھالتے سنبھالتے سامنے سے آتی گاڑی کے پیچھے دروازے سے ٹکراتی ہوئی گاڑی پڑی پر چڑھا دی۔ چھٹی کی وجہ سے سڑک ویران تھی۔ کوئی جان کا نقصان نہیں ہوا۔ کسی کو چوٹ نہیں آئی مگر دوسرے بندے کی نئی گاڑی بری طرح خراب ہوئی تھی۔ اُس کا غصہ ہونا تو لازمی تھا مگر جب ہم نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور کہا کہ ہم ہرجانہ بھرنے کو تیار ہیں تو وہ نرم پڑ گیا۔ بابا کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے اُس نے پولیس کو بھی نہیں بلایا۔ باتوں کے دوران جب یہ سامنے آیا کہ اُس کی بیٹی جیوتی کی سٹوڈنٹ ہے تو وہ اور نرم پڑ گیا۔ اُس نے بڑی عزت سے کہا ''آپ فکر نہ کریں میں انشورنس کلیم کر لوں گا آپ سے صرف گزارش کر سکتا ہوں آپ آئندہ پلیز سڑک پر گاڑی لے کر نہ آئیے۔'' جان بچی سو لاکھوں پائے۔ اُس دن کے بعد بابا نے توبہ کر لی۔

جب سیما کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تو گھر میں نئی خوشیوں کے ساتھ بہار آ گئی۔ سیما کے ساس سسر بزرگ تھے بچہ سنبھالنا اُن کے بس میں نہیں تھا لہٰذا دونوں میاں بیوی صبح کام پر جانے سے پہلے روہن کو نانا نانی کے پاس چھوڑ کر جاتے۔ جو لاڈ ماں نے ہمارے ساتھ نہیں کیے تھے وہ سب روہن کے حصے میں آئے۔

اُدھر سوسائٹی کے فلیٹس کے تعمیری کام زوروں پر تھے۔ ایک ہفتہ بھی نہ گزرتا کہ بابا فرمائش ڈال دیتے کہ چلو چل کر دیکھ آتے ہیں کام کہاں تک پہنچا۔ آئے دن آدھے ادھورے ڈھانچے دیکھنا ہمیں پسند نہیں تھا مگر اُن کا جوش اُن کی خوشی دیکھ کر منع کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔

روہن ابھی دو سال کا ہوا تھا کہ جیوتی کے یہاں بیٹی نے جنم لیا۔ سریو کی آمد کی خوشی بھی گھر میں اُسی طرح منائی گئی جس طرح روہن کی منائی تھی۔ سریو سے ہفتے میں ایک ہی دن ملاقات ہوتی۔ اُسے گود میں اُٹھا کر لاڈ کرتے، توتلی زبان میں باتیں کرتے، اُس کے ساتھ کھیلتے اور جب جیوتی جانے لگتی تو ایک ہی بات کہتے ''ابھی میرا دل نہیں بھرا اور تم اسے لے کر جا رہی ہو۔'' وہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ ''میں جا رہی ہوں نہ۔ اگلی بار صحیح''

بچوں کے جاتے ہی گھر خالی لگنے لگتا۔ ہم چاروں رہ جاتے۔ اکثر شام کے وقت ہم چاروں کسی نہ کسی کام کے لیے گاڑی میں نکل جاتے اور اس طرح شام ایک ساتھ اچھی گزر جاتی۔ مہینے میں کم سے کم ایک بار تو دونوں پریواروں کو بابا گھر پر کھانے کے لیے مدعو کر لیتے۔ کبھی کبھی سب کے ساتھ پہاڑوں پر پکنک پر جانے کا پروگرام بن جاتا۔ زندگی بڑی ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔ روہن اور سریو ہاتھوں ہاتھ پلنے لگے۔ چار ماہ کے دو بچے ہوں تو لاڈ کی کیا کمی ہو سکتی ہے۔

میری پی ایچ ڈی کا کام مکمل ہو گیا تھا۔ بابا نے خود میرے ساتھ جا کر تھیسز (Thesis) جمع کروایا۔ شام کو جب بابا گھر لوٹے تو خوشی سے چہرا دمک رہا تھا۔ آتے ہی ماں کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ پکڑایا اور بولے:

''منہ میٹھا کرو۔ آج تمہاری بیٹی نے اپنا تھیسز جمع کروایا ہے۔''

ہند سماچار کے علاوہ اب مختلف رسالوں میں کہانیاں چھپنے لگی تھیں۔ ادبی سفر کے آغاز کا دور تھا۔ بکھری زندگی سمٹ گئی تھی۔ ہر چیز خوبصورت تھی، پرسکون، مسرتوں بھرے دن گزرنے لگے۔ مایوسی کے بادل چھٹ گئے تھے۔ بابا کی بس اب ایک ہی خواہش تھی کہ وہ جلد سے جلد بیٹیوں کو اُن کے گھر کی چھت دے سکیں۔

اٹھارہ دسمبر کی صبح نے اُن کا ہر خواب توڑ دیا۔ سڑک حادثے میں وہ بُری طرح زخمی ہو گئے۔ ہسپتال لے جایا گیا۔ داہنی ٹانگ کاٹنے کی نوبت آ گئی۔ خبر ملتے ہی ہم سب اُن کے پاس پہنچ گئے تھے۔ زخمی حالت میں بھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ درد سے کراہتے ہوئے بھی اُنہیں سب کی فکر تھی۔ بار بار ایک ایک کے بارے پوچھتے رہے۔ سب باہر کوریڈور میں تھے۔ ایکسرے، ٹیسٹ وغیرہ کے دوران میں اُن کے ساتھ رہی۔ ایک پل کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑا۔ وہ مجھے حوصلہ دے رہے تھے ''گھبراؤ مت سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ڈاکٹروں کو کہو جلدی آپریشن کر دیں۔'' انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ٹانگ کاٹنی پڑے گی۔ اپاہج ہو کر بابا پر کیا گزرے گی یہ سوچ کر میں کانپ اٹھی۔

بارہ گھنٹے کی تکلیف سہنے اور بھاگ دوڑ کے بعد انہیں آپریشن کے لیے لے جایا گیا۔ ہم سب باہر بیٹھے دعائیں کرنے لگے۔ پندرہ منٹ بعد ہی ڈاکٹر نے باہر آ کر کہہ دیا:

''آپریشن ابھی ممکن نہیں۔ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔ پہلے ہمیں وہ دیکھنا ہو گا۔''

وارڈ میں شفٹ کر کے Ventilator پر رکھ دیا۔ اُس وقت بھی وہ ہوش و حواس میں تھے۔ بات کرنا ممکن نہیں تھا لہٰذا وقفے وقفے پر آنکھیں کھول کر دیکھتے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں کئی سوال مچل رہے تھے اور چیخ چیخ کر پوچھ رہے تھے کہ میں کب اس حالت سے باہر نکلوں گا۔ نہ جانے اُس وقت اُن کے ذہن میں کیسے خیالات گھوم رہے ہوں گے۔ وہ دن ہماری زندگی میں خوفناک خواب کی طرح تھے۔ دھیرے دھیرے اُن کے دوسرے اعضا نے کام کرنا بند کر دیا۔ پھر نہ انہوں نے آنکھیں کھولیں نہ ہی بات کی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ حالت نازک ہے کیونکہ ملٹی پل آرگن فیلیئر ہو گیا ہے۔ ہمارا دل حقیقت قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ روشنی کی کرن اب بھی باقی تھی۔ اُمید کا دامن چھٹا نہیں تھا۔

۲۰۔ دسمبر کی شام سب ہسپتال میں ہی موجود تھے۔ ایک سے زیادہ افراد اُن کے پاس نہیں بیٹھ سکتا تھے۔ سب باری باری اُن کے پاس جا رہے تھے۔ پانچ بجے کے قریب میں اُن کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھی تھی ساتھ میں مہامرتیو نجے منتر کا جاپ بھی کر رہی تھی۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ پُر

سکون۔اچانک دائیں ہاتھ سے کرنٹ کی لہر بازو سے ہوتی ہوئی میرے جسم سے نکل گئی۔میں تذبذب کی کیفیت میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ سب کیا تھا کہ اُس لمحہ ڈاکٹر اور نرسوں کی ٹیم نے مجھے جلدی سے پیچھے ہٹا کر انہیں گھیر لیا۔ایک نرس انجکشن تیار کر رہی تھی اور ڈاکٹر زور زور سے اُن کے سینے کو دبا رہا تھا۔انجکشن لگنے سے پہلے ہی وہ زندگی کی بازی ہار گئے تھے۔میں بُت بنی وہاں کھڑی یہ منظر دیکھتی رہی۔نہ روئی نہ چلاّئی۔ڈاکٹروں نے Ventilator ہٹا دیا اور اُن کا چہرہ چادر سے ڈھانپ دیا۔میں نے اُن کی روح کو جسم سے نکلتے دیکھا تو نہیں مگر محسوس ضرور کیا تھا۔میں خاموشی سے انہیں وہیں چھوڑ کر باہر کوریڈور میں آ گئی۔میرے سے پہلے میری شکستہ حالت نے سب کہہ دیا تھا۔میں صرف اتنا ہی کہہ سکی:

''چلو گھر چلیں یہاں کا کام ختم ہو گیا۔''

اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں۔بس اتنا یاد ہے کہ بابا کو اکیلے ہسپتال چھوڑ کر گھر آ گئے تھے۔لگا ہی نہیں تھا کہ سٹیچر پر جسے ڈال رہے تھے وہ ہمارے بابا ہیں۔وہ تو بے جان جسم تھا بابا تو ہم سے پہلے ہسپتال چھوڑ کر نکل گئے تھے۔

ہسپتال سے گھر تک کا راستہ میں نے بڑے حوصلے سے طے کیا۔ ایک لفظ میری زبان سے نہیں نکلا۔ایک آنسو تک میری آنکھ سے نہیں ٹپکا مگر گھر میں گھستے ہی ضبط کے سارے بندھ ٹوٹ گئے۔کتنی دیر دھاڑے مار مار کر روتی رہی مجھے نہیں معلوم۔وہ رات ہزاروں سال جیسی لمبی رات تھی۔لمحہ لمحہ صدیوں کے برابر گزرا۔کون آیا کون گیا۔کس نے کیا کہا کون کیا کر رہا ہے، ان سب سے لاتعلق مجھے کچھ احساس نہیں ہوا۔صرف یہ احساس رہا کہ کڑی دھوپ میں کھُلے آسمان کے نیچے ننگے سر کھڑی ہوں۔

اگلی صبح بابا کو رخصت کرنے سے پہلے مارچری سے گھر لایا گیا اور دوپہر تک انہیں سپردِ آتش کر کے اُن کے وجود کو بھی مٹا دیا گیا۔

بابا جاتے جاتے گھر کی رونق اور خوشیاں بھی ساتھ لے گئے۔گھر ویران ہو گیا۔وہ ایسا مرکز تھے جس کے اردگرد گھر کی کائنات گھومتی تھی۔ہر فرد اندر سے ٹوٹ گیا تھا مگر کوئی کسی کو اپنے زخم دکھاتا نہیں تھا۔ماں ہمارے سامنے نہیں روتی تھیں اور ہم ماں کو اپنے آنسو نہیں دکھاتے تھے۔بظاہر سب ہمت اور حوصلے سے کام لے رہے تھے مگر اندر سے سب ٹوٹ کر بکھر چکے تھے۔

وقت کا پہیہ کہاں رُکا ہے کسی کے لیے۔زندگی کا نظام یوں ہی چلتا رہتا ہے۔اس خوفناک تنہائی اور اداسیوں کے حصار سے نکل کر آنے میں ہم تینوں کو کئی سال لگ گئے۔

دو سال بعد ہم اپنے اُس گھر میں آ گئے تھے جس گھر کی بابا کو شدید تمنا تھی۔اُس دن اُن کی آتما کو یقیناً سکون ملا ہو گا جب اُن کی دی ہوئی چھت اُن کی بیٹیوں کے سر پر تھی۔فلیٹ کی آخری پائی تک انہوں نے ادا کی تھی مگر اوپر والے کا حکم نہیں تھا کہ وہ اپنے گھر میں ایک دن بھی سانس لے سکیں۔نہ جانے کون سے جنم کا قرض تھا جو وہ چکا کر چلے گئے۔

آج پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو خود کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ عمر کے چالیس سال مجھے بابا کی شفقت اُن کا ساتھ نصیب ہوا۔اُن کے زیرِ سایہ زندگی ہر ذمہ داری ہر فکر سے بے نیاز تھی۔لڑکیوں کو کم ہی نصیب ہوتا ہے اتنے لمبے عرصے کا ساتھ ورنہ یہ ساتھ تو پرائے گھر جاتے ہی چھوٹ جاتا ہے۔

بابا بے شک اس دنیا میں نہیں رہے مگر سب میں کچھ نہ کچھ حصہ اُن کا زندہ ہے۔وہ جا کر بھی سب میں زندہ ہیں۔کہتے ہیں رشتے ایک جنم کے نہیں جنم جنم کے ہوتے ہیں۔ہر رشتہ لین دین کا ہوتا ہے، حساب ابھی بھی باقی ہے۔کہانی ختم نہیں ہو سکتی یہ جنم جنم تک جاری رہے گی۔

ہر اک بات کا میری خدا رہے گا گواہ
ہر اک جنم کی ہے یہ اک جنم کی بات نہیں

جَوّال/محمُول

کیلکولیٹر	....	شُمارِندہ
ایش ٹرے	....	راکھ دان
سپیڈ بریکر	....	رَفتارِشکَن
پرُوف ریڈَر	....	عَیب جُو
ٹول پلازہ	....	راہداری
چیک پوسٹ	....	نُکتۂ تفتیش
کمپیوٹر	....	حاسبہ
موبائل فون	....	جَوّال/محمُول
ایپلیکیشَن	....	نِظامیہ/اِنطَباق
فونٹ	....	رَسم الخَط
اَپ ڈیٹ	....	تَجدید
ڈاؤنلوڈ	....	توڑنا/اُتارنا
فیس بک	....	کِتابِ رُخ
شیئر	....	اِشتَراک
پوک	....	کِہنی مارنا
ایس ایم ایس	....	پَیَچہ
وال	....	بام
اَپلوڈ	....	چڑھانا
ہارڈ کاپی	....	وَرَقی نَقل/نُسخہ
سافٹ کاپی	....	بَرَقی نَقل/نُسخہ
فوٹو کاپی	....	عَکسی نَقل
چارجر	....	بَرَقیہ

کوئی کبھی نہیں مرتا

(البانین کہانی)

اورنیلا ورپسی

ترجمہ: ظفرقریشی (نیویارک)

اورنیلا ورپسی (Ornela Vorpsi) تیرانہ، البانیا میں 1968ء میں پیدا ہوئیں۔ تیرانہ(Tirana) کی اکیڈمی آف فائن آرٹس میں انہوں نے تعلیم حاصل کی اور 1991ء میں وہ ترک وطن کر کے اٹلی چلی گئیں۔ 1997ء میں وہ پیرس منتقل ہوئیں جہاں وہ فوٹو گرافر، پینٹر اور ویڈیو آرٹسٹ کے طور پر کام کرتی ہیں۔''وہ ملک جہاں کوئی کبھی نہیں مرتا'' ان کا پہلا ناول ہے جس کے ایک باب کا یہ ترجمہ پیش خدمت ہے۔ ناول اطالوی زبان میں لکھا گیا تھا لیکن بعد میں اس کا فرانسیسی، ہسپانوی اور جرمن زبانوں میں ترجمہ شائع ہوا۔ اورنیلا ورپسی نے چار ناول تحریر کیے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں مصنفہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں پینٹر بنوں۔

☆

البانیا وہ ملک ہے جس کے باشندے کبھی نہیں مرتے۔ ان میں یہ خصوصیت اس طرح پیدا ہوئی کہ وہ رات کے کھانے کی میز یا دسترخوان پر قصداً زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ اس موقع پر (مقامی شراب) ''راکی'' کا استعمال آب پاشی کے مترادف ہوتا ہے اور صحت مند و توانا زیتون پر سرخ مرچوں کا چھڑکاؤ جراثیم کش ادویہ کا کام کرتا ہے۔ یہ ملغوبہ ہم البانوی باشندوں کے اجسام کو اتنا مضبوط بنا دیتا ہے کہ انہیں کوئی چیز تباہ نہیں کر سکتی۔

ہماری ریڑھ کی ہڈی فولادی ہوتی ہیں۔ آپ ان کے ساتھ جو چاہیں کریں، یہ سلامت رہتی ہیں اور بالفرض محال اگر کچھ ٹوٹ پھوٹ ہو بھی جائے تو ان کی مرمت ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک ہمارے دلوں کا تعلق ہے اگر وہ چربی میں ملفوف بھی ہو جائیں ان کی رفتار میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو جائے یا کوئی اور علت واقع ہو جائے وہ فتح مندانہ طریقے سے دھڑکتے رہتے ہیں۔ اس کیفیت میں مبتلا ہونے کے بعد ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ ہم البانیا میں ہیں۔ یہ ملک جس میں کوئی کبھی نہیں مرتا مٹی اور گرد و غبار کے خمیر سے بنا ہے۔ سورج اسے اتنا جلا دیتا ہے کہ اس کے انگور کی بیل کے پتے زنگ آلود لگتے ہیں اور انہیں دیکھ کر ہمارے دماغ بھی پگھلنے لگتے ہیں۔ اس قسم کے ماحول میں رہ کر یہاں کے باشندوں میں ایک خاص قسم کا احساس برتری پیدا ہو جاتا ہے اور جدھر دیکھو یہ صورتحال جڑی بوٹیوں کی طرح اُگتی اور پھلتی پھولتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا ایک اور شاخسانہ بے خوفی ہے گو عام خیال ہے کہ اس بے خوفی کی وجہ سے ہماری چپٹی کھوپڑیاں ہیں جو ہمارے اندر لاتعلقی پیدا کرتی ہیں جو بے ضمیری کی علامت ہوتی ہیں۔

اس ملک میں لفظ ''خوف'' کوئی معنی نہیں رکھتا۔ موقع ملے تو کسی البانوی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ ان کے اندر امر ہو جانے کی خواہش کلبلا رہی ہے۔ موت اس کے نزدیک ایک ایسی چیز ہے جس کا امر ہو جانے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

گرمیوں کے موسم میں صبح پانچ بجے اپنا سر اٹھاتی ہے۔ بڑے بوڑھے سات بجے اپنی کافی کا پہلا کپ پی رہے ہوتے ہیں۔ نوجوان دن کے بارہ بجے تک سو رہے ہوتے ہیں کیونکہ اس ملک میں خدا کا حکم ہے کہ وقت اطمینان کے ساتھ گزارو۔ اور گلی کے کونے میں واقع اس ریسٹورنٹ کے چبوترے پر گزارو جہاں بیٹھ کر تلخ ایسپریسو(Espresso) کافی پیتے ہوئے سڈول ٹانگوں پر آنکھیں سینکنے کا موقع ملے لیکن ٹانگوں کی مالکن پلٹ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کرے۔

جیسے جیسے گرم گرم کافی حلق سے اترتی جاتی ہے زبان، دل اور پیٹ کو یہ تپش متاثر کرتی ہے کیونکہ زندگی اب اتنی بری بھی نہیں ہے جتنی لوگ بتاتے ہیں۔

آپ یہ تلخ، سیاہ سیال حلق میں انڈیلتے جاتے ہیں اور پیچھے کاؤنٹر پر کھڑی خاتون جو شوہر سے لڑ کر نوکری کرنے آئی ہے، آپ کو غصیلی نظروں سے گھور کر دیکھتی ہے۔ ابھی تو صبح کے ساڑھے گیارہ بجے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ آپ کے پاس ضائع کرنے کے لیے بہت وقت ہے۔ اس عرصے میں کرنے کے ہزاروں کام ہیں۔ غروب آفتاب دور دور کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

اچانک شیفو (Xifo) اندر داخل ہوتی ہے۔ وہ اپنے کٹے پھٹے ہاتھ بے صبری سے مسل رہی ہے۔ وہ اپنے بیمار دل اور جگر کی کیفیت بیان کر رہی ہے، اس طرح جیسے وہ کوئی پرانی کہانی بیان کر رہی ہو جس کا خود اس سے کوئی متعلق نہ ہو۔ جیسے اس کا بیان تو اہمیت رکھتا ہو لیکن یہ اعضاء دور دراز کہیں پڑے ہوں۔ اس ملک کی یہ خاص بات ہے کہ یہاں ہر چیز مبالغہ آمیز اور مسخ شدہ لگتی ہے۔ اور پھر وہ اپنی آواز دھیمی کر لیتی ہے اور سازشی انداز میں کہتی ہے:

''وہ خبر آپ نے سنی؟ ہماری پڑوسن سوزی(Suzi) کا باپ گزشتہ شب نہاتے ہوئے گر کر مر گیا۔ کام سے واپس آیا تھا۔ کھانا کھایا اور غسل کرتے ہوئے اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔''

''نہیں۔۔۔ تم مذاق تو نہیں کر رہیں؟ وہ بے چارا اتنا جوان لگتا تھا!''

''اب ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ زندگی اکثر حیران کرتی ہے۔''

''اب یہی دیکھ لیجیے۔ ہمیشہ دوسرے ہی مرتے ہیں۔''

ایک ایسے ملک میں جہاں کسی کو زوال نہیں، زندگی اسی طرح گزرتی ہے ماسوائے ان لوگوں کے جو سوچتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہوگا دوسروں کو ہوگا۔ لیکن البانیا کے لوگوں کو موت سے عزیز کچھ اور چیزیں بھی ہیں مثال کے طور پر اگر کہا جائے کہ ان کی بقا کے علاوہ کوئی اور چیز انہیں عزیز نہیں تو یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔ ہاں،

ایک موضوع ایسا ہے جوانہیں بے حد عزیز ہے او جوان کے لیے بے پایاں مسرت کا باعث ہوتا ہے اور وہ ہے غیر شادی شدہ عورت اور مرد کی مباشرت۔ اس ذکر پر اُن کے دل جلتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی موضوع ان کے دلوں کو جھلسا دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ کبھی کوئی قصہ چھیڑ کر دیکھئے۔ کیا جوان کیا بوڑھے، کیا پڑھے لکھے اور کیا ان پڑھ سب کے سب اس توجہ کے ساتھ قصہ سنیں گے کہ سنتے سنتے وہ بھینگے ہو جائیں گے اور انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔ کچھ کہاوتیں جو ہمارے معاشرے میں جنم لے چکی ہیں یہ ہیں کہ لگتا ہے فطری طور پر ان کا وجود اس طرح ہوا ہے جیسے درختوں پر پتے اُگ آتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو آپ محسوس کریں گے کہ ان کہاوتوں کا تعلق عالمی سطح پر تسلیم کیے جانے والے اس مفروضے سے ہے کہ ہر خوبصورت لڑکی طوائف نہیں تو رنڈی ضرور ہوگی جبکہ بدصورت لڑکی اس اعزاز کی مستحق نہیں ہوتی۔

البانیا میں ہر لڑکی کو اپنے پاک باطن کی طرف خصوصی توجہ دینا ہوتی ہے۔ مرد ایک ٹکیہ صابن سے اپنے آپ کو دھو کر صاف ستھرا ہو سکتا ہے لیکن لڑکی۔۔۔خواہ وہ اپنے اوپر پورا سمندر انڈیل لے۔۔۔ہرگز پاک نہیں ہو سکتی۔

شوہر کاروباری وجوہ کی بنا پر شہر سے نکلا ہوا ہے یا جیل میں ہے۔ لوگ اس کی بیوی سے کہتے ہیں کہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنا شگاف سلوالے تا کہ کم از کم شوہر تو مطمئن رہے کہ جب تک وہ واپس نہیں آیا اس کی بیوی اس کی منتظر رہی ہے اور یہ کہ اس کی غیر حاضری کے دوران اس کی ٹانگوں کے درمیان موجود شگاف چھوٹا ہو گیا ہے۔ شوہر سے جدائی کا اس پر یہ اثر ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس ملک میں مردوں کی نجی ملکیت کے بارے میں حس اتنا ترقی پا چکی ہے کہ اب اس کے معمول کی طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری طرف جب بھی کوئی خوبصورت لڑکی، ریسٹورنٹ کے چبوترے کے قریب سے گزرتی ہے، اسے کافی کے کپ سے ابھرنے والی بھاپ سے زیادہ گرم آہوں اور سسکیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں جو اسے احساس دلاتی ہیں کہ وہ ان کی صبح کی تفریح میں خلل پیدا کر رہی ہے۔

"دیکھو تو کون ہے!" ایک آواز اس کے کان میں پڑتی ہے۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں کیا معلوم اس نے اپنا شگاف کتنی بار سلوایا اور کھلوایا ہے۔"

چلو۔۔۔مان لیا کہ ایسا ہی ہوا ہے مگر یہ گفتگو جاری رہتی ہے جو ایک خواہش ظاہر کرتی ہے۔ "اے انگرڈ (Ingrid)، پیاری انگرڈ۔۔۔کس نے گذشتہ شب تیری پیاری پیاری رانوں کے درمیان موجود ٹانکے کھولے تھے۔ اے حسین پری، میرے قریب آ۔۔۔ہمارا وعدہ ہے کہ جب ہم اپنا کام ختم کر لیں گے تو تجھے اتنی رقم ادا کریں گے کہ تو جا کر دوبارہ ٹانکے لگوالے۔"

پھر وہ اسے اتنا گھورتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ قریب سے گزرنے والی لڑکی غیر مرئی ہوگئی ہے۔ چبوترے پر بیٹھے کافی پیتے مرد اپنی نگاہوں سے اس طرح گھورتے ہیں کہ اسے لگتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے چھلنی ہوگئی ہے۔

ادھر گھر میں بھی یہی کہانی ہے۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" میری خالہ کہتی ہے "ہم تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلیں گے۔ وہ بتادے گا کہ تم کنواری ہو یا نہیں۔"

وہ دانت پیستے ہوئے یہ بات کہتی ہے۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے اس طرح گھورتی ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ اس کی نظریں میرے قتلے بنا رہی ہیں۔ میں ابھی صرف تیرہ سال کی ہوں اور میں نے دیکھا بھی نہیں ہے کہ مرد اپنی پتلون کے اندر کیا چھپا کر رکھتے ہیں۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ جو کچھ بھی ہے رات کو مرد اور عورت کے درمیان کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ اپنی خالاؤں کی گفتگو سن کر مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ میں مکمل رنڈی بننے والی ہوں۔ میری خالہ مجھے اس طرح گھور رہی ہے کہ میں شرم سے سرخ ہو جاتی ہوں۔

بستر میں گھستے ہوئے میں اتنی خوفزدہ تھی کہ میرا پورا جسم اکڑ گیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی "اگر وہ مجھے واقعی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں اور ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ میں پیدائشی کنواری نہیں ہوں، تب کیا ہوگا؟" آخر اندھے، بہرے، لنگڑے، لولے بچے بھی تو پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ایسے بچے بھی پیدا ہوتے ہوں جو فطری طور پر پارٹی کے وفادار نہ ہوتے ہوں!"

بالآخر مجھے نیند نے آ لیا تو میں اپنی خالہ سے کمرے کی خاموشی میں درخواست کر رہی تھی کہ میری صورت میں خاندان پر جو افتاد پڑنے والی ہے اسے تسلیم کر لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ "خالہ میں قسم کھاتی ہوں۔۔۔میں قسم کھاتی ہوں کہ میں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی ہے۔ دراصل میری پیدائش ہی ایسی ہے۔ آپ یقین کریں۔ میں قسم کھاتی ہوں۔"

اس ملک میں جہاں کوئی کبھی نہیں مرتا، ان میں میری خالہ بھی شامل ہے۔۔۔وہ بھی نہیں مرتی۔

عین ان دنوں میں ایک یکساں نوعیت کا خواب دیکھنے لگی۔ میں نے اس خواب کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا۔ تب میں ادھ کھلی آنکھوں سے سوتی بھی تھی۔ خواب میں میں اپنی خالہ کو مرتے دیکھتی تھی۔ میں دیکھتی تھی کہ میری خالہ کا جنازہ تیار ہو رہا ہے۔ اور یہ کہ میں نے سیاہ رنگ کی لیس والی شال اوڑھ رکھی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اس شال میں بہتر لگتی ہوں۔ خواب میں میں دیکھتی کہ میں نے مادام بوواری یا آنا کیرینینا (Madam Bovary or Ana Karenina) کی طرح شال اپنے گلے کے گرد لپیٹی ہوئی ہے۔ میں غم سے نڈھال تھی اس لیے کہ مجھے واقعی اپنی خالہ سے محبت تھی۔ زیادہ رونے کی وجہ سے میں کمزور ہو گئی تھی اور پیلی پڑ گئی تھی لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ مجھے اپنی خالہ کے غصے سے خوف آتا تھا۔ وہ اپنا غصہ ہمیشہ مجھ پر اتارا کرتی تھی چنانچہ یہی وجہ تھی کہ میں اس کی موت کی دعا مانگا کرتی تھی۔

میں بن باپ کی اولاد تھی اور یتیمی میں پرورش پاتی رہی۔ جب بڑی

ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ میں بدصورت نہیں تھی۔ بلاغت کی سمت میں جاتے ہوئے میرا واسطہ اس موضوع سے پڑا کہ عورت اور مرد کے تعلقات کی اصل نوعیت کیا ہوتی ہے۔

''ایک نہ ایک دن جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو یقینی طور پر بڑی رنڈی بنو گی۔ ہاں، میں جانتی ہوں'' میری خالہ اور میری خالہ زاد بہن جب بھی یہ بات کرتیں تو نہ جانے کیوں ان کی آواز لرز جاتی جیسے وہ مجھے کہنا چاہتی ہوں کہ تمہاری تردید سے یہ حقیقت تبدیل نہیں ہو گی۔ پھر وہ سر ہلاتے ہوئے کہتیں: ''ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتیں۔ تم ہماری مرضی سے یہاں نہیں آئیں۔ تمہیں ہماری گود میں ڈال دیا گیا تھا۔ جلد ہی جب تم اس گھر میں شرمندگی لاؤ گی ہم اسے ہضم کرنے پر مجبور ہوں گے۔ ہم اس شرمندگی کو روٹی کی طرح کھانے پر مجبور ہوں گے۔ ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ دیکھنا تم ایک نہ ایک دن اتنا بڑا پیٹ لے کر اس گھر میں داخل ہو گی۔'' یہ بات کہتے ہوئے میری خالہ اور میری خالہ زاد بہن کے چہروں پر تکلیف کے آثار ہوتے۔

گویا وہ شرمندگی کی روٹیاں چبانے پر مجبور کی جا رہی ہوں اور میرے دادا سامنے بیٹھے سگریٹ کے کاغذ میں تمباکو ڈال کر سگریٹ بنا رہے ہوتے۔

میرے لیے اپنے بڑے پیٹ کا خیال خوفناک ہوتا۔ کیا آپ نے کبھی باش (Bosch) کی کوئی پینٹنگ دیکھی ہے؟ اس کی ہر پینٹنگ کے کرداروں کے چہروں پر تکلیف کے آثار ہوتے۔ غم واندوہ اور پاگل پن ان کے چہروں سے عیاں ہوتا۔ ان شاہکاروں کے کردار ایک دوسرے سے چپکے ہوئے ہوتے جیسے دوزخ میں گناہ گار ارواح۔ مجھے اپنا بڑا پیٹ اور اس کے اندر تیرتی ہوئی آلائشیں واضح طور پر دکھائی دیتیں۔ بادامی اور گہرے سرخ رنگ کا سیال مادہ میرے اندر لبالب بھرا ہوتا۔ اتنا بڑا پیٹ تو کوئی نہیں چھپا سکتا اور اپنی کھال میں سے رینگ کر کوئی انسان باہر بھی نہیں نکل سکتا۔ ''تم پر نشان لگ چکا ہے۔ بڑے پیٹ کا مطلب ہے کہ تم مردوں کے ساتھ جھاڑیوں میں رنگ رلیاں مناتی رہی ہو۔'' یہ بات بھی مجھے خالہ اور اس کی بیٹی کے ذریعے معلوم ہوئی تھی کہ مرد اور عورت رنگ رلیاں جھاڑیوں ہی میں مناتے ہیں۔ رنگ رلیوں کو وہ کبھی ''سرگرمیوں'' کا نام دیتیں لیکن کبھی وضاحت نہیں کرتی تھیں۔ رنگ رلیوں سے ان کی مراد کیا ہے۔ میں نے بہرحال یہ مطلب اخذ کیا کہ اس کا مطلب شرمندگی کے کیڑوں کو اپنے جسم میں پال کر موٹا کرنا ہو گا۔ انہیں اپنی کوکھ پیش کرنا اور اس کے نتیجے میں اپنے جسم کو بدہیئت بنانا تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ آپ مردوں کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھیں۔ اپنا بنایا ہوا یہ عکس اتنا واضح تھا کہ آج بھی جب میرے دماغ میں یہ خیال آتا ہے تو میں لرز کر رہ جاتی ہوں۔ خاص طور پر جب کوئی حاملہ عورت میرے سامنے سے گزرتی ہے تو اس خیال کو دماغ سے نکالنے میں مجھے دشواری ہوتی ہے کہ یہ عورت جھاڑیوں میں مردوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہی ہو گی۔

بات یہ ہے کہ میرے پیارے وطن کے لوگوں ایک اچھی سی غمگین کہانی درکار تھی۔ انہیں اٹھتے بیٹھتے ایسی کہانیوں کی تلاش ہوتی تھی جو غمزدہ کرنے کی اہل ہوں۔ کوئی بات ہو یا نہ ہو یہ لوگ غمگین کہانیاں گھڑنے کی خداداد صلاحیت رکھتے ہیں۔ شاید اسی لیے خدا نے ہمیں مٹی پر مٹی سے خلق کیا ہے۔

بچپن میں میں جب بھی بیمار ہوتی، گھر کا ہر فرد میرے ساتھ لاڈ پیار کرنے لگتا۔ وہ باری باری میرے کمرے میں آتے اور مجھے گلے لگا کر سرگوشی میں مجھے ''میری جان!'' اور ''میری پیاری!'' کہا کرتے۔ کمرے سے نکلتے ہوئے ان کے لبوں پر ''بیچاری'' ضرور ہوتا۔ میرے لیے مزے مزے کے کھانے تیار کیے جاتے۔ یہ سوچے بغیر کہ بیماری نے میری بھوک پیاس مٹا دی ہو گی اور ذائقہ بھی چھین لیا ہو گا۔ میں ان برتنوں کی جانب نہایت بیچارگی سے دیکھا کرتی جن میں طرح طرح کے مربّے اور چٹنیاں ہوتی تھیں۔ کوفتے اور کھانے پینے کی دیگر اشیاء میرے بستر کے قریب ایک میز پر سجا کر رکھی جاتی تھیں۔ میں بڑی محبت سے ان کی طرف دیکھتی لیکن جلد ہی نظریں ہٹا لیتی کیونکہ زیادہ توجہ سے دیکھنے پر مجھے چکر آنے لگتے۔

بیماری کے زمانے میں میری والدہ، میری خالہ اور دیگر گھر والے اچانک تبدیل ہو جاتے اور مجھ پر اپنی ساری محبت اور شفقت نچھاور کرنے لگتے اور مجھے یقین ہو جاتا کہ ان لوگوں کا اسی طرح ساتھ رہا تو میں مستقبل میں انہیں کے خدشات کے برعکس کبھی شرمندہ نہیں کروں گی اور جھاڑیوں میں رنگ رلیوں وغیرہ سے دور رہوں گی۔

جب تک میں بیمار رہتی سب میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آتے۔ مجھ پر چیخنا تو درکنار کوئی اونچی آواز میں بھی بات نہ کرتا۔ ہانڈی چولہے سے دور رکھا جاتا اور میں جتنی دیر تک چاہتی سوتی رہتی، حد یہ ہے کہ مجھ سے دھان سے چاول الگ کرنے کا کام بھی نہیں لیا جاتا۔ چولہے کے لیے چھوٹے ٹکڑے کرنے کے کام سے بھی مجھے دور رکھا جاتا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بیماری کے دوران کسی کو یاد بھی نہ آتا کہ بڑی ہو کر یقینی طور پر رنڈی بننا میری قسمت میں لکھا ہے۔ ہاں، جیسے ہی میں روبصحت ہوتی میرے تمام اعزازات اور القاب مجھے لوٹا دیے جاتے۔ صحت مند ہوتے ہی بستر چھوڑنے کے ساتھ ذلتوں اور رسوائیوں کے ہار دوبارہ میرے گلے میں ڈال دیے جاتے۔ میں ایک بار پھر مستقبل کی طوائف ہو جاتی۔ میرے بستر کے ساتھ والی میز سے اشیائے خوردنی غائب ہو جاتیں اور ان بچوں کے بستروں کے قریب پہنچ جاتیں جو میرے بعد بیمار ہوتے۔ مختصراً میں اپنے گھر کے بارے میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ ہمارے ہاں اچھا کھانا صرف اسی بچے کو مل سکتا ہے جو قریب المرگ ہو۔

ہمارے پیارے ملک میں جہاں کوئی کبھی نہیں مرتا اور جب کوئی مر ہی جاتا ہے تو اس کی لاش اٹھانا اس لیے دوبھر ہو جاتا ہے کہ لاش اتنی بھاری ہو

جاتی ہے کہ لگتا ہے کہ اس کے اندر سیسہ بھرا ہوا ہے۔اس محبوب ملک میں ایک مقبول عام کہاوت ہے کہ ''زندہ رہوتا کہ میں تم سے نفرت کرسکوں اور مروتا کہ میں تمہارا غم منا سکوں۔'' یہ کہاوت اس قدر مقبول ہے کہ قدم قدم اور لمحہ بہ لمحہ گونجتی ہے۔جب کوئی بالآخر مر جاتا ہے تو اس کی برائی نہیں کی جاتی بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ اس کے بارے میں منفی خیالات بھی ترک کر دیے جاتے ہیں۔اسے کہتے ہیں موت کا صحیح معنوں میں احترام۔یہاں مجھے یہ بھی عرض کرنے دیجیے کہ البانیا میں کسی کا احترام حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔احترام کے لائق وہ ہے جو مرض الموت میں مبتلا ہوتا ہے۔آخری سانس کے نکلنے تک وہ شخص محترم نہیں ہوتا۔جب کوئی آخر کار مر جاتا ہے تو اس کے مرتے ہی لوگوں کو اس کی خوبیوں کا اچانک احساس ہونے لگتا ہے۔مرد اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے مالک ہو جاتے ہیں اور عورتوں کو پاکباز ترین حور پری کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔لوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔جانی دشمن بھی اپنا غصہ تھوک کر متوفی کی خوبیوں کا ذکر کرتے سوگ مناتے ہیں۔

لیکن کبھی کبھی میری خالہ وہ دوسری کہاوت بیان کرتی ہے جو کسی زمانے میں پہلی کہاوت جتنی مقبول ہوا کرتی تھی۔یہ دوسری کہاوت بیان کرتے ہوئے میری خالہ کی آواز میں لرزش پیدا ہو جاتی تھی: ''تمہارے لوگ (رشتہ دار) یقیناً تمہارا گوشت کھا جائیں گے لیکن کم از کم ہڈیاں تو بچا ہی لیں گے۔'' یہ کہاوت بیان کرتے ہوئے میری خالہ کی آواز بھرّا جاتی تھی۔ایک دفعہ میں نے ان سے کہا: ''مگر خالہ جب وہ میرا گوشت کھا جائیں گے تو میری ہڈیاں بچا کر کیا کریں گے؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہڈیاں پھینک دیں؟'' اس کے جواب میں وہ مجھے اس طرح گھور کر دیکھتی تھیں کہ میں کھڑے کھڑے راکھ ہو جاؤں۔ان کا مجھے اس طرح گھورنا ظاہر کرتا تھا کہ میں اپنی ماں کے اعلیٰ وارفع خاندان کی فرد نہیں۔میں ایک بدقسمت حادثہ تھی کیونکہ میری شکل وصورت اور حلیہ میرے باپ کا تھا۔ ''اپنا منہ بند کرنا ہنجار لڑکی۔تو بالکل اپنے باپ پر گئی ہے۔''

میں نے اپنا منہ بند کرلیا اور دوبارہ بیمار ہونے کی دعا کرنے لگی۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں چھ سات سال کی تھی تو کبھی کبھی اپنی ماں کے ساتھ لگ کر سویا کرتی تھی۔ایک رات خاص طور پر میں اس وقت بہت پریشان ہوئی تھی جب مجھے احساس ہوا کہ میری ماں، میری کائنات کا مرکز نہایت کمزور عورت ہے۔

ہوا یہ تھا کہ ان دنوں میں معمولی سے فلو کا شکار تھی۔وہ فلو جو عموماً بچوں کو ہوتا ہے۔اس کی وجہ سے مجھے بستر میں لیٹنا پڑ گیا۔میں لیٹے لیٹے کچھ رنگین تصوروں والی کتاب دیکھ رہی تھی۔ان کتابوں میں ایک کتاب میرے ایک کزن کی تھی جو مجھ سے دو سال بڑا تھا۔یہ کتاب انسانی جسم کی رنگین تصویروں کی تھی۔رنگا رنگ رگ پٹھوں والے انسانی اجسام کی تصویروں والی یہ کتاب مجھے بہت پسند آئی تھی۔مختلف اندرونی اعضاء، ہڈیاں اور لمبی نیلی نیلی رگوں کے خاکوں سے مزین یہ کتاب دیکھتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ یہ ہم ہیں، رگوں، پٹھوں اور جسم کی مچھلیوں پر مشتمل ایک جال تھا جسے ہماری کھال نے یکجا کر رکھا تھا۔عجیب و غریب اندرونی اعضاء کے خاکے تھے جن پر ہمارا یہ میرا زور نہیں چلتا تھا۔کچھ سمجھ میں آئیں کھال اور ہڈیاں؟

لیکن اے خدا یہ سب کیسے کام کرتے تھے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ تمام پرزے کس طرح یکجا کر کے جسم میں ڈالے جاتے ہیں۔لیکن میرے ذہن میں پھر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ یہ اعضا مجموعی طور پر اتنے ناقابل بھروسہ کیوں ہوتے ہیں۔میں سوچتی تھی کہ کیا قرب و جوار میں کوئی ایسی قوت ہے جسے میں خدا کہہ سکوں اور جس کی خدمت میں میں درخواست دے کر انسانی اعضاء کی کمزوریوں کو دور کروا سکوں؟ میری ماں بے چاری تو میرے لیے کچھ نہیں کر سکی کیونکہ وہ بھی میری طرح گوشت و پوست اور ہڈیوں سے بنی ہوئی تھی۔

اپنی ماں کے ساتھ لیٹتے ہوئے مجھے اس کی بے چارگی کا احساس ہوتا لیکن ساتھ ہی اس کی جانی پہچانی خوشبو مجھے مطمئن کر دیتی تھی۔یہ خیال کہ یہ میری ماں ہے جس سے میں محبت کرتی ہوں مجھے نہال کر دیتا تھا لیکن ساتھ ہی میں خوفزدہ بھی ہو جاتی تھی کہ وہ بہت کمزور تھی۔اس کی کمزوری مجھے حواس باختہ کر دیتی تھی اور میں بار بار ایک ہی بات دہراتی تھی کہ میں خوفزدہ ہوں۔میں اس سے کہتی: ''ماں۔تمہارا گوشت و پوست اور ہڈیوں سے بنا ہونا مجھے ڈراتا ہے۔'' میری ماں میری بات سمجھے بغیر میرے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیتی کہ اس کا یہ عمل میرا خوف دور کر دے گا۔پھر وہ پچکارتے ہوئے سرگوشی میں مجھ سے بات کرنے لگتی۔ان دنوں ہم تہہ خانے میں رہا کرتے تھے جس کے باورچی خانے میں نمی ہوا کرتی تھی۔باورچی خانے کے فرش پر سفید ٹائل تھے اور ہم اسی کے ایک حصے میں بستر بچھا کر سویا کرتے تھے۔وہیں پر ایک صوفہ بھی رکھا تھا جس کے قریب ایک ٹائل پر ایک انار کے بیج جتنا سرخ خون جیسا دھبا تھا۔میں نے اس دھبّے کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کی۔میں نے صابن کے ذریعے بھی صاف کرنے کی کوشش کی تھی لیکن دھبّہ غائب ہو کر نہیں دیتا تھا۔روز صفائی کے دوران میں یہ کوشش کرتی لیکن دھبّے کا اصرار تھا کہ میں اس بہانے اس کے ساتھ کچھ وقت گزاروں۔مجھے لگا کہ دھبّہ غمزدہ ہے چنانچہ جب میں اسے کپڑے سے پونچھ کر صاف کرتی تو اس عمل میں سختی نہ ہوتی اور میں اس پیار سے سہلا دیتی۔

میرا خیال تھا کہ دھبّے کے ساتھ کوئی تکلیف دہ واردات کی کہانی وابستہ ہے۔گزرتے وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ مجھے محسوس ہونے لگتا کہ یہ دھبّہ میری ماں کے خون کا قطرہ ہے۔کچھ عرصے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ یہ دھبّہ خون کا قطرہ ہے اور اس وقت گرا ہے جب میرا باپ میری ماں کو مارتا تھا۔میں نے اس واقعے کے بارے میں اتنی بار سوچا کہ آخر کار مجھے پوری واردات ایک فلم کی طرح میری نظروں کے آگے سے گزرنے لگی۔مجھے لگا کہ میرے باپ نے میری ماں کو فرش پر گرا دیا ہے اور اسے مار رہا ہے۔سارا منظر مجھے واضح طور پر دکھائی دے رہا

تھا۔رفتہ رفتہ مجھے یقین ہو گیا کہ خون کا وہ قطرہ اسی لڑائی کے دوران فرش کے ٹائل پر گرا تھا۔

وہ قطرہ بہت ڈھیٹ تھا۔اپنی جگہ سے ہلتا ہی نہیں تھا۔

ایک دن ہمت کر کے میں نے اپنی ماں سے پوچھ ہی لیا۔سوال کرتے وقت میں بغور اپنی ماں کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔''ماں!'' میں نے پوچھا'' وہ سرخ رنگ کا بیج کیا ہے؟ سفید ٹائل کے عین بیچ میں کیا وہ مضحکہ خیز نہیں لگتا؟'' میرا خیال تھا کہ بالآخر وہ مجھے سچ سچ سب کچھ بتادے گی کہ وہ دھبّہ اسی کے خون کا ہے لیکن میری ماں نے سادگی سے کہا: ''شاید ٹائل بنانے والوں کی غلطی سے یہ سرخ دھبّہ پڑا ہے۔کوئی بڑی بات نہیں ہے۔پروڈکشن میں اس قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔''

میری ماں بے حد حسین تھی۔وہ گھنٹوں اپنے بناؤ سنگھار میں مصروف رہتی۔بالوں میں کنگھی کرتی،سرخ ہونٹوں پر کاجل کے قلم سے لکیر بناتی۔تنگ لباس پہنتی،رنگ برنگا ہینڈ بیگ (Hand Bag) کندھے پر ڈال کر آئینے میں خود کو متعدد بار دیکھ کر مجھ سے مخاطب ہوتی: ''گھر سے نہ نکلنا،کوئی شرارت نہ کرنا۔میں نانی کی طرف جارہی ہوں۔جلد واپس آجاؤں گی۔''

یہ کہہ کر وہ گھر سے نکل جاتی۔وہ ہر روز شام کو نانی کی طرف جاتی۔ہمارے مردوں کی بھوکی نظریں اس کی متلاشی ہوتیں۔حاسد عورتیں اس کی ہر جنبش پر نظر رکھتیں۔مجھے ان کی آنکھوں میں جلن اور حسد دکھائی دیتا۔وہ جس انداز میں میری ماں کو دیکھتیں مجھے لگتا کہ ان کی رگوں میں لہو نہیں تیزاب بہہ رہا ہے جس کے چند قطرے ایک قلعے کو یا ایک شہر کو تباہ و برباد کر دیں۔اگر ان کا بس چلتا تو وہ میری ماں کا گوشت نوچ نوچ کر کھا جاتیں یا اسے بھوکے کتوں کے حوالے کر دیتیں۔

''اپنا خیال رکھنا،ماں'' میں اونچی آواز میں اس سے کہتی۔

نانی کے پاس روز وہ اس لیے جاتی تھی کہ وہ چاہتی تھی کہ لوگ اسے دیکھیں اور اسے اپنانے کی خواہش کریں۔مرد سرگوشی میں اس سے کہتے: ''دیلا (Diella) تم کتنی حسین ہو۔میں تمہاری ہڈیاں اور گوشت و پوست سب کچھ کھا سکتا ہوں۔یا خدا۔۔۔دیلا تم اپنی ٹانگیں تو دیکھو! کتنی ململ ہیں۔شیمپین کو بوتل جیسی!''

یہاں،اس لمحے میں عرض کروں گی کہ اس ملک میں شیمپین نام کی کوئی شے نہیں ہوا کرتی لیکن لوگ کسی چیز کی تعریف میں یہی لفظ استعمال کیا کرتے تھے۔لوگوں نے شیمپین چکھی بھی نہیں تھی لیکن یہ ایک خواب جیسی چیز کا نام ضرور لیا کرتے تھے جو انہیں بیمار بھی کر دیا کرتی تھی۔

دیلا کی ٹانگیں شیمپین جیسی تھیں یا شاید وہ کہنا چاہتے تھے کہ دیلا کی ٹانگیں شیمپین کی بوتلوں جیسی تھیں۔وہ اپنی گردن اٹھا کر چلتی تھی۔شاہراہ پر چلتے ہوئے اس کے کانوں میں حسن کے حوالے سے تعریفی کلمات پڑتے جو وہ نظرانداز کرتی۔وہ ابھی جوان تھی۔اٹھائیس برس کی عمر کو جوانی ہی کہا جائے گا۔وہ روز نانی سے ملنے جاتی رہی اور وقت گزرتا رہا۔

اس کی شادی کی تصویریں الماری کے ایک کونے میں پڑی تھیں۔ان تصویروں میں سے ایک تصویر مجھے خاص طور پر بہت پسند تھی۔بار بار یہ تصویر دیکھنے کے باوجود میرا دل نہیں بھرتا تھا۔تصویر کیا تھی روشنی اور سائے کا کھیل تھا۔میری ماں نے جالی کی اوڑھنی سے اپنے بالوں کو جس طرح چھپایا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ تصویر شادی سے ذرا پہلے کی تھی اور اس کے چہرے کی دمک سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس دن کے انتظار میں اس نے اپنا رکھ رکھاؤ بھی بھلا دیا تھا۔

ہمارے ملک میں یہ روایت ہے کہ اپنی شادی کے موقع پر دلہن کچھ رولیتی ہے تاکہ دنیا کو بتائے کہ ماں باپ کا گھر چھوڑتے ہوئے وہ کتنی غمزدہ ہے گویا ہم پیدائش کے وقت روتی ہیں تو یہی عمل شادی کے وقت دہراتی ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ تصویر پر بادامی رنگ کا ایک دھبّہ پیدا ہوا جو میری ماں کی داہنی آنکھ سے اس کی کنپٹی تک پھیلا ہوا تھا جو آہستہ آہستہ بڑا ہو رہا تھا حتی کہ میری ماں کے پورے جسم کو اس نے چھپا لیا۔دھبّہ کیوں پیدا ہوا تھا؟ بہت غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ دھبّہ الماری میں نمی کے سبب پیدا ہوا تھا۔اس دھبّے نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی تھی کیونکہ اس کی وجہ سے میری ماں بیمار اور اداس نظر آتی تھی۔اس تصویر کے بارے میں میں جب بھی سوچتی میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے کیونکہ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں اس کی وہ تصویر آجاتی جس میں اس کے بال سفید تھے۔

میں نے تصویر کو بچانے کی خاطر الماری سے نکال لیا اور سوچنے لگی کہ اگر میں اسے البم میں لگادوں تو شاید وہ دھبّہ غائب ہو جائے لیکن دھبّہ غائب تو نہ ہوا بلکہ پھیلنے لگا۔اور پھر ایک دن ہم نے تہہ خانے والا وہ گھر چھوڑ دیا۔منتقلی کے دوران یا بعد میں زندگی کی اٹھا پٹخ میں تصویر ہی گم ہو گئی لیکن وہ دھبّہ میرے دماغ میں قائم رہا۔ایک متعدی مرض کی طرح اس دھبّے نے مجھے متاثر کیا تھا۔آج بھی جب وہ تصویر مجھے یاد آتی ہے میں وہ دھبّہ دیکھتی ہوں جو میری ماں کی داہنی آنکھ سے کنپٹی تک پھیلا ہوا تھا۔مجھے یقین ہے کہ اب وہ اپنا غم چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتی ہوگی۔اور فرش کی سفید ٹائلوں میں سے ایک ٹائل پر موجود انار دانے کے برابر سرخ بیج آج تک میرے اندر ہے اور میں نے نانی کے گھر جانا بند کر دیا ہے۔

کیوں؟

''میں چاہتا تو دنیا کے تمام یہودیوں کو ختم کر سکتا تھا مگر کچھ یہودی میں نے اس لیے چھوڑ دیے تاکہ دنیا کو پتہ چل سکے کہ میں نے یہودیوں کو کیوں قتل کیا''

اوڈلف ہٹلر

''انجیل کے اوراق''

میرا دم گُھٹتا ہے

اسلم گورداسپوری
(لاہور)

اینٹ سے اینٹ بجا دو، میرا دم گُھٹتا ہے
اب کوئی حشر اُٹھا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

اِن کو معلوم ہو اِنسان کی عظمت کیا ہے
اِن کو انجیل پڑھا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

آج تک تُم نے مُجھے موروملخ ہی سمجھا
مُجھ کو اِنسان بنا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

اِن سے ممکن ہی نہیں تازہ ہواؤں کا وُرود
اِن فصیلوں کو گرا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

میں کے صدیوں سے ہوں اِس طوقِ غلامی کا اسیر
مُجھ کو آزاد کرا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

میں کے صدیوں سے ہوں تہذیب کی نفرت کا شکار
اِس تعصب کو مٹا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

میری گردن پہ ہے صدیوں سے عدو کا پاؤں
میری گردن کو چھڑا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

جبر سے کیا میری مر کر ہی خلاصی ہو گی
ظلم سے جان چھڑا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

توڑ دو نسل پرستی کے صنم خانوں کو
ایسی تخصیص مِٹا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

اِن کو شاید ہو مسیحا کی اذیت محسوس
اِن کو تثلیث دِکھا دو میرا، میرا دم گُھٹتا ہے

دیکھ لیں لوگ کہ گورے ہیں کہ کالے وحشی
میری تصویر دکھا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

میں تو مجرم ہوں عدالت میں مُجھے پیش کرو
مُجھ کو تُم خود نہ سزا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

میری انجیل کے اوراق میں تدفین کرو
میری تربت پہ لکھا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

میرا اظہارِ تکلم میری خاموشی ہے
میرا پیغام سُنا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

ایسا مسکن کہ جہاں سانس ہو لینا مُشکل
ایسے مسکن کو جلا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

اِس سے بڑھ کر تو میں کُچھ کہہ نہیں سکتا اسلم
ساری دُنیا کو بتا دو، میرا دم گُھٹتا ہے

لہو کا ایک رنگ ہے

امجد اسلام امجد
(لاہور)

ایک طاقتور، تکبر سے بھرے گھٹنے تلے
چیختا، فریاد کرتا، بلبلاتا ایک سر
جس کے گرداگرد پھرتے
بے حس و سفاک آنکھوں سے یہ منظر دیکھتے
آدمی کا روپ دھارے، جانور
امن اور قانون کے ضامن وہ پتھر کے خدا
اپنی رنگت کی فضیلت کے نشے میں مبتلا
سب وہ قاتل بھیڑیئے
کھردری کالی سڑک پہ بین کرتا
رات جیسی کھال کا اک آدمی
مانگتا تھا بھیک کے انداز میں
سانس لینے کا وہ حق دائمی
جس میں رنگ و نسل کی تفریق ہو سکتی نہیں
اس کی چیخوں اور کراہوں کا مگر کوئی اثر
اُن کے نخوت سے بھرے کانوں تلک آتا نہ تھا
اُس کی آنکھوں کی چمک بجھتی گئی
پھر بھی وہ گھٹنا وہیں ٹھہرا رہا
موت سارے راستے دھندلا گئی

کالی چمڑی کو سفیدی کھا گئی
اُس تعصب سے بھرے گھٹنے تلے
بے حس و حرکت پڑے اس ایک سر کی خامشی
کس طرح سڑکوں پہ آنکھوں اور سینوں میں ہوئی ہے لب کشا
ظالموں نے یہ کبھی سوچا نہ تھا
آج دنیا بھر میں مل کر چیختی خلق خدا
کر رہی ہے پھر سے اُس بھولے سبق کی ابتدا
جو کبھی گونجا تھا جلتے دشت کی پہنائی میں
''کوئی گورا ہو کہ کالا
فرق ان میں کچھ نہیں ہے رنگ کی بنیاد پر
ایک ہی آدم کی ہیں اولاد سب
ساری مخلوقات کا ہے ایک رب''
کیسے اس پیغام عالی شان کی یاد عزیز
مرتی آنکھیں زندگی سے بھر گئی!
کس طرح اک آن میں لاکھوں چراغ
بجھ کے اک آواز، روشن کر گئی!!

○

سیاہ مٹی سے اُگا اُجالا

(جورج فلوئیڈ کے نام)

پروین شیر
(نیوجرسی)

کالی مٹی سے پھوٹے اک
نرم اُجالے کی فریادیں گونجیں
اُس کی آہیں گونں
''ماں..............!
مجھ پر یہ اُجلی کینچلی والے کالے اژدر
ٹوٹ پڑے ہیں
روشنیوں کے خول میں تاریکی کے چیتے
جھپٹ پڑے ہیں
میرے قدموں سے سب رستے
چھین رہے ہیں
میری رگوں میں لاکھوں کنکریاں چبھتی ہیں
درد کی لوء بڑھتی جاتی ہے
منت کے خالی کشکول میں
رحم کا اک سکہ بھی نہیں ہے
پھسل رہا ہوں گہری خندق میں
سب منظر اب مجھ سے منہ پھیر رہے ہیں
اک اونچی چٹان کے وزنی پاؤں کے نیچے
سانسوں کے سب شیشے چکنا چور ہوئے ہیں''

کالی مٹی کا وہ قالب
ظلم کی دہکی آگ کا ایندھن
فریادوں کی لاشوں کے انبار پہ اب خاموش پڑا ہے
اُس کی پلکوں پہ جامد سب کرب کے قطرے
پگھل پگھل کر
لاکھوں آنکھوں سے اب ہر سو
چھلک رہے ہیں
ٹوٹی سانسوں کی ہر انگلی
کتنی گرہیں کھول رہی ہے
الجھے دھاگے سلجھاتی ہے
دلوں کی گلیوں میں اُس کی آہیں بکھری ہیں
اک کالے نقطے سے نکلے ہیں اب لاکھوں سورج
سیاہ افق پہ ان کی کرنیں لکھتی ہیں اب نئی کہانی....!

○

''محبتوں کے چراغ''

(بہن کے وصال پر)

مورخہ ۲۷۔مئی ۲۰۲۰ء

مشیر طالب (نیویارک)

بہن ہی ماں کی محبت کا اک تسلسل تھا
بہن کی موت سے وہ سلسلہ بھی ٹوٹ گیا
نصیبِ زیست بھی ہے کسقدر خزاں افروز
کہ ہم سے دامن خوشبو بھی آج چھوٹ گیا

وہی تھی بھائی کے درمانِ زندگی کا سراغ
اسی کے دم سے تھے روشن محبتوں کے چراغ
وہ دیوی آج محبت کی ہو گئی خاموش
دلوں کے دے گئی اپنی جدائیوں کے داغ

وہ جس کے دل میں تھیں بھائی کے نام کی دھڑکن
وجود جس کا تھا بھائی کو ایک فخرِ تمام
وہ چشمِ نم کے جھروکوں پہ منتظر ہی رہی
نراش، دید کی پیاسی ، گئی وہ تشنہ کام

کہاں تلاش کریں مامتا کی بے لوثی
کسے یہ غم کہ کوئی بے متاعِ دَھر بھی ہے
نظر پلٹ کے چلی آتی ہے پھر آنکھوں میں
فضاؤں میں گھلا حرص وطمع کا زہر بھی ہے

ستمگرانا ''کرونا'' کے اس رویہ سے
ہر اک نفس ہوا محصور اپنے آنگن میں
نہ آنا جانا نہ ملنا نہ دید کا امکان
اجل نے خوف اگائے ہیں لبستی و بن میں

تمہاری یاد کی شبنم جمے گی پلکوں پہ
تو خشک دامنِ دل سے کیا کریں گے ہم
اٹھے گی ہُوک تو شاید نہ ضبط ہوں آنسو
تمہارے پلّو کی خواہش کیا کریں گے ہم

بہت اداس ہیں، غمگین سارے بچے ہیں
ابھی ابھی تھیں یہاں تم اور اب نہیں ہو یہاں
بس ایک ساعتِ بے رحم درمیاں آیا
تمہارا ہونا عدم ہو گیا، نظر سے نہاں

تمہارے بعد بھی سینے میں سانس آئے گی
لہو بھی دھڑکنیں دل کی بحال رکھے گا
یہی رہیں گے یہاں زندگی کے سب معمول
یہ اپنی دنیا! خدا خود سنبھال رکھے گا

قرارِ دل کے لیے ہیں دعا گو میرے لیے
مرے حبیب، مرے دوست، میرے ہم انفاس
میسر ہیں مجھے لمحاتِ شکرِ ہم نفساں
بشکرِ رب! ہیں رفیقاں غم یہ میرے پاس

کتبہ آخری متن نہیں ہے

جمیل احمد عدیل
(لاہور)

اپنے بے جان ہونے پہ نازاں
آنکھوں کے چور نے
کسی سہولت کار روزن کو چن تو لیا
لیکن اس کم عیار کے ہاتھوں
احتیاطی تدابیر
یا
مدافعتی نظام کی تضحیک نہیں ہوئی
اس نے ان سجدوں کو شرمسار کیا ہے
جو سلامتی کے ضمانتی بنے تھے
وہ بے نفسی اہانت کا ہدف ٹھیری ہے
جس کی زبان سے کبھی نہیں نکلا:
'سردی ہے'!
بلکہ اس کا اسلوب یہی رہا:
'وہ سردی کرتا ہے'!

شفاخانے میں مامور
بن بیاہی کارندہ کے لیے
اب جو چھ فٹ کے بجائے
بارہ فٹ گہرا گڑھا کھودا گیا ہے
اس زمین دوز عمیق غار کو
کیا دائمی رفیق اپنے لیے وسیع پائے گا
یا کھائیوں میں سمٹنا
اس کی تقدیر ہو چکا؟
کھدائی کے شوقینو!

خلا کی وجود پذیری
اور اس کو بھرنے کے عمل میں سے
کون سا ورژن منفی ہے
کون سا مثبت؟
حاصل تو خیر صفر ہے
اسی صفر سے
قہقہہ اور گریہ کا بیک وقت پھوٹنا
شہادت اور ہلاکت کا دو ہندسوں میں تقسیم ہونا
ہاں
سچ کا حتمی پیمانہ ایجاد ہونے تک
سب چلتا رہے گا

مکمل حفاظتی کٹس میں سرتاپا غرق
تم دونوں اجنبی
میت کو لیور کی مدد سے
مہیب لحد میں اتار کر
اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاو
اور فی الفور اس لق ودق مقام کو چھوڑ دو

کیا ہوا
اگر اس چٹیل ویرانے کے حاشیے میں
ایک تنہا مرقد بنے گی
کوئی مرکز ہو تو مرکز کی آرزو کی جائے
بالفرض قبور کے بیچوں بیچ
یہ معمول کی قبر ہوتی
تو، وجود کا متن، زیادہ سے زیادہ
کتبے کے متن میں منتقل ہو جاتا
لیکن کتبہ بھی کب آخری متن ہے!!

جمیل عثمان
(نیو یارک)

امید

غم نہ کر اے دل وصال یار کے دن آئیں گے
محفلیں پھر گرم ہوں گی دوست پھر مل جائیں گے

پھر چلیں گے کوئے جاناں کی طرف دیدار کو
بام سے اپنی جھلک وہ پھر ہمیں دکھلائیں گے

پھر گلے باہم ملیں گے، ہوں گے پھر شیر وشکر
پھر محبت کے ترانے مل کے ہم سب گائیں گے

پھر سرود و رقص کے ہوں گے وہ ہنگامے بپا
پھر دوپٹوں کے پھریرے جا بجا لہرائیں گے

چاندنی راتوں میں پھر ملنے کے ہوں گے سلسلے
پھر وفور شوق سے دیوانے کھنچتے آئیں گے

وصل کی شب پہلوئے جاناں میں ہو گی پھر بسر
ہجر کے مارے ہوئے اپنی مرادیں پائیں گے

پھر سمندر کے کنارے ریت پر چلتے ہوئے
صبح کی پہلی کرن سے روح کو گرمائیں گے

آ ملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک
جو بھی ہوں شکوے گلے پہلے کے سب مٹ جائیں گے

○

یاس

شہر ویراں، کوچہ و بازار سنساں، دل اداس
زندگی آمیزۂ مایوسی و خوف و ہراس

انبساط و کیف عنقا، بیش ء حزن و ملال
کوچۂ جاناں حزیں، محبوب دلکش نا سپاس

ہے مقفل خانۂ رب کریم و ذو الجلال
وائے حسرت بند ہے باب خشوع و التماس

ہو گئے محروم اب لطف خداوندی سے ہم
آج مسلم جا نہیں سکتا حرم کے آس پاس

یہ بھی ہے قہر خداوندی کہ ہم سب آج ہیں
راندۂ درگاہ، بے مایہ و منزل نا شناس

○

میں سانس نہیں لے سکتا!!!

(امریکہ میں جارج فلوئڈ (George Floyd) کے ساتھ
انتہائی ناروا سلوک اور موت پر لکھی ہوئی انگریزی نظم کا ترجمہ)

جے آدم میلا پر
ترجمہ: فرح کامران
(نیویارک)

میں سانس نہیں لے سکتا افسر، میں سانس نہیں لے سکتا
مجھے اس طرح نیچے مت گھسیٹو
میں برا آدمی نہیں ہوں، میں حشیش نہیں لیتا
میں مدد کے لئے چلا رہا ہوں، موت سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہوں

میں بس ایک کالا آدمی ہوں، میں خوفناک نہیں ہوں
میں بھی انسان ہوں جو آزادی سے جینا چاہتا ہے
لیکن ہمیشہ کالے لوگ ہی غلامی کا شکار کیوں ہوتے ہیں؟
تمھارا رنگ تمھارے مقدر کا تعین کیوں کرتا ہے

میں نشانہ بنا ہوں، نشانہ، نسلی امتیاز کا نشانہ
گوروں کے ذہنوں کو بدخوئی کی تربیت دی جاتی ہے
یہ قلعی شدہ گورے ہیں، لیکن اس کا مطلب نہیں کہ یہ برتر ہیں
ہر انسان برابر ہے، ہر نسل، مذہب اور رنگ

میں کالا ہوں، میری رنگت گہری ہے
لیکن آزادی سب کے لئے ہے، بغیر کسی تحفظ کے
سانس لینا مفت ہے، اس کی کوئی فیس نہیں ہے
اور جب میں کہہ رہا ہوں، "میں سانس نہین لے سکتا"
میرا مطلب ہے میں جینا چاہتا ہوں، مجھے معاف کردو

میں سانس نہیں لے سکتا افسر، میں سانس نہیں۔۔۔

نورالہدیٰ شاہ
(کراچی)

ہم چند لوگوں کو خدا نے بلایا تھا
حال احوال پوچھا...!
کہو کیسی گزر رہی ہے؟
ہم نے اپنے اپنے ہونٹ
زبانیں
اور
دماغ
اس کے حضور رکھ دیے
سسک کر عرض کیا
خدایا!
ہمارے ملک میں
اب یہ کسی کام کے نہیں رہے
ان کے استعمال پر پابندی ہے
ہم یہ نعمت تجھے واپس لوٹاتے ہیں
بس
آنسو بہانے کے لیے
دو آنکھیں
اور ایک دل ساتھ لیے جاتے ہیں

○

''معافی عام ہونے دو!''

فرخندہ شمیم
(راولپنڈی)

وہ اک بے شکل جرثومہ کہ جس نے
تمہارے آپسی ناطوں کو پیسا
تمہاری حس کو ایسے پی لیا ہے
کہ اب تم میں محبت سونگھنے اور درد سہنے کو رہا کچھ بھی نہیں ہے!!
یہی تم چاہتے تھے ناں؟

سماجی ربط سے کٹ کر
مصافحے سے، بہت ہٹ کر
گلے ملنے، ہتھیلی چومنے اور پاس آنے سے
تمہیں اُبکائی آتی تھی
تمہیں لگتا تھا کہ وہ تحقیر میں
اور تم کسی سطوت میں کھلتے ہو
یہی تھی ناں کہانی؟

تمہیں آنکھیں ملانے سے عجب الجھن سی ہوتی تھی
سو تم کو ماسک نے پہچان سے محروم کر ڈالا
تمہاری حد جو پچھلے دور میں بے حد کٹاری تھی
کہیں محدود کر ڈالا
تمہارے ہونٹ کی جنبش، نگاہِ حسن کی آتش
سبھی معدوم ہو بیٹھیں
تمہیں شیریں بیانی سے بڑی وحشت جو ہوتی تھی!!

یہی اجسام ہیں گھر کے
جنہیں مدت ہوئی،
دیکھا نہ تھا تم نے
تمہیں فرصت کہاں تھی تب!
کتابِ زیست پر تم روز کاروبار لکھتے تھے
کبھی اس ملک ہوتے تھے، کبھی بیرون رہتے تھے
تمہیں بچوں کی صورت، عمر، قامت، کچھ نہ بھاتا تھا
فقط ایوان بھاتے تھے
مگر کالے کلوٹے اس کریہہ الشکل فتنے نے
وباء کا روپ لیتے ہی
تمہارے روز و شب کو اژدھے کی نوک سے تاراج کر ڈالا
تمہیں رشتوں کی بچھڑی کونج میں بے ڈر اُڑا ڈالا
تمہیں ادراک ہے اس کا؟

گمان کبر نے تم کو ہمیشہ ناز میں رکھا
زماں کو ہر گھڑی صدقات کا چہرہ دکھاتے تھے
کبھی حاجت روائی کا اسے مژدہ سناتے تھے
زکاتیں خوب دیتے تھے، بہت وڈیو بناتے تھے
مگر پچھلے برس آئی وباء کے اس زمانے میں
تمہیں راشن قطاروں میں کھڑی مخلوق نے دیکھا

کبھی وہ وقت تھا تم دینے والوں میں نمایاں تھے
مگر تصویر میں اب لینے والوں میں نمایاں ہو،

خدائے لم یزل کے قرب کی آسان ہیں شرطیں
چھپی نیکی، ریا سے پاک خلقِ عام کی خدمت
مناجاتیں لبوں سے دامنِ دل کو بھگوتی ہیں
انہیں دستِ دعا کے سبز گھر میں اب تو آنے دو
معافی عام ہونے دو!

○

زیست کے حصار

ڈاکٹر نزہت شاہ
(نیویارک)

یہ وبا ہے کوئی سزا نہیں
ذرا حوصلہ
ذرا فاصلہ
ہو رضائے رب کا بھی سلسلہ
تو رہے گی یوں ہی سدا نہیں
یوں اکیلا ہمیں چھوڑ دے
غم زیست کے حصار میں
رنج و کرب کے فشار میں
نہیں ایسا ظالم خدا نہیں
گزر ہی جائے گا یہ وقت بھی
کبھی تو جاگے گا بخت بھی
نگاہ و دل کو قرار ہو گا
کیا تم نے مانگی دعا نہیں
وہ ہی ہے حاکم ــــ اسی کی حکمت
اسی کو ہے یہ جہاں میں قدرت
کہ کرے مبتلائے عارضہ
یا عطا کرے
شفائے عاجزہ
کیا کبھی کسی سے سنا نہیں
یا قرآں میں تم نے پڑھا نہیں
❍

طیارہ حادثے کے شہدا کے نام

حامد ظہور
(جاپان)

نہ سیم و زرِ خیال کے۔۔
نہ آنکھ میں کوئی چمک۔۔
نہ ہونٹ پر طلب کی آخری دعا!
نہ ماننے کی آرزو۔۔نہ رُوٹھنے کا حوصلہ
نہ ہاتھ پر کوئی لکیر خواب کی، جواز کی
بدن کے اس ضعیف خاکدان سے تو خون تک نچڑ گیا
میں آخری تھا برگِ سبز۔۔اس شجر پہ جانِ جاں
سو میں بھی آج گر گیا۔۔
خزاں کی رسم کیا چلی!
یہ زرد خشک بازوؤں سی جھولتی برہنہ ڈالیاں گریں،
کہ فتح کے علَم گرے۔۔
لباسِ جاں بھی تار تار اس زمیں پہ بچھ گیا۔۔
تمہاری میری آنکھ میں پنپ رہا تھا جو،
وہ سبز خواب آج مر گیا!
مگر حیات کی طویل تشنگی مرے لبوں پہ دھر گیا۔۔!!
❍

وائرس

سرور حسین (پٹنہ، بہار)

یہ کیسا خوف کا عالم ہی
کیس ایک دہشت ہے
کسی نادیدہ ہستی کے تصور سے
کہ وہ جو ماورائی بھی نہیں
وہ اک زندہ حقیقت ہے
کوئی قہر الٰہی بھی نہیں
وہ صدہا سال سے تاریخ ہستی کا
جو ہے اک جزو لاینفک
نقوشِ ارتقائیِ آدمیت کے لئے جو ہے سبق
حیات وموت کی یہ کشمکش
جو ہیجاری مگر روز ازل سے
یہ جاری آج بھی ہے
اور آئندہ بھی رہیگی
کرونا ایک دہشت ہے یقیناً
مگر ایسے ہزاروں لاکھوں وائرس
ہمارے ذہن ودل میں
اب بھی جو بیٹھے ہیں چھپ کر
ہماری شخصیت، تہذیب وجاں کو
کھوکھلا کرتے رہے ہیں اندر اندر
یہ لاکھوں بھوک سے مرتے ہوئے بے جان انساں
یہ نسلی برتری کے زیر پا روندے گئیار ماں
فریب ومکر کے پیچھے چھپے
وہ چہرہ ءشیطاں
یہ جھوٹی قومیت کا شور وغوغا
خدا کے نام پر یہ قتل وغارت
الاماں والاماں!
بے جان سب انساں
کرونا سے نہیں یہ بھی کسی طرح تو کم
کرونا سے اگر بچ بھی گئیتو
کہاں ان سے بھلا بچ پائیں گے
تم ہو کہ ہم

ابراج حرم

ساگر ترپاٹھی

(ممبئی)

مرکزِ علم وعمل تھا یہی صحرائے بسیط
ہاں یہیں فیضِ نبوت تھا زمانے پر محیط
یہیں باطل پہ ہوا کرتی تھی سچاء کی جیت
تھا ہواؤں میں سدا امن واماں کا سنگیت
اِک تضاد آہ مگر سامنے ہے
اُٹھیں سجدے سے تو ابراج حرم سامنے ہے
وہی ارکان ومنٰی سک وہی حج کی تنظیم
چشم زم زم ونقشِ قدم ابراھیم
اسود و کملتجم وسجدہ گاہِ قوسِ حطیم
سب وہی ہے پہ کہاں سادگ ءدورِ قدیم
عہد حاضر کی امارت کا بھرم سامنے ہے
اُٹھیں سجدے سے تو ابراج حرم سامنے ہے
رفعتِ روح کا مظہر تھے یہ روشن مینار
جو ادا کرتے تھے اک لامتناہی کردار
جیسی گھلتے ہوئے ہوں انفس وآفاق کے دوار
آج حائل ہے مگر ایک ستم کی دیوار
دِل میں اک کرب ہے اور صورت غم سامنے ہے
اُٹھیں سجدے سے تو ابراج حرم سامنے ہے
ریت میں اک ذر سیّال نکل آیا ہے
اہلِ ستوت پہ تکبر کا گھنا سایہ ہے
تاج اور تخت نے ایمان کو دھدھلایا ہے
گنج جذب وعقیدت کا فرومایا ہے
زینتِ ڈالر ودینار ودرہم سامنے ہے
اُٹھیں سجدے سے تو ابراج حرم سامنے ہے
پھر سے اک شعلہ برآمد ہو ضِد ودِرفتہ
وہ افق اپنی گذشتہ وہ عمود ورفتہ
عود کر آئے یہاں خوشبوئے عودرفتہ
پھر نظر آئے وہی شانِ نمودِ رفتہ
ہے یہ حسرت مگر امکان تو کم سامنے ہے
اُٹھّیں سجدے سے تو ابراج حرم سامنے ہے

ٹیپو سلطان اور علامہ اقبال

سید تقی عابدی

(کینیڈا)

۱۱۔جنوری ۱۹۲۹ء گیارہ بجے دن علامہ اقبال نے ٹیپو سلطان کے مقبرہ گنبد سلطانی پر حاضری دی، جو سری رنگ پٹن میسور میں واقع ہے۔گنبد سلطانی پر مہاراجہ میسور کرشنا وڈیر کے حکم سے روزانہ نوبت بجائی جاتی تھی۔گنبد سلطانی سنگ مرمر، سنگ سیاہ اور سنگ یشیب سے بنائی گئی ہے۔اس میں موجود تین قبریں اپنی شان وشوکت کی داستانیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ قبریں ٹیپو سلطان شہید، ان کے والد حیدر علی خان اور ان کی والدہ فاطمہ کی ہیں۔اقبالؔ روضۂ سلطانی کے ایک کتبے کی رباعی پڑھ کر بہت متاثر ہوئے جس میں شہید ٹیپو سلطان کے والدین حیدر اور فاطمہ کے نام کی مناسبت سید الشہدا امام حسین علیہ السلام کے والدین سے تھی۔

آں سید الشہداؑ عرب سبط نبیؐ
لخت جگر فاطمہؑ و جان علیؑ
از فاطمہ و حیدر دکنی ٹیپو
سلطان شہیداں شد از جان و ولی

علامہ گنبد سلطانی میں شاہی محل کے عہدیداروں، سرکاری افسروں اور عمایدین میسور سے مختصر سلام وتعارف کرنے کے بعد گنبد میں داخل ہوئے اور اُس کا دروازہ اندر سے بند کرلیا اور کوئی دو ڈھائی گھنٹے ٹیپو کے مزار پر تنہا مراقبہ میں گزارے۔اس عرصے میں تمام عمایدین وعہدیدار اور احباب گنبد سلطانی کے صحن میں اقبالؔ کے منتظر رہے۔تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد جب علامہ باہر آئے تو ان کی آنکھیں شدّت گریہ زاری سے سوجھی ہوئی تھیں۔گنبد سلطانی کے صحن میں مہاراجہ کے درباری موسیقار علی جان نے اپنی دل سوز آواز میں جب علامہ کا کلام سنایا تو تمام حاضرین پر رقّت طاری ہوگئی۔علی جان نے یہ حالت دیکھ کر گانا بند کر دیا تو فوراً اقبالؔ نے کہا۔علی جان کیوں رک گئے خدا کے لیے جاری رکھو۔ چنانچہ کچھ مدت تک یہ گریہ اور اشک باری کا سلسلہ جاری رہا۔ جب یہ محفل ختم ہوئی تو بنگلور کے مشہور قومی کارکن محمد عباس سیٹھ نے علامہ سے پوچھا۔آپ نے روضۂ سلطان شہید پر بڑی دیر تک مراقبہ فرمایا ہمیں بھی بتایئے کہ مزار سلطان شہید سے آپ کو کیا فیض حاصل ہوا۔علامہ نے فرمایا مزار پر میرا ایک لمحہ بھی بیکار نہیں گزرا۔ وہاں ایک پیغام الہامی مجھے ملا اور پھر اقبالؔ نے فی البدیہ یہ فارسی کا شعر پڑھا۔

درجہاں نتو ان اگر مردانہ زیست
ہمچو مردان جان سپر دن زند گیست

(ترجمہ) اگر دنیا میں مردانہ طور پر زندگی میسر نہ ہوتو مردانہ وار موت کو آغوش میں لینا خود زندگی ہے۔

علامہ کا یہ شعر ٹیپو سلطان کے اُس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جب اُن کے کسی مصاحب نے ٹیپو کو مشورہ دیا تھا کہ وہ انگریزوں سے صلح کرلیں۔ سلطان شہید نے فوراً کہا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیڈر کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔علامہ اقبالؔ نے لاہور پہنچ کر اس فی البدیہ شعر پر چار اشعار کا اضافہ کیا جو اُن کی قلبی واردات تھی۔ یہ اشعار علامہ کے کلیات یا باقیات میں موجود نہیں بلکہ محمود بنگلوری کی کتاب ''تاریخ سلطنت خداداد'' شہاب یزدانی کی کتاب ''گلدستۂ اقبال'' کے غیر مرتب نوادر میں شامل ہیں۔

آتشی در دل دگر بر کردہ ام	داستانی از دکن آور دہ ام
در کنارم خنجر آئینہ فام	می کشم اورا بہ تدریج از نیام
نکتہ ای گویم ز سلطان شہید	زان کہ ترسم تلخ گردد روز عید
بیشتر رفتم کے بوسم خاک او	تا شنیدم از مزار پاک او
درجہان نتوان اگر مردانہ زیست	ہمچو مردان جان سپردن زندگیست

(ترجمہ) میرے دل میں جس چیز نے ایک نئی حرارت پیدا کردی ہے وہ ایک داستان ہے جو دکن سے لایا ہوں۔ میں اپنے پہلو سے ایک چمکدار تیز خنجر آہستہ آہستہ نیام سے کھینچ لایا ہوں۔ٹیپو سلطان شہید کا ایک زریں قول کہنا چاہتا ہوں مگر مجھے ڈر ہے کہ کہیں عید کی خوشیاں تلخ نہ ہوجائیں۔ جب میں سلطان کی قبر کو بوسہ دینے لگا تو ان کے مزار سے یہ آواز آئی کہ اگر دنیا میں مردوں کی طرح زندگی کرنا محال ہوجائے تو مردانہ وار جان قربان کردینا ہی حیات جاوید ہے۔

علامہ اقبال نے مولانا روم کے بعد سب سے زیادہ اشعار ٹیپو سلطان شہید پر لکھے اور ان اشعار کو اپنی سب سے اہم کتاب ''جاوید نامہ'' کا جزو بنایا۔ جاوید نامہ کے متعلق محمد جمیل بنگلوری کو ۴۔اگست ۱۹۲۹ء میں لکھتے ہیں۔''سلطان شہید پر میری نظم اس کتاب کا حصہ ہوگی جسے میں اپنی زندگی کا ماحصل بنانا چاہتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں اس کے لیے آپ کو کافی انتظار کرنا پڑے گا۔''

میسور کی سلطنت کا بانی نواب حیدر علی خان کا بڑا بیٹا فتح علی خان جس کو ٹیپو سلطان اولیا کے نام پر ٹیپو سلطان کا نام دیا گیا ۱۵۔نومبر ۱۷۵۰ء میں کولار بنگلور میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۸۲ء میں اپنے باپ کے انتقال پر تخت نشین ہوا۔ٹیپو سلطان کا تمام دور حکومت انگریزوں، فرانسیسیوں، مرہٹوں اور ان کے ہمدرد سلطنتوں سے لڑائی اور جنگ میں گزرا۔ جب ان تمام قوتوں کو جداگانہ فتح نصیب نہ ہوئی تو سب نے مل کر ٹیپو کے خلاف حملہ آوری شروع کردی۔انگریزی فوجیں ٹیپو کے فوجی سپہ سالار میر صادق کی غداری سے قلعہ میں داخل ہوگئی اور ٹیپو قلعہ کی مسجد میں لڑتا ہوا ۴۔مئی ۱۷۹۹ء کو شہید ہوگیا۔ٹیپو سلطان کی تاریخ شہادت قطعہ ''شمشیر گمشدہ'' سے نکلتی ہے۔دکن کے ایک نامعلوم شاعر نے اس واقعہ شہادت کی تاریخ ۱۲۱۳ہجری کے مطابق ۱۷۹۹ء نکالی جس میں نظام حیدر آباد اور اُن کے

وزیراعظم ارسطو جاہ اوراُن کے سپہ سالار میر عالم کے ناموں کے ساتھ انگریزوں کے آلہ کار ہونے کی وجہ سے مسٹر کے عنوان سے لکھا۔

مسٹر نظام و مسٹر اعظم یزید شد
شمر لعین چہ مسٹر عالم پدید شد
تاریخ از شہادت سلطان حیدری
''ٹیپو بہ وجہ دین محمد شہید شد'' (۱۲۱۳) ہجری

اس قطعہ کے آخری مصرع سے تاریخ نکلتی ہے۔

(ترجمہ) مسٹر نظام اور اُن کے وزیراعظم یزید بن گئے۔ان کے سپہ سالار مسٹر عالم شمر لعین بن کر ظاہر ہوئے اس واقعہ کی تاریخ اس مصرع سے نکلتی ہے کہ ٹیپو سلطان دین محمدؐ کی خاطر شہید ہو گیا۔)

بنگلور کے دورے کے درمیان علامہ نے آثار سلطانی کی بھی سیر کی۔سلطان کا قلعہ،مسجد اعلیٰ قلعہ جس میں ٹیپو شہید ہوا تھا،سلطان کا قصر دریا و دولت، باغ، میر صادق کی مفروضہ قبر اور غدار لنگڑے غلام علی وغیرہ کی قبر کا بھی دیدار کیا۔جب کسی نے غدار لنگڑے غلام علی کی قبر پر اس کی تاریخ وفات کا شعر سنایا تو اقبالؔ پھڑک اٹھے:

ہیچ می دونی چہ دید از دست او اہل شہید
آں چہ اولاد محمدؐ دید از دست یذید

(ترجمہ) یعنی جانتے ہو ٹیپو کے خاندان کا حال اُس غدار کے ہاتھ سے وہی ہوا جو خاندان محمدؐ کا حال یذید کے ہاتھ سے ہوا۔

ان مقامات کی سیر سے متاثر ہو کر علامہ نے فرمایا ''مسلمانوں کو مغلیہ سلطنت کے بعد ایک نشاۃ ثانیہ کا موقع ملا تھا لیکن افسوس کہ غداروں نے اُسے بڑھنے نہ دیا۔''

علامہ اقبال کی شعری تخلیقات میں جاوید نامہ کی حیثیت ممتاز اور منفرد ہے جو دو سال کی لگا تار محنت سے ۱۹۳۲ء میں تکمیل کو پہنچی۔جاوید نامہ کی بابت خود اقبالؔ اپنے خط ۴۔اگست میں فرماتے ہیں ''سلطان شہید پر میری نظم اس کتاب کا حصہ ہوگی جسے میں اپنی زندگی کا ماحصل بنانا چاہتا ہوں۔جاوید نامہ میں تقریباً دو ہزار اشعار ہوں گے۔'' اسی جاوید نامہ کو علامہ مصور بنانے کے بھی خواہش مند تھے چنانچہ اپنے مکتوب ۳۱۔مارچ ۱۹۳۳ء میں لکھتے ہیں ''اہم کام یہ ہے کہ جاوید نامہ کا تمام و کمال ترجمہ کیا جائے۔مترجم کا اس سے یورپ میں شہرت حاصل کر لینا یقینی امر ہے۔اگر وہ ترجمے میں کامیاب ہو جائے اور اگر اس ترجمے کو کوئی عمدہ مصور بنا دے تو یورپ اور ایشیاء میں مقبول تر ہوگا۔اس کتاب میں تخیلات نئے ہیں اور مصور کے لیے عمدہ مسالہ ہے۔'' پھر علامہ اپنے ایک اور خط مورخہ ۲۵۔جون ۱۹۳۵ء میں کاظمی کو لکھتے ہیں۔

''میرے خیال میں میری کتابوں میں صرف جاوید نامہ ایک ایسی کتاب ہے جس پر مصور طبع آزمائی کرے تو دنیا میں نام پیدا کر سکتا ہے۔مگر اس کے لیے مہارت فن کے علاوہ الہام الٰہی اور صرف کثیر کی ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب یہ چیز ایسی شان کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو دنیا یقینی طور پر اس کو کاظمی سکول کے نام سے موسوم کرے گی۔آپ محض مصوری میں اضافہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ دنیائے اسلام میں بحیثیت مصوّر اقبالؔ ایک زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں۔جو کہ قدرت شاید آپ ہی سے لینا چاہتی ہے۔پوری مہارت فن کے بعد آپ نے جاوید نامہ پر خامہ فرسائی کی تو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔''

اگر چہ ہمارا موضوع اس مضمون میں جاوید نامہ نہیں ہے لیکن اس کا تذکرہ اس لیے لازم ہے کہ اسی مثنوی میں سلطان شہید ٹیپو کی روداد شامل ہے۔علامہ نے جاوید نامہ کو شیخ محی الدین ابن عربی کے معراج نامے ''فتوحات مکیّہ'' عربی نابینا شاعر ابوالعلا المصری کے ''رسالہ زعفران'' اور اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے کی ''ڈیوائن کامیڈی'' کو پیش نظر رکھ کر اپنا رویائی سفر کیا ہے یہ اردو اور فارسی ادب میں بالکل جدید کاوش ہے۔یہ تخیلی خلائی سفر جو حالت خواب میں کیا گیا علامہ اقبالؔ مولانا رومؔ کی قیادت میں چھ افلاک یعنی فلک قمر، فلک عطارد، فلک زہرہ، فلک مریخ، فلک مشتری اور فلک زحل کے علاوہ فلاک کے آگے فردوس بریں کی سیر کرتے ہوئے مختلف روحوں سے ملاقاتیں کرتے ہیں جن میں زرتشت، گوتم، طاطائی، فرعون، ابوجہل، مہدی سودانی، منصور حلاج، ابلیس، نیٹشے، سید علی ہمدانیؔ، شرف النسا، بھرتری ہری، نادر، ابدالی، ناصر خسرو اور ٹیپو سلطان قابل ذکر ہیں۔اس تخیلی سفر کا نقطۂ عروج سلطان ٹیپو سے ملاقات ہے چنانچہ اقبالؔ نے رومیؔ کے بعد ٹیپو سلطان اور ان سے متعلق موضوعات پر سب سے زیادہ اشعار لکھے ہیں جن کی تعداد (۸۰) سے زیادہ ہے۔علامہ کی گفتگو ٹیپو سلطان سے اس سفر کے سب سے آخر میں ہوتی ہے اس کے علاوہ ٹیپو نے جہاں میسور کے دریا کاویری کو زندہ رود کہا وہیں اقبالؔ کو بھی زندہ رود نامزد کیا چنانچہ اس لیے اس تمام مثنوی میں اقبالؔ نے اپنا لقب زندہ رود رکھا۔ملاقات ہوتے ہی ٹیپو سلطان علامہ سے پوچھتے ہیں۔

زائیرے شہر و دیارم بودہ ای
چشم خود را بر مزارم سودہ ای
ای شناسای حدود کائنات
دردکن دیدی ز آثار حیات

(ترجمہ) تم نے میرے شہر اور سلطنت کی سیر و سیاحت کی ہے اور میری قبر پر گریہ زاری بھی کی۔یہ بتاؤ اے دور اندیش دانشمند کیا تم نے وہاں کچھ زندگی کے آثار بھی دیکھے۔)

اقبال نے جواب دیا:

چشم اشکی رختم اندر دکن
لالہ ھا روید ز خاک آن چمن

رود کاویری مدام اندر سفر
دیدہ ام درجان او شوری دگر

یعنی میں نے وہاں آنسوؤں کی تخم ریزی کی ہے اور اب وہاں لالے کی فصل اُگے گی۔ وہاں جودریائے کاویری مسلسل سفر میں ہے۔اس کے بہاؤ میں میں نے ایک نیا شوراور ہیجان دیکھا۔ یہ سُن کر ٹیپو سلطان نے کہا:

ای ترا دادند حرف دل فروز   ازتپ تو می سوزم ہنوز
آن نوا کز جان تو آید برون   می دھد ہر سینہ راسوز درون
بودہ ام در حضرت مولای کل   آنکہ بی اوطی نمی گردد سبل
گرچہ انجا جرات گفتار نیست   روح را کاری بجز دیدار نیست
سوختم از گرمئی اشعار تو   بر زبانم رفت از افکار تو
گفت این بیتی کہ برخواندی زکیست   اندر و ہنگامہ ہای زندگی ست
باہمان سوزی کہ در ساز دبہ جان   یک دوحرف از مابہ کاویری رسان
در جہان تو زندہ رود او زندہ رود   خوشترک آید سرود اندر سرود

(ترجمہ) خدانے تم کودلوں کوگرمانے والا سخن عطافرمایا ہےاسی لیے آنسوؤں کی حرارت مجھے گرما رہی ہے۔ تمہارے اشعار سے ہر سینہ روشن ہے۔ میں مولا کی خدمت میں تھا جہاں کسی کو بات کرنے کی جرأت نہیں ہوسکتی لیکن تمہارے اشعار نے مجھ میں ایسی حرارت پیدا کردی تھی کہ فوراً تمہارا کلام میری زبان پرآ گیا۔ مجھ سے پوچھا گیا یہ کس کا کلام ہے جس میں زندگی کے رمزاور ہنگامے پوشیدہ ہیں۔تم اس درداور کیفیت کے ساتھ میرا یہ خاص پیام دریا کاویری تک پہنچادو کیونکہ دنیا میں وہ زندہ ندی ہےاورتم بھی زندہ ندی کے مانند ہو چنانچہ کیا خوب ہوگا کہ تم دونوں کے نغمے ایک ہوجائیں۔

ٹیپو سلطان نے پہلے کاویری کی تعریف کی پھر اپنی دردبھری کہانی سنائی اور بڑے محکم انداز میں زندگی، موت اور شہادت کے فلسفہ کو موثر انداز میں پیش کیا۔ یہ پوری نظم (۴۱) اشعار پر مشتمل ہے جس کے چند اشعار یہاں پیش کیے جارہے ہیں۔

رود کاویری یکی نرمک خرام   خستہ ی شاید کہ از سیر دوام
ای مرا خوش تر زجیحون و فرات   اے دکن را آب تو آب حیات
آہ شہری کو در آغوش تو بود   حسن نوشین جوہ از نوش تو بود
ای ترا سازی کہ سوز زندگی است   ہیچ می دانی کہ این پیغام کیست
آنکہ می گردی طواف سطوتش   بودہ ای آینہ دار دولتش
آنکہ صحرا ہا ز تدبیرش بہشت   آنکہ نقش خود بہ خون خودنوشت
آنکہ خاکش مرجع صد آرزوست   اضطراب موج تو از خون اوست
آنکہ گفتارش ہمہ کردار بود   مشرق اندر خواب او بیدار بود
ای من وتو موجی از رود حیات   ہر نفس دیگر شود این کائنات
زندگانی انقلاب ہر دمی است   زانکہ او اندر سراغ عالمی است
درچمن گل مہمان یک نفس   رنگ و آبش امتحان یک نفس
موسم گل ماتم وہم نای ونوش   غنچہ در آغوش ونقش گل بدوش
سینہ ای داری اگر در خورد تیر   درجہان شاہین بزی شاہین بمیر
زندگی راچیست رسم و دین وکیش   یک دم شیری بہ از صد سال میش
بندہ ی حق ضیغم و آہوست مرگ   مثلِ شاہینی کہ افتد بر حمام
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر   مرگ پور مرتضٰی چیزی دیگر
جنگ مومن چیست ہجرت سوی دوست   ترک عالم اختیار کوی دوست
کس نداند جز شہید این نکتہ را   او بہ خون خود خرید این نکتہ را

(ترجمہ) دریائے کاویری جوآہستہ آہستہ مٹک کرچل رہی ہے شاید مسلسل راہ پیمائی کی وجہ سے تھک گئی ہے۔ یہی کاویری مجھے جیحون اور فرات سے عزیز تر ہے اوراس کا پانی دکن کے لیے آب حیات ہے کاویری وہ شہر جو کبھی تیری گود میں پلا تھا آج کہاں ہے جس کے حسن کا مزہ تیرے شیریں مزے میں شامل تھا۔ اے کاویری تو سراپا سوز زندگی ہے تجھے معلوم ہے یہ کس کا پیام ہے۔ یہ اُس کا پیام ہے جس کی شان اور شوکت کا تو طواف کرتی تھی اور جس کی سلطنت کی تو آئینہ دار تھی۔ جس کی تدبیر اور تدبّر سے دشت بہشت تھی جس نے اپنے خون سے اپنی تاریخ لکھی۔ جس کی گفتار اور کردار یعنی قول اور فعل میں کوئی تفاوت نہ تھا۔ وہ اس وقت بیدار تھا جب سارا مشرق گہری نیند سو رہا تھا۔ میں اور تو اے دریائے کاویری دریائے زندگی کی دو موجیں ہیں۔ یہاں ہر لمحہ کائنات دگرگوں ہوتی رہتی ہے کیونکہ کائنات حقیقت عالم کی سمت سفر کررہی ہے اس لیے اس کی زندگی میں ہر لحظہ انقلاب نمودار ہوتا ہے۔ چمن میں پھول ایک سانس کا مہمان ہے اس کی خوبصورتی صرف ایک لحظہ کے لیے ہے۔ اگر تیرا سینہ تیر کھانے کی جرأت رکھتا ہے تو شاہین کی طرح زندگی کر اور شاہین کی طرح مرجا۔ زندگی کا دین اور مذہب یہی ہے کہ شیر کی طرح ہر لحظہ جینا بھیڑ کے سو سال جینے سے بہتر ہے۔ اللہ کا بندہ، شیر ہے اور اُس کی موت اس کا شکار ہرن۔ چنانچہ موت اس کے سو مقامات میں سے صرف ایک مقام ہے۔ وہ موت پر اس طرح لپکتا ہے جس طرح شاہین کبوتر پر۔ اگرچہ ہر موت مومن کے لیے شکر سے زیادہ شیریں ہوتی ہے لیکن ابنِ مرتضٰی کی شہادت کی بات ہی کچھ اور ہے۔ مومن کی جنگ دوست کی سمت ہجرت کا نام ہے یعنی دنیا کو چھوڑ کر کوچہ دوست یعنی خدا کی طرف رخ کرنا ہے۔ اس حقیقت کو صرف شہید جانتا ہے اس لیے وہ اپنا خون دے کر موت اور شہادت کو خریدتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبالؔ نے ٹیپو سلطان کو جاوید نامہ کا سرنامہ سخن بنا کر زندہ جاوید کیا اور ٹیپو کی شخصیت اور اس کی شہادت کو مسلمانوں کے جگانے کے لیے موثر طریقہ پر استفادہ کیا اسی لیے جب کسی میجر نے ایک فوجی سکول کو علامہ کے نام سے موسوم کرنے کی اجازت چاہی تو علامہ نے لکھا "ایک معمولی شاعر کے نام سے فوجی سکول کو موسوم کرنا زیادہ موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ آپ اس فوجی سکول کا نام ٹیپو فوجی سکول رکھیں۔ ٹیپو

باقی صفحہ ۱۰۵ پر ملاحظہ کیجیے

ایک آئینۂ زیست

پروین شیر
(نیویارک)

نومبر ۱۷۸۵ء کی سرد ہواؤں میں اسکاٹ لینڈ کے ایک چھوٹے سے گاؤں Alloway میں ایک چھبیس سال کا غریب کسان اناج اُگانے کی کوشش میں زمین کھود رہا تھا اس کا مضبوط کدال۔۔۔اپنے فولادی ہاتھوں سے زمین پر وار کر رہا تھا اور اس کی تہوں تک پہنچ رہا تھا۔ یکا یک اس نوجوان کاشتکار نے ایک کمزور چوہے کو دیکھا جو گہرے خوف کے سمندر میں ڈوبا کپکپا رہا تھا جس کا چھوٹا سا مٹی کا گھر اس بے رحم کدال کے وار سے ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ وہ چوہا بے گھر، غیر محفوظ ہو کر یخ بستہ ہواؤں کی زد میں آ کر کانپ رہا تھا۔ اس کی زندگی اب مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ اس سانحے نے ایک غریب کسان کے سامنے قدرت کے نظام اور زندگی کی سچائی کو لا کھڑا کیا۔ اس نوجوان کا نام تھا روبرٹ برنس (Robert Burns) وہ عظیم شاعر جس نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر ۱۷۸۵ء میں نظم ''To Mouse'' کہی جو زندگی کا آئینہ ہے۔ اور پھر اس نظم سے متاثر ہو کر John Steinbeck (نوبل پرائز ونر) نے ۱۹۳۷ء میں اس موضوع پر ناول لکھا جس کا نام اس نظم کی ایک سطر سے لیا ''Of Mice and Men'' گویا یہ نظم برنس کی آنکھوں سے ٹپکا ہوا آنسو کا قطرہ تھا جس میں زندگی کی سچائی کا سمندر سما گیا تھا۔ برنس کے لیے اپنی بقا کی کوشش کسی کی فنا کا سبب بن گئی۔ قدرت کا یہ بھی نظام ہے Survival for the fittest۔ اس چوہے نے ایک عرصہ کی کٹھن محنت کے بعد اپنا گھر بنایا تھا۔ تحفظ کے خواب دیکھے تھے۔

تابناک مستقبل کی تیاری چوہے اور ہم دونوں ہی کرتے ہیں۔ انسان اور چوہے یکساں زندگی جیتے ہیں، خواب بنتے ہیں لیکن ایک ہی جھٹکے میں وہ اُدھڑ جاتے ہیں۔ امیدوں کے عالی شان محل تعمیر کرتے ہیں اور آندھیوں کی زد میں آ کر ڈھے جاتے ہیں تو ہم انسانوں میں اور چوہوں میں کتنی مماثلت ہے۔ ایک ہی دنیا ایک ہی بقا کے مسئلے اور اس کا بوجھ وہی مستقبل کی تابانیوں کی امیدیں۔ وہی آندھیاں اور اس کے وار کرتے ہوئے خنجر وہی برفیلے موسموں کے خراش ڈالنے والے لانبے، نوکیلے ناخن وہی غم کے سیاہ بادلوں میں چھپتی ہوئی خوشیوں کی چاندنی۔۔۔ بقول شاعر:

> But mousie thou art no thy lane,
> In proving foresight may be vain;
> The best laid schemes o'mice an' men
> Gang aft agley,
> An' lea'e us nought but grief an' pain
> For promis'd joy:

تقریباً دو سو پچیس برس قبل برنس نے یہ نظم کہی تھی۔ لیکن ہم آج بھی اسی خوف اور بے یقینی کے جنگل میں بے امان بھٹک رہے ہیں۔ ہر صبح آس کے افق پر خواب کا سورج سر اٹھاتا ہے اور ہر شام آنسوؤں کے سمندر کی تیز لہروں میں لہولہان ہو کر سر جھکائے ڈوب جاتا ہے۔ ہر رات یقین کے گھر میں امید کا چاند دبے پاؤں روشن دان سے کود کر آتا ہے لیکن کڑوے سچ کی سیاہی اسے نگل لیتی ہے۔ دو سو پچیس برس پہلے روبرٹ برنس اور وہ چوہا بے بسی کی دیواروں میں قید تھا۔ آج بھی ہم انہیں دیواروں میں مقید ہیں۔ وقت بوڑھا ہو گیا ہے لیکن ان کی سنگلاخ، لاچاری کی اونچی فصیلوں میں بند ہم سب کمزور چوہوں کی طرح باہر نکلنے کی کوشش رائیگاں میں ان سے ٹکرا کر منتشر ہو جاتے ہیں اور بوڑھا وقت زیر لب مسکراتا رہتا ہے۔ ہم ہمہ وقت تمناؤں، امیدوں اور خوابوں کے گھروندے بناتے رہتے ہیں۔ انہیں یقین کی دھنک، تتلیوں اور پھولوں کے حسین رنگوں سے سجاتے رہتے ہیں لیکن یہ گھروندے تلخ حقیقت کے تیز سیلاب کے ہاتھوں ٹوٹ بکھر کر بہہ جاتے ہیں۔ ہم تہی دامن، بے اماں، تند، یخ بستہ ہواؤں کی زد میں کانپتے رہ جاتے ہیں۔ جس طرح برنس کے کدال نے چوہے کے گھر کو ڈھا دیا لیکن برنس کا اس چوہے کو یہ کہنا کہ:

> Still tho'are blest, compar'd wi'me!
> The present only toucheth thee!
> But och! I backward cast my e'e,
> On prospects drear?
> An' forward, tho' I canna see,
> I guess an' fear!

تو پھر انسانوں سے زیادہ چوہے خوش نصیب ہیں جو صرف حال میں جیتے ہیں۔ جبکہ ہم انسان۔۔۔ ماضی کے درد اور انجانے اور ان دیکھے مستقبل کی بے یقینی کے خطرے سے لرزتے رہتے ہیں۔ ''کاش'' اور ''شاید'' کے جال میں الجھے ہوئے تذبذب کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے دور مستقبل کے آسمان کی ہتھیلی پر امیدوں کے ستاروں کی لکیروں کو تکتے ہوئے۔ گزری ہوئی راتوں کی یادوں کے درد کے شکنجے میں جکڑے ہوئے۔ حسین فردا کے شک کی زنجیروں سے بندھے ہوئے۔ ''شاید'' کے غبار میں ڈوبے ہوئے۔ ہم ماضی اور مستقبل کے قیدی ہیں۔ حال سے آزاد، وسوسے کے دائرے میں مقید کہ نہ جانے کیا ہوگا۔ سوالات، الجھنیں، یقین اور بے یقینی سے سہمے سہمے۔ ماضی کو مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے جہاں پچھتاوے، نارسائیاں، غلطیاں، ناکامیاں، خوابوں کی کرچیاں اور تہی دامانیاں کچوکے لگاتی رہتی ہیں۔ ان کے گہرے سمندر میں ڈوب کر حال کے ساحل کو بھول جاتے ہیں۔ زندگی کو جانتے نہیں جینے کی تیاری ہی کرتے کرتے بے نشاں ہو جاتے ہیں۔ اور چوہے؟ مستقبل کے خوف اور ماضی کے درد سے پرے ہوتے ہیں۔ حال کی بانہوں میں سمٹ کر زندگی جیتے ہیں۔ نہ ماضی کی چبھن نہ مستقبل کے وسوسے۔ تو کیا انہیں کمزور سمجھنے والے انسان ان سے برتر ہیں؟ ان سے بہتر ہیں؟ ان سے زیادہ خود مختار ہیں؟ ان سے زیادہ محفوظ ہیں؟ ان سے زیادہ قوی اور توانا ہیں؟ ان سے زیادہ خوشحال ہیں؟ ان سے زیادہ خوش نصیب ہیں؟ نہیں!

طاہر حنفی کا تخلیقی شعور

واصف حسین واصف
(نیویارک)

ہندو پاک کے ادبی ماحول کا ایک بڑا مسئلہ آگاہ قاری اور ذہین سامع کا قحط ہے، قاری اور سامع کی فکری سطح مطالعہ کی کمی کے سبب بلند نہ ہوسکی اور تخلیق کار کی یہ مجبوری رہی کہ وہ روایتی ادبی ماحول کا پابند رہا اور جس نے بھی اس خول کو توڑنے کی کوشش کی وہ روایت پسند قاری اور سامع سے کٹ گیا اور اس کی شناخت ایک مسئلہ بنی رہی۔ غالب، اقبال اور فیض کو ایک خاص ضرورت اور لابی نے زندہ رکھا ہے اور ستم یہ ہوا کہ قاری اور سامع کی کورنگاہی کے سبب ان مشاہیر کی تخلیق کو تشریح کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ عام قاری اور سامع نے کبھی یہ غور نہیں کیا کہ شاعر نے کوئی شعر کس کیفیت میں تخلیق کیا ہے اور اس بات سے کس کو انکار کہ:

پہروں آنکھیں نم رہیں، دل خوں ہوا
جب کہیں اک شعر تر موزوں ہوا

کیا یہ کافی تھا کہ شاعر اور ادیب کی بات شاعر ادیب ہی سمجھے، تنقید لکھی جائے اور اس کی عام قاری اور سامع تک ترسیل بھی نہ ہو، عام قاری اور سامع تک رسائی ان تخلیق کاروں کی رہی جو معلوم کی بات کرتے رہے۔ تمام معروف اور مقبول شاعروں کو معلوم پر ہی داد ملی۔ ان چھوا، ان کہا اور نا معلوم خیال کم ہی تخلیق کاروں کو نصیب آیا اور فی زمانہ بات Social Relevence سے آگے نہیں بڑھ رہی۔ مغرب میں ہر نئے خیال کو دام دے کر خریدا گیا اور ہندو پاک میں داد پر بات ختم ہوئی۔ سبب یہ ہے کہ کتاب کا عشق کبھی نہ رہا اور تاسف یہ بھی کہ پاکستان اور ہندوستان میں شاعروں کی تعداد بڑھ گئی مگر تمام بڑے جرائد اور رسائل مرتے چلے گئے۔ ایسے میں مجید امجد، اختر الایمان، ن م راشد اور منیر نیازی کس کو یاد رہیں گے اور اس کا ماتم کون کرے کہ جون ایلیا، رسا چغتائی اور رضی اختر شوق کو پنجاب میں کم ہی جانا جاتا ہے۔ جب سے مشاعرے Commercialise ہوئے تو فکری مشمولات اور حسّی مشمولات شعر کا حصہ کیسے بنیں:

پڑھنے والے کو کیا خبر اس کی
کرب جو صاحبِ کتاب سہے

طاہر حنفی اسی دور کا شاعر ہے۔ یہ طاہر حنفی کی بے اختیار ہے وہ ایک مشّاق، کامیاب اور نامور بیوروکریٹ ہے۔ مصطفیٰ زیدی بھی بیوروکریٹ تھا اس کے ساتھ طلسماتی کہانیاں نہ ہوتیں تو اس کا طلسم بھی ٹوٹ جاتا۔ وزیر آغا نے مصطفیٰ زیدی کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ ادب میں اس کا ذکر بھی آجائے۔ طاہر حنفی اس فضا سے واقف ہے مگر شعر تخلیق کرتا ہے اس کے سامنے ترقی پسند تحریک کا خاتمہ ہوا اپنی ملازمت کے دوران اس نے بے بنیاد سیاسی نعرہ بازی دیکھی۔ یہ دورانیہ کسی صورت میں بھی نہ متنوع تھا اور نہ فکری اعتبار سے بہت تیز مگر ہنگامہ خیز ضرور تھا۔ متحدہ ہندوستان کی تقسیم کی پرآسیبی کیفیت بھی سماج کی شریانوں میں موج زن تھی جس کا اثر آج بھی خون میں گردش کرتا ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ طاہر حنفی جیسا حسّاس فنکار وقت کے ان استعاروں سے بے خبر رہتا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ Materialism اور سیاسی Power Struggle سے طاہر حنفی آنکھیں میچ کر گزر گیا ہو جب کہ بحیثیت بیوروکریٹ وہ اس کا حصہ بھی رہا ہو، طاہر حنفی کو پڑھنے کی کوشش کیجیے:

میں اسکی راہ سے کوہِ گراں ہٹاتا رہا
مگر ہمیشہ خبر میں رہا مرا رہبر

فورڈ نے کہا تھا کہ بیوروکریٹ میرے استاد ہیں۔

فرانس کا شاعر Paul Verlaine بھی ایک بیوروکریٹ ہی تھا ملازمت سے سبکدوش ہوکر اس نے ادب کا رخ کیا، وہ کہتا ہے کہ شعر تب تخلیق ہوتا ہے جب انسان سانچوں سے باہر آجائے اور ایک نظام فکر کا شریک ہو، اور اس کی Prescribed Ego بھی زندہ ہو، Paul Verlaine نے کہا تھا کہ شاعری ایک Profession ہے یہ منسوخ تو نہیں ہوتا، معطل ہوجاتا ہے مگر کسی بھی وقت Translate کیا جا سکتا ہے طاہر حنفی Paul Verlaine کے ساتھ اس کشتی میں فروکش ہوسکتا ہے۔

طاہر حنفی اپنی ملازمت سے اپنی Prescribed Ego بچالایا ہے اور اپنے ماحول سے اس نے اپنا نظامِ فکر بھی ترتیب دیا ہے۔ جنگ عظیم اوّل سے قبل ہی جدیدیت حکومت، اداروں اور مذہب پر بے اعتمادی کا اظہار کرچکی تھی اور یہ بھی کہ Truth Absolute ایک سراب ہے، مابعد جدیدیت نے Objective Reality کے انکار کے ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کو بھی طاقت کا منبع قرار دیا، پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ وہ شروع سے ہی Inevitable Theological جبریت کا شکار ہوگیا اور یہ رسم چل پڑی کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تحریکات جنگ عظیم کے بعد دنیا کے کسی کام کی نہ رہیں مگر پاکستان کا ادیب اور شاعر اب بھی جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے باہر نہ نکل سکا۔ طاہر حنفی کو یہ اختیار تھا کہ وہ کیا رد کرتا ہے اور کیا قبول کرتا ہے اس نے جدیدیت کے اس اصول کو رہنما کیا کہ فرد اور معاشرہ کا تعلق بہت اہم ہے۔ یہ نظام فکر زمینی تعلق سے بھی تھا کچھ روحانیت بھی شامل ذکر رہی۔ روایت سے جڑے رہنے کے باوجود طاہر ایسے سوال بھی اٹھا دیتا ہے جو اس کے اندر کے Frustration کو ظاہر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو نظم ''تخلیق کار کے وجود کی گواہی'' میرا خیال ہے کہ یہ خیال غزل میں آجاتا تو Blunt ہوجاتا نظم میں بہت سی باتیں

چھپ جاتی ہیں اور ان کو Decode کرنا پڑتا ہے۔ ایک مذہبی معاشرے میں ایک فنکار کو یہ احتیاط برتنی ہوتی ہے:

دل کسی سانحے سے ڈرتا ہے
آئینہ آئینے سے ڈرتا ہے

رابرٹ فراسٹ نے کہا ہے کہ شاعری اپنی فکری ساخت میں Between the lines ہی ہوتی ہے Metaphoric اور Similitude Attire ہی اس کو قابلِ توجہ بناتا ہے اور Slangs تازگی بخشتے ہیں۔ انگریزی زبان میں شاعری Philisophical Thoughts اور Intellect کے ملاپ سے ایک فضا بناتی ہے۔ طاہر حنفی نے دوران ملازمت ایسی زبان برتنا ایک ضابطہ بنالیا تھا کہ Diplomatic Language ایسے ہی ضابطوں کے گرد گھومتی ہے۔ ایسی زبان کو Decode کرنے کے مراحل آ ہی جاتے ہیں۔ طاہر کی غزل ''چوڑیاں کھنکتی ہیں'' ایسی ہی غزل ہے جس میں کھنک کے ساتھ بہت سے مضامین کی صورت گری ہوتی ہے۔ طاہر حنفی کے اس شعر سے بھی حظ اٹھایا جاسکتا ہے:

ساحل کی جستجو میں پھرو گے کہاں کہاں
مژگاں سے باندھ لو نیا پیانِ زندگی

طاہر کی یہ غزل بھی ایک گندھی ہوئی غزل ہے اور قابلِ توجہ ایسی ہی ایک غزل اور بھی ہے جس کی ردیف ہے ''حنوط تھی'' حنوط لاشیں ہوتی ہیں مگر طاہر حنفی کمال چابکدستی سے وہ زندگی بھی حنوط کر دیتا ہے جو سانسیں لے رہی تھی، کہیں کہیں انا بھی حنوط ہوتی ہے اور ایک احتجاج اور خود احتسابی کے کرب کے ساتھ:

انا کی چیخ صدا کے کھنڈر میں زندہ ہے
مگر وہ کون ہے جو اپنے گھر میں زندہ ہے

اسی قبیل کا ایک اور دکھ:

بصارتیں بھی گروی ہیں، بصیرتیں بھی یرغمال
آگہی کرے اگر تو کسی طرح کرے کمال

پاکستان کا ادب تحریکات کا پابند رہا نہیں، ادبی تحریکات معاشرے کو تبدیل کرنے کا ایک جتن ہے مگر اس روش کو کیا کہیے کہ ادب میں نیا خیال نئی تحریک زندگی میں Incorporate نہیں ہوتی۔ مغرب میں یہ روش عام تھی سو معاشرے میں مثبت تبدیلی لانے اور فکر کو جلا بخشنے کے لیے آواز کا سماعتوں تک پہنچنا ہی کافی نہ تھا اس کو جزوِ بیاں بھی ہونا تھا۔ اس نے کلیت پسندی کو رد کر کے یکسانیت اور ہم نظمی کے خلاف بھی آواز اٹھانا تھی، نئی فکر کسی نظم کی اسیر ہوتی نہیں مگر ہندو پاک میں جمود کو ثبات ہے جو صورت کل تھی وہی آج۔ ذرا کو ترقی پسندی کی آندھی چلی، جدید ادبی رجحانات نے دنیا میں بہت کچھ بدل کر رکھ دیا ہے مگر یہ لہر ایک مختصر مدت کے لیے اردو ادب کا موضوع بنی اور جنت نشین ہوگئی۔ جدیدیت نے ذہنی رویوں اور فکر کو متاثر کیا۔ یہ تحریک تخلیق کی آزادی کی داعی تھی مگر اس کی روح پر انگریز دشمنی کے دبیز پردے ڈال دئے گئے اور معانی پر پہرے بٹھا دئے گئے۔ پاکستان کا ادب پاکستان کی سیاسی تاریخ سے بہت متاثر رہا۔ طاہر حنفی نے پاکستان کی سیاسی تاریخ بنتے اور بگڑتے دیکھی ہے اور اس کو یہ اندازہ بھی ہے کہ اس تاریخ نے ادیب کی نفسیات کو کیسے متاثر کیا ہے اور ادب پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ طاہر حنفی نے اپنی شعوری عمر میں Diplomacy کے رموز سے آگاہی کو کہیں اپنی تخلیق سے ہم آہنگ رکھا ہے۔ اس کی نظموں میں یہ آگاہی اتر آئی ہے۔ طاہر حنفی نے پاکستان میں ثقافتی تخلیقیت کو بھی ابھرتے دیکھا ہے اور وہ اس سے متاثر بھی معلوم ہوتا ہے۔ طاہر حنفی کی نظموں کا نفسِ مضمون تہہ داری کو چھوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ قاری متن کو نہیں پڑھتا بلکہ متن بھی قاری کو پڑھتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قرأت کی سرگرمی اور قاری کے تفاعل کے سبب طاہر حنفی کی تخلیق کا Narrative کسی تابع تشریح کا محتاج نہ ہوگا۔ طاہر حنفی کے ہاں تخلیق سماجیات کی ہم رکاب بھی ہے۔ اسی لیے طاہر حنفی کے ہاں موجود بہت موجود ہے۔

- بقیہ -

ٹیپو سلطان اور علامہ اقبال

ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا۔''

یہی نہیں بلکہ علامہ اقبال ہی کی تحریک اور ترغیب سے ٹیپو سلطان کی سلطنت کے حالات کے مخطوطات اور کتابوں کی طرف توجہ کی گئی اور تاریخ اور ادب میں ایک اچھا ذخیرہ جمع ہوگیا۔ ضرب کلیم میں علامہ کے اردو میں پانچ اشعار سلطان ٹیپو کے نام سے نظر آتے ہیں جن پر ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں:

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمئ محفل نہ کر قبول
صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبریلؑ نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

امریکہ کتنا دور کتنا پاس

(رفعت علی سید کا سفرنامہ)

بسمینہ سراج
(پشاور)

اس سفر کی روداد کچھ یوں ہے کہ اُن کے شوہر ناصر علی سید کے کالموں کے مجموعے'' ادب کے اطراف میں'' کی تقریب رونمائی حلقہ اربابِ ذوق نیویارک کے زیرِاہتمام امریکہ میں منعقد ہونا تھی۔ اس پروگرام کا دعوت نامہ جب اُن کے شوہر کو ملا تو وہ کشمکش و پیچ میں مبتلا تھے کہ جائیں کہ نہ جائیں کیونکہ کچھ عرصہ پہلے اُن کے بڑے بیٹے افراز کی شادی پاکستانی نژاد امریکن لڑکی (کومل عابد) سے ہو چکی تھی اور وہ امریکہ اپنی بیوی کی پڑھائی کی وجہ سے امریکہ شفٹ ہو چکے تھے۔ اب گھر میں میاں بیوی اور چھوٹا بیٹا ابتسام رہ گئے تھے۔ گھر میں اداسی کا موسم چل رہا تھا ایسے میں اُن کے شوہر بھی امریکہ چلے جاتے تو گھر اور گھر والے بہت ہی اکیلا پن محسوس کرتے۔ ایسے میں ناصر علی سید کے جگری دوست حسام حر کے کہنے پر امریکہ میں اُن کے دوست عتیق احمد صدیقی نے دعوت نامے میں مسٹر اینڈ مسز ناصر علی سید لکھ بھیجا تو پھر دونوں نے ویزے کی کاروائی شروع کی اور اُن کو آسانی سے ویزہ مل بھی گیا پھر اُن کے چھوٹے بیٹے ابتسام نے بھی ویزے کے لئے درخواست دی اور اُن کو بھی آسانی سے ویزہ مل گیا۔ اپنے اس سفرنامے کے بارے میں رفعت علی سید لکھتی ہیں۔

''میری یہ سفر کہانی بھی محض ایک ماں کی اس بے چینی اور تڑپ کا قصہ ہے جس کا لاڈ و پیار سے پلا ہوا بیٹا اس سے ہزاروں میل دور اپنی ایک نئی دنیا بنانے اور بسانے گیا ہوا ہے۔ مائیں تو دعاؤں اور ٹھنڈی چھاؤں کی گٹھڑی سروں پر اُٹھائے سورج مکھی کی طرح اپنے بچوں کے چہرے ڈھونڈتی کھوجتی رہتی ہیں۔''(۱)

رفعت علی کا ادبی سفر بہت مختصر سا ہے اگرچہ ایک بڑے ادیب کی بیوی ہونا خود بہت بڑا اعزاز ہے، لیکن اس کے باوجود اُن کو اپنی ادبی کم مائیگی کا احساس شدت کے ساتھ ہے۔ اُن میں لکھنے کا جوہر موجود ہے، لیکن انہوں نے گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے اس کو بھرپور وقت اور توجہ نہیں دی۔ اگر وہ اس طرف توجہ کرتی تو اس وقت ایک مشہور و معروف ادیبہ ہوتی۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ ان کے شوہر نے بھی اُن کو اس طرف مائل نہیں کیا۔ اس لئے رفعت علی اپنے سفرنامے کے بارے میں بلند بانگ دعوے کرنے کے بجائے بڑی انکساری سے لکھتی ہیں۔

''یہ سفر کہانی بھی پڑھنے والوں سے رعایتی نمبر لینے کی متقاضی ہے۔ اس سفر کہانی میں آپ کو اگر امریکہ کی بجائے میرے بیٹے افراز کا ذکر زیادہ لگے تو اسے میری ممتا کی مجبوری سمجھ کر برداشت کر لیں اگر آپ اسے میرے دل کی آنکھوں سے پڑھیں گے تو یہ اس تحریر کے حق میں بہت بہتر ثابت ہوگا۔''(۲)

ویسے تو مصنفہ سفر کرنے کی شوقین ہے اور جب سفر کا پروگرام بن جاتا ہے تو وہ رات سے ہی تیاری کر لیتی ہیں۔ یہ سفر زیادہ تر اندرون ملک شمالی علاقہ جات کے ہوتے تھے۔ انہوں نے اس سے پہلے کبھی ہوائی سفر نہیں کیا تھا۔ اس وجہ سے اُن کو بہت ڈر لگ رہا تھا۔ اپنے اس پہلے ہوائی سفر کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''یہ میرا پہلا ہوائی سفر تھا گویا آج میں زندگی میں پہلی دفعہ جہاز میں بیٹھ رہی تھی۔ بچپن میں ایک دفعہ اللہ بخشے میرے والد صاحب کو جنہوں نے مجھے اندر سے جہاز دکھا دیا تھا لیکن یہ جہاز اُس جہاز سے بہت بڑا تھا۔ ہم نے سیٹ نمبر دیکھے اور اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ خوشی تو بہت تھی مجھے کہ میں بھی جہاز میں بیٹھ گئی ہوں جبکہ علی تو خیر بہت جہازوں میں گھوما ہے۔ ابتسام بھی حکومتِ پاکستان کی طرف سے ایک یوتھ ڈیلیگیشن کے ساتھ چین جا چکا تھا۔ اس لئے ہم تینوں میں سے یہ میرے لئے پہلا تجربہ تھا پھر بھی یہ احساس کافی تھا کہ ہم جہاز میں اکھٹے بیٹھے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ ڈر بھی بہت لگ رہا تھا کہ پتہ نہیں کیا ہوگا اور علی کو تو واقعی بہت ڈر لگتا ہے مگر نہ ہی علی نے اپنا ڈر بتایا اور نہ ہی میں نے علی کو دھک دھک کرنے والے اپنے دل کی حالت بتائی۔''(۳)

سفرنامہ نگار سفرنامے میں مشاہدے کی قوت سے زیادہ کام لیتا ہے اور اُس کے لئے سب سے اہم چیز واقعات اور مشاہدات کی پیشکش کا ہے۔ مشاہدہ جس قدر گہرا ہوگا سفرنامہ نگار کے تمام واقعات حقیقی رنگ میں اور قاری کے لئے دلچسپی کا باعث ہونگے۔

''آخر کار ڈھائی گھنٹے کی پرواز کے بعد اعلان ہوا کہ ہم دبئی ائیر پورٹ پر اُترنے والے ہیں۔ اس ائیر پورٹ کی خوب صورتی کے بارے میں بہت کچھ سُنا اور پڑھا تھا اس لئے اسے دیکھنے کا ایک اشتیاق تھا اور اب جو اسے دیکھا تو سنی اور پڑھی ہوئی ساری باتیں بہت کم لگیں یوں بھی پاکستان کے باہر کی دنیا دیکھنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا سو دبئی ائیر پورٹ کو دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔''(۴)

واشنگٹن میں کچھ گھنٹوں کے لئے رکنا تھا اور پھر شارلٹ جانا تھا۔ اس مختصر قیام کو انہوں نے ضائع نہیں کیا بلکہ ائیر پورٹ سے ٹیکسی میں واشنگٹن کی سیر کو نکل پڑے۔ اس کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں۔

''ہم نے سڑک سے ہی وہائٹ ہاؤس دیکھا کہ سیکیورٹی کی وجہ سے قریب سے دیکھنے پر کچھ ہی دن قبل پابندی لگا دی گئی تھی البتہ ابراہیم لنکن کی یادگار کو جی بھر کے دیکھا بہت بڑا ہجوم تھا بہت سی تصویریں بنائیں۔ سیڑھیوں میں بیٹھ کر نرم دھوپ کا لطف لیا مختلف ملکوں اور تہذیبوں کے سیاحوں کا جوش و خروش دیکھنے لائق تھا۔''(۵)

اپنے بیٹے سے ملنے کی بیتابی اتنی زیادہ ہے کہ مصنفہ کو اس سفر میں کوئی زیادہ کشش یا خوشی نہیں کہ وہ امریکہ جا رہی ہیں بلکہ اس سفر کو صرف اور صرف بیٹے سے ملنے کا ایک ذریعہ محسوس کرتی ہیں۔ وہ ماں کی ممتا کے ہاتھوں اتنی مجبور ہیں کہ بہت اچھے اور خوب صورت مناظر کی عکاسی وہ بہت مختصر طریقے سے کرتی ہیں اُن کو بیٹے کے پاس پہنچنے کی جلدی اور بے قراری ہوتی ہے۔ اور یہ بے قراری ہر سطر اور

ہر جملے سے عیاں ہوتی ہے۔آخر جب وہ ڈینور ائیر پورٹ پہنچتی ہیں تو وہ اپنی بے قراری کا اظہار یوں کرتی ہیں۔

’’آخر کار تقریباً چار گھنٹے کی پرواز کے بعد اناؤنسمنٹ ہوئی کہ ہم ڈینور ائیر پورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں۔میں نے آنکھیں بند کر کے دل کی گہرائیوں سے زمینوں اور آسمانوں کے خالق و مالک کا شکر یہ ادا کیا اور پھر کھڑکی کا شٹر ہٹا کر ڈینور کا ہوائی منظر دیکھا مسکرا کر اسے سلام کیا اور جہاز کے پہیوں نے زمین کو چھوا تو دل کی حالت بیان نہیں کر سکتی سامنے تمام تر رعنائیوں اور خوب صورتی کے ساتھ دلہن کی طرح سجا ہوا ڈینور کا ائیر پورٹ تھا اور میرا دل آنکھوں کے دریچہ تک آ کر افراز کو ڈھونڈ نے لگا۔جب لاؤنج سے ہو کر سامان لینے کے ایریا تک پہلا ہی موڑ مڑے تو میری پیاسی آنکھوں نے بہت دور ہی سے افراز (سنی) کو دیکھ لیا ساتھ ہی میری بیٹی کومل ،داؤد بھائی زہرہ بھابھی ،دلکش اور روکش دور ہی سے نظر آ گئے ۔پوری فیملی ہمیں ائیر پورٹ پر لینے آئی ہوئی تھی۔کتنی ہی دیر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت ۔سنی کو بار بار گلے سے لگایا آنکھوں کو چھوا کر کہتی کہیں یہ خواب نہ ہو۔مگر دل میں ٹھنڈ پڑ گئی کیونکہ میرا جگر کا ٹکڑا میرے سامنے کھڑا تھا۔‘‘(٦)

جب مصنفہ اپنے بیٹے کو سینے سے لگاتی ہیں تو اُن کی بے قرار و بے چین ممتا کو سکون ملتا ہے۔ماں بیٹے کے ملاقات کا منظر بڑا جذباتی منظر تھا۔یہ منظر ایسا تھا کہ حساس قاری کے لئے اپنے جذبات کو کنٹرول کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ مصنفہ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس سفر میں قاری کو اپنا ہم سفر رکھا اور ایک لمحے کے لئے بھی قاری کو تنہا نہیں چھوڑا۔

’’چاندنی رات میں خوب صورت کشادہ سڑکیں ،خوب صورت گھر ، قطار اندر قطار لش لش کرتی گاڑیاں دیکھتے دیکھتے ہم گھر پہنچ گئے وہاں ایک بار پھر سنی کو گلے لگایا پیار کیا اس کے بعد ہم تھوڑا افریش ہوئے۔‘‘(٧)

سفر نامہ نگار کا اپنے سفر نامے میں کسی ملک کی تہذیب و ثقافت کی عکاسی بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے سفر نامہ نگار مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے وہ جس ملک میں جاتا ہے اُس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو مدنظر رکھتا ہے اور کسی تعصب کے بغیر پوری صداقت کے ساتھ ان تمام امور کی نشاندہی کرتا ہے جس سے اُس کا واسطہ پڑ چکا ہوتا ہے ۔مصنفہ جب پہلی بار باجماعت تراویح پڑھتیں ہیں تو اس کے بارے میں یوں بتاتی ہیں۔

’’افطاری کے بعد نماز پڑھی کچھ دیر تک باتیں کیں اور پھر تراویح کے لئے سب گھر والوں نے مسجد کا رخ کیا۔عرب ممالک کی طرح Denever کیا پورے امریکہ میں عورتیں بھی مسجد میں جا کر باجماعت نمازیں ادا کرتی ہیں اور میرے لئے بھی یہ بس ایک نیا مگر انتہائی دل خوش کن اور ایک پر جوش تجربہ تھا ۔باجماعت تراویح اور دیگر نمازوں کی طرح نماز عید بھی میں نے زندگی میں پہلی بار عید گاہ میں باجماعت ہی پڑھی وہاں لوگوں سے عید ملے بہت اچھا لگا۔‘‘(٨)

مصنفہ عید گزارنے کے بعد اپنے چچا سے ملنے فینکس ان کے گھر اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ جاتی ہیں۔وہاں سیر کرنے کے بعد وہ اپنے مہمانوں کی آمد کی خوشی میں ایک محفل کا انعقاد کرتے ہیں۔اور بہت سارے لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔اس محفل کے بارے میں لکھتی ہیں۔

’’پروگرام شروع ہوا میرے انکل نے میزبانی کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے تفصیل سے میرا،میرے ہم سفر اور میرے بیٹے کا تعارف کروایا اور ایسے انداز میں کہ میں بتا نہیں سکتی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔رات گئے تک گفتگو سوال جواب ادبی مباحث اور پھر نشست کا آخری حصہ علی کی شعر و شاعری کے لئے مخصوص تھا۔مزے کی محفل جمی رہی مہمانوں کی تواضع چائے،کافی سموسہ کباب فروٹ چاٹ اور مختلف سنیکس سویٹ ڈش سے کی گئی خوب محفل جمی رہی اور دیر تک رہی حاضرین نے خوب داد دی۔‘‘(٩)

’’جوں جوں نیویارک جانے کے دن قریب آ رہے تھے دل کو عجیب طرح سے بے قراری تھی کبھی تو یہ سوچتی کہ کتنا اچھا ہوتا کہ اب پاکستان سے آنے کا پروگرام بن رہا ہوتا کبھی دل کرتا کہ ابھی نہ جاؤں لیکن جانا تو تھا جتنا بھی رہتی آخر جانا تو تھا جب سب بیٹھے ہوتے تو میں خاموش سنی کو دیکھتی رہتی کہ کیا پتہ پھر کب ملاقات ہو راتوں کو نیند نہیں آتی اگر کبھی آ بھی جاتی تو آدھی رات کو آنکھ کھل جاتی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔‘‘(١٠)

آخر کا اس خاندان کو ڈینور سے نیویارک جانا تھا جہاں ناصر علی سید کی کتاب کی رونمائی کی تقریب تھی جو اس سفر کا اصل سبب تھا۔مصنفہ پر یہ وقت بہت بھاری تھا جوں جوں وہ جانے کے بارے میں سوچتی اتنی ہی وہ بے قرار ہوتی ۔لیکن ان کو بادل ناخواستہ نیویارک جانا ہی تھا۔ بیٹے سے جدائی کا منظر اس طرح بیان کرتی ہیں۔

’’ہمیں تقریباً 2 گھنٹہ پہلے ائیر پورٹ پہنچنا تھا ۔سو اداس اور بوجھل دل لئے ہوئے گھر سے نکل پڑے سارے راستے ادھر اُدھر نظریں دوڑاتی رہی اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے سنی کبھی کبھی شیشے میں دیکھ لیتا پھر اُس نے راستے میں گانے لگا دیے اُس سے گاڑی کے اندر کا ماحول اور بھی اداس ہو گیا۔ سب چپ تھے۔کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا ہر ایک کو یہی خدشہ تھا کہ زبان بولی تو آنکھیں بھی چپ نہیں رہیں گی۔چھم چھم برس پڑیں گی آخر کار ہم ائیر پورٹ پہنچ گئے۔‘‘(١١)

جب نیویارک میں ناصر علی سید کے کالموں کے مجموعے ادب کے اطراف میں کی تقریب رونمائی ہو رہی تھی تو اس تقریب میں بڑے بڑے شاعر و ں اور ادیبوں کو پاکستان و ہندوستان سے بلایا گیا تھا۔اس تقریب کے بارے میں لکھتی ہیں۔

’’ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا یہ بہت شاندار پروگرام تھا مجھے تو اس لئے بھی اچھا لگا کہ دیار غیر میں میرے شریک حیات کی کتاب کی رونمائی تھی یہ میرے لئے ایک بہت اعزاز کی بات تھی کہ ایک غیر ملک میں علی کو اتنی عزت مل رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا عتیق صاحب کے لئے دل سے دعائیں نکلیں علی کی کتاب‘‘

ادب کے اطراف میں'' کے حوالے سے بہت سے مضامین پڑھے گئے، نظمیں پڑھیں گئیں۔اور میں بھیگی پلکوں کے ساتھ خواتین میں گھری بیٹھی سن سن کر مولا کریم کا شکرادا کرتی رہی۔''(۱۲)

جب بہت سارے شاعر ایک جگہ جمع ہوں اور مشاعرہ نہ ہو ایسا تو ممکن نہیں۔کتاب کی رونمائی کے بعد ایک مشاعرے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا یعنی ایک ٹکٹ میں دومزے۔کتاب کی رونمائی اور مشاعرہ بھی وہ بھی انٹرنیشنل شہرت کے حامل شعراء کا واقعی لاجواب پروگرام تھا۔

''مشاعرہ میں جانے کے لئے تیار ہو گئے وہاں پہنچے تو ایک عجیب سماں تھا، ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا سب سے پہلے وہاں لوگوں کو Dinner کرایا گیا اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔دیر تک انڈیا کے ڈائیریکٹر اور ممتاز شاعر گلزار کا انتظار رہا اور ان کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔قاسم پیرزادہ، وسیم بریلوی، ناصر علی سید کے ساتھ ساتھ بالی وڈ کے جانے پہچانے فنکار فلم بازار اور امراؤ جان ادا کے ہیرو فاروق شیخ بھی سٹیج پر تھے۔رات گئے تک محفل جمی رہی مشاعرہ میں ڈاکٹر شفیق صاحب بھی آئے تھے۔''(۱۳)

ایک سفر نامہ نگار سفر نامہ لکھتا ہی اس لئے ہے کہ وہ اپنے احساسات، جذبات اور مشاہدات کو دوسروں تک پہنچائے۔ادیب و شاعر معاشرے کا حساس طبقہ ہوتا ہے وہ کسی بھی واقعہ یا المیہ سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار بھی اپنے طریقے سے کرتے ہیں۔مصنفہ جب بیٹے سے مل کر مطمئن ہو جاتی ہیں اور اُن کی ممتا کو قرار مل جاتا ہے تو وہ سیر سپاٹے کے پروگرام سے لطف انداز ہوتی ہیں۔جب سمندر کی سیر کرتی ہیں تو سمندر کی تصویر کشی یوں کرتی ہیں۔

''یہ دن کا وقت تھا اور ہم فیری میں سمندر کی سیر کر رہے تھے۔فیری کی تین منزلوں پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی مجسمہ آزادی (سٹیچو آف لبرٹی) کو تو بس تصویروں میں دیکھا تھا اب کیمرہ میں تصویر بن گیا تھا۔خوب انجوائے کیا۔''(۱۴)

مین ہٹن کی سیر کی روداد کچھ یوں بیان کرتی ہیں۔

''جب ہم نے مین ہٹن میں قدم رکھا تو ٹائم اسکوائر کی چکا چوند نے ہمیں حیران کر دیا اور ہمیں لگا کہ ہم کسی اور ہی دنیا میں آ گئے۔سچی بات تو یہ ہے کہ نیویارک کے ٹائم اسکوائر کا جواب نہیں روشنیوں کی بہتات، رنگوں کی بہار، عمارتوں کا نکھار، انسانوں کی یلغار، تماشوں کی تکرار، آدمی کس کس چیز کو دیکھے اور تعریف کرے، ہم تمام بازاروں میں گھومے اور سب کچھ دیکھا۔مین ہٹن کی بڑی بڑی فلک بوس عمارتیں دیکھیں، سٹیچو آف لیبرٹی دیکھا مین ہٹن نیویارک کا دل ہے۔کیا خوب صورت شہر ہے۔جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔خوب سیر کی رات گئے واپسی ہوئی۔''(۱۵)

جب انسان پہلی بار ملک سے باہر جاتا ہے تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جاتا ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتا ہے۔مصنفہ کے شوہر ناصر علی سید تو بین الاقوامی شہرت کے حامل شاعر وادیب ہیں، اللہ نے اُن کو بہت عزت اور شہرت دی ہے۔دونوں میاں بیوی سیر کے دوران ایک دیوالی کی تقریب میں پہنچ گئے۔وہاں جب تقریب کے میزبان اُن کے شوہر کو تمام سامعین سے متعارف کراتے ہیں۔یہ لمحہ میاں بیوی دونوں کے لئے حیرت اور خوشی کا باعث بنتا ہے۔

''ہم سیر کے لئے جیکسن ہائیٹس آ گئے وہاں پر دیوالی کا پروگرام تھا وہ Attend کیا۔سٹیج پر خوب صورت شو جاری تھا۔پرفارمنسز ہو رہی تھیں اچانک کمپئر نے اناؤنس کیا علی نے اور میں نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف حیرانی سے دیکھا، اناؤنسمنٹ تھی کہ ''خواتین و حضرات اس سے ہمارے بیچ پاکستان کے ایک کوی ناصر علی سید آئے ہیں ہم انہیں دیپاولی (دیوالی) کی شبھ کا منائیں کہتے ہیں اور کچھ ہی دیر میں انہیں منچھ پر بلائیں گے۔''(۱۶)

70 روز امریکہ کے مختلف شہروں کی سیر اور قیام کے بعد یہ مختصر سا قافلہ روانگی کا سفر اختیار کرتا ہے۔واپسی کا سفر اداسی کا سفر تھا کیونکہ مصنفہ کا لاڈلا بیٹا امریکہ میں رہ گیا تھا۔جس سے ملنے کو بیقرار ماں کا دل اور بھی زیادہ بیقرار ہو گیا تھا کیونکہ طویل جدائی پھر اُن کے درمیان آ گئی تھی۔

''جہاز میں بیٹھے اور کھڑکی میں سے ایئر پورٹ کو دیکھا ایسے لگتا تھا کہ جیسے آسمان کے ستارے زمین پر آ گئے ہوں۔روشنیوں کا شہر نیویارک زیرلب کہا اور پھر اس پر آخری نظر ڈالی اور اپنی سیٹ پر خاموشی سے بیٹھ گئی اور کھڑکی میں سے دور ہوتے ہوئے نیویارک کو دیکھتی رہی اور یہی سوچتی رہی یا رزق یا نصیب کون جانے یہ جگہ پھر دیکھنا نصیب ہوتی ہے کہ نہیں بلکہ اس سے زیادہ یہ دکھ بھی تنگ کر رہا تھا کہ میرا بیٹا مجھ سے بہت دور ہو جائے گا آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی لیکن علی کی وجہ سے چپ کیوں کہ انہوں نے سختی سے منع کیا تھا کہ رونا نہیں میں نے بھی سر ہلا کر وعدہ کر لیا مگر جب کیپٹن نے اناؤنسمنٹ کی کہ سفر کا آغاز کرنے والے ہیں اور جہاز نے جب ٹیکسی کرنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پہلے تیز ہوا اور پھر جب اُس نے نیویارک کی زمین کو چھوڑا تو میری آنکھوں نے نہ علی کی بات کا سوچا اور نہ میرے وعدے کی پروا کی اور برسنا شروع کر دیا تو پھر برستی ہی چلی گئیں۔جہاز کی لائٹس تو پہلے ہی آف تھی تو میں نے اپنے دل کا غبار خوب نکالا اب ہم نے مسلسل 16 گھنٹے کا سفر کرنا تھا علی کوئی بات کرتے تو ہوں ہاں میں جواب دیتی۔دل کا ٹکڑا دور ہوتا جا رہا تھا دعائیں لبوں پر جاری تھیں۔اللہ اُسے کامرانیاں اور کامیابیاں نصیب کریں۔اللہ زندگی کی ہر خوشی نصیب میں لکھ دیں۔''(۱۷)

مصنفہ عام فہم اور سادہ زبان میں لکھنے کی عادی ہیں۔مصنفہ نے مناظر کی منظر کشی اور جزئیات نگاری میں کافی اختصار سے کام لیا ہے اگر وہ چاہتی تو اس سفر نامے کو اور بھی دلچسپ بنا سکتی تھی انہوں نے امریکہ کی تاریخ، ثقافت اور معیشت پر کوئی بات نہیں کی نہ ہی وہاں کی عریانی و فحاشی کی کوئی جھلک اُن کو دکھائی دی۔اُن کی زیادہ تر گفتگو کا مرکز اُن کا خاندان اور گھر کے افراد تھے۔وہ امریکہ کی چکا چوند سے متاثر نہیں ہوئیں اور نہ ہی انہوں نے امریکہ کی تیز رفتار زندگی کا موازنہ پاکستان کی زندگی سے کیا۔انہوں امریکہ کا سفر ایک سیاح کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ماں کی حیثیت سے کیا۔اس لئے وہ اُن تمام مقامات سے بہ آسانی گزر گئیں جہاں سے عام لوگوں کے لئے گزرنا آسان نہیں۔

''میرے ہونے کی گواہی''

ڈاکٹر گلِ رعنا
(نظام آباد)

تجھ بن تیرا شہر ویران بہت ہے
گلی چپ ہے بازار سنسان بہت ہے
تیری صدائیں ہیں چار سو بکھری ہوئی
تیری تلاش میں نگاہ پریشان بہت ہے

قضا کی آندھی اپنے ساتھ کبھی کبھی ایسے بیش قیمت گوہر رول کے لے جاتی ہے جو صرف انمول ہی نہیں ہوتے بلکہ شاذ و نادر ہی دستیاب ہوتے ہیں اور نعم البدل کے طور پر رنج و ملال سے بھرے اشکوں کے موتی ہماری آنکھوں میں چھوڑ جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک آندھی ۲۷ مئی ۲۰۲۰ء کو آئی اور اپنے ساتھ ایک گوہر نایاب رول کے لے گئی کہ اس جیسا دوسرا شائد ہی پھر ملے۔ افسوس، ایک بلند پایہ طنز و مزاح نگار اپنے مداحوں کو داغِ مفارقت دے گئے جو اپنی ذات میں ایک ادارہ، ایک انجمن تھے جن کی شخصیت انسانیت کی مظہر تھی، وضع داری جن کا خاصہ، رواداری جن کا چلن، خلوص جن کا شیوہ، کرم فرمائی جن کی عادت تھی، جن کے قلم میں بے پناہ روانی تھی۔ جن کے موضوعات جدا، طرز انوکھی، فکر نرالی، اسلوب اچھوتا، سوچ میں جدت، خیال میں ندرت، جن کے ہاں خیالات کا ایک سیل رواں تھا جن کا ہر موضوع اور نظریہ جواں تھا۔ جنھوں نے مجبور کی مجبوری، مظلوم کی مظلومی اور بے بس کی بے بسی کو اسی شدت سے محسوس کیا تھا جس شدت سے انہوں نے سماج کی بے راہ روی، بربریت اور ظلم و نا انصافی، تہذیب کے شیرازے کا بکھرنا اور سماج کی بنیادوں کا ڈگمگانا اور لڑکھڑانا دیکھا تھا۔ جن کے نزدیک عصرِ حاضر میں انسان کی ہنسی ایک المیہ اور قہقہہ ایک ایڈوینچر سے کم نہ تھا۔ وہ لفظوں کے فسوں گر، قہقہوں کے سوداگر، رفاقتوں کے پاسدار، جمیع احباب کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے۔ بقول رضا نقوی واہی:

بخشا ہے جس نے ظرافت کو اعتبار
ہے مجتبیٰ حسین وہ طناز خوش خصال
مضمون جو بھی آئے قلم کی گرفت میں
ابلاغ بے نظیر ہو ترسیل بے مثال
جو بات کی خدا کی قسم، لاجواب کی
انشائیہ نگاری میں دکھلا دیا کمال
پاپوش میں لگا دی کرن آفتاب کی
آیا کسی کی خاکہ نگاری کا جب خیال
فنکار کے علاوہ وہ یاروں کا یار ہے
دل اس کا ہے خلوص و محبت سے مالا مال
واہی کی ہے دعا کہ ظرافت کا یہ سفر
عمر دراز پائے، فن اس کا ہو لا زوال

ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ مجتبیٰ حسین کا فن لازوال ہے اور وہ یقیناً ایک بے مثال قلم کار اور بلند پایہ ادیب تھے۔ انہوں نے معاشرتی، سماجی، سیاسی اور گھریلو مسائل کو اپنی تحیروں کا موضوع بنایا، ان کی تحریروں میں گہرا شعور ملتا ہے۔ روانی اور سلاست ان کے قلم کی خصوصیت رہی، انہوں نے برسوں مسلسل لکھا اور تسلسل کو منقطع ہونے نہیں دیا۔ جب انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا تو مختصر عرصے بے خود دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ گویا صحت مند ادب کی ترسیل ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ ذو معنی الفاظ کے استعمال سے تحریر کو دل کش بنانے کا ہنر ان کے قلم میں تھا۔

انہوں نے تلخ حقائق کا اظہار بڑی نفاست سے کیا ہے۔ جب وہ تہذیب کی زبوں حالی کا شکوہ کرتے ہوئے رنجیدہ ہو کر طنز کرتے ہیں تو اسلوب کی لطافت اور چاشنی طنز کی ساری کڑواہٹ کو گوارہ بنا دیتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ خود کا مذاق اڑایا ہے لیکن دوسروں کی ہجو نہیں کی۔ خود پر ہنسنا ان کی وسیع القلبی کی دلیل ہے۔ اپنی تحریروں میں وہ ہمیشہ اردو زبان و ادب کے ماحول کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ حیدرآباد اور گلبرگہ سے وابستگی کا اظہار اکثر تحریروں میں پڑھنے کو ملا۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

زندہ دلی اور بذلہ سنجی کے حوالے سے مجتبیٰ حسین اور ان کی تحریریں دونوں ہی ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ کئی موقعوں پر تو مجتبیٰ حسین سچے غموں کی حدوں کو پھلانگ کر تلخیوں اور تیزابیت والے باب کو بند کر کے باشعور قہقہہ لگانے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے زندہ رہنے والے آرٹ کی آبیاری کی ہے۔ افسوس وہ فنکار ہمارے درمیان نہیں رہا جس نے ہمیشہ ہنسی اور کرب کو گڈمڈ کر کے پیش کیا۔ طنز و مزاح کی آڑ میں قوم کی اصلاح کرنی چاہی۔ بعض تحریروں میں انسانوں اور جانوروں کے تقابل کے ذریعہ اپنی دروں بینی کا ثبوت دیتے ہیں جس کے بغیر نہ تو فن کی تخلیق ممکن ہے اور نہ فنکار کی تکمیل۔ مجتبیٰ حسین کے نزدیک ہنسی کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ ہنسی کو ایک مقدس فریضہ مانتے ہیں۔ یہ احساس دلاتے ہیں کہ انسان کی زندگی غموں کا مجموعہ سہی لیکن اسے ہنسنا چاہیے کیونکہ خوش طبعی مقاصد کے حصول میں خضر راہ کا کردار نبھاتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کے ہاں موضوعات میں تنوع ہے۔ وہ کبھی پہلے گریجویٹ درویش کا قصہ سناتے ہیں تو کبھی اپنی مکانی ہے کا ذکر کرتے ہیں، کبھی ان کی نظریں ریل منتری پر پڑتی ہیں تو کبھی ان کی آنکھیں رکشہ والے کی بے بسی پر نم ہو جاتی ہیں۔ کبھی وہ دنیا کے غفوروں کو ایک ہو جانے کا مشورہ دیتے ہیں تو کبھی

کتوں کوانسان سے خبردار رہنے کی تاکید کرتے ہیں۔وہ ڈائریکٹر کے کتے کا حال بھی سناتے ہیں اور دیمکوں کی ملکہ سے گفتگو بھی، ڈاکٹروں کے ناز بھی اٹھاتے ہیں اور اپنے نوکر کی ناز برداریاں بھی سہتے ہیں۔مرزا غالب کی پریس کانفرنس بھی کرواتے ہیں اور اس دور میں حاتم طائی کو بھی یاد کرتے ہیں۔غرض چار مینار کے میناروں سے لے کر چینی ایش ٹرے تک کو انہوں نے موضوع بنایا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے کبھی موضوعات نہیں تلاشے ایسا لگتا ہے کہ موضوعات قطار باندھے ان کے سامنے کھڑے ہیں، مجتبیٰ حسین کے پاس موضوع خود چل کر آتا ہے۔یہ بھی ان کا کمال ہے کہ وہ موضوع کو ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دیتے بلکہ اسے اپنی انگلی پکڑوا کے چلاتے ہیں۔ان کا فن ہر دل عزیز ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے نہ تو ''عصر'' سے ٹکر لی اور نہ ''ہم عصروں'' سے ٹکرانے کی کوشش کی۔ان کا فن پاکیزہ ہے۔دکھاوا، حسد، رقابت یا بازی لے جانے کے جذبات سے عاری بے حد شفاف بھی ہے۔اس شفافیت میں وہ مقناطیسیت ہے جو پڑھنے والے کو اپنی جانب کھنچے چلے آنے پر مجبور کر دیتی ہے۔پھر ''داد'' کے انبار لگ جاتے ہیں۔مجتبیٰ حسین نے کبھی ادو کے ان ''ٹیلوں'' پر چڑھ کر نہ تو دوسروں پر کنکریاں ماری ہیں اور نہ اپنی بادشاہت کا اعلان کیا ہے۔مزاج کی سادگی، فکر کی گہرائی، اسلوب کی ظرافت، بیان کی بے ساختگی، خیال کی متانت، لہجے کی سلاست، اظہار کی برجستگی اور بے تکلفی نے ان کے فن کو معراج بخشی ہے۔

ان کے ہاں بذلہ سنجی اور شوخی جا بجا ملتی ہے ان کا بیان فرحت بخش ہے۔ان کی تحریریں رگِ ظرافت کے پھڑکنے کا ثبوت جا بجا ملتا ہے۔انہوں نے ذو معنی الفاظ اور کہاوتوں کے استعمال سے برجستہ مزاح پیدا کیا ہے۔جب ایک عام آدمی کے درد بھرے احساس کو مجتبیٰ حسین فنکاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں تو ایک باشعور قہقہے کے پیچھے چھپی محرومیوں اور ناآسودگیوں کی جھلک نظر آتی ہے، ان کی تحریروں میں فکر کا پہلو نمایاں ہے۔ایسا لگتا ہے کہ مجتبیٰ حسین کسی مسئلے پر قلم اٹھانے سے پہلے اس کے اسباب و محرکات کا بھرپور جائزہ لیتے ہیں۔ان کی ہر تحریر زندگی اور اس کے مسائل سے مربوط ہے۔انہوں نے انسانوں کی الجھنوں اور مسائل کو نہ صرف پرکھا بلکہ اس کا ظریفانہ اظہار بھی کیا ہے۔ان کے فن کا مقصد تہذیب و ثقافت کی پاسداری اور اس کی حفاظت ہے۔اکثر تحریروں میں اقدار کی پامالی پر وہ مایوس نظر آتے ہیں۔تہذیب و ثقافت کی خستہ حالی انہیں بار بار جھنجھوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مضمون ''چار مینار اور چار سو برس'' میں انہوں نے دم توڑتی ہوئی تہذیب کی زبوں حالی پر دو آنسو گرانے کی بجائے بھرپور اور کاٹ دار طنز کیا ہے۔ لکھا ہے:

''پہلے حیدرآبادی تہذیب آدمی کے کردار سے جھلکتی تھی۔اب اس کی ڈکار سے جھلکتی ہے۔''

مجتبیٰ حسین ایک بے غرض اور بے لوث انسان تھے۔وہ وقت کے جتنے بڑے نباض تھے اتنے ہی عظیم کسی شخصیت کے عکاس تھے۔اپنے خاکوں میں انہوں نے ''شخص'' کا کم اور ''شخصیت'' کا سراپا زیادہ بیان کیا ہے۔وہ اپنے مخصوص اندازِ بیان اور اچھوتے اسلوب کے ذریعہ کسی شخصیت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ اس کی تہہ در تہہ شخصیت قاری کے آگے کھلی کتاب بن جاتی ہے اور قاری ایک زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ بات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔انہوں نے شائستہ اور صحت مند مزاح کا جا بجا استعمال کیا ہے۔مجتبیٰ حسین کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتے ان کی تحریر میں جھلاہٹ کی گنجائش نہیں ہے وہ طنز سے کام ضرور لیتے ہیں لیکن اس طرح نہیں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے ہوں۔ان کے طنز میں بھی شائستگی اور مزاح کا عنصر غالب رہتا ہے۔وہ مختلف ممالک کی تہذیبوں کا موازنہ ہندوستانی تہذیب سے کر کے اپنے ہم وطنوں کی خامیوں اور کوتاہیوں کی جانب نہ اشارہ کرتے ہیں بلکہ افسوس کا اظہار بھی ان کے ہاں ملتا ہے۔مجتبیٰ حسین کی تحریریں اردو طنز و مزاح کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

مجتبیٰ حسین کو جہاں مداحوں نے سراہا وہیں ان کی مخالفتیں بھی ہوئیں لیکن اس عظیم صاحب طرز ادیب کی عظمت کو سلام کہ جس نے مخالفت کے باوجود اپنے مشن پر قائم رہنے کو ترجیح دی اور لکھتے رہے۔حکومت ہند نے انہیں باوقار اعزاز ''پدم شری'' سے نوازا لیکن شہریت ترمیمی قانون کے خلاف بطور احتجاج انہوں نے ''پدم شری'' واپس کر دینے کا اعلان کیا۔یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے عملی طور پر اس بات کا اعلان کیا کہ:

''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ''

مجتبیٰ حسین نے کہا تھا جس دن انسان ہنسی کی تقدیس اور پاکیزگی کو سمجھ لے گا اور جس دن ہر انسان کو اس کے حصے کے قہقہے مل جائیں گے اس دن یہ دنیا جنت بن جائے گی۔مجتبیٰ حسین نے دنیا کو جنت بنانے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔انہوں نے دنیا کو ہمیشہ غم اور آنسو سے دور دیکھنا چاہا۔کہتے ہیں:

''میں ان آنسوؤں کو آنے والی صدیوں کا حصہ بننے نہیں دینا چاہتا۔میں ماضی کے انسانوں کے آنسوؤں اور آنے والی صدیوں کے انسان کی آنکھوں کے درمیان ایک حد فاصل بننا چاہتا ہوں۔اس لیے جب بستر سے اٹھتا ہوں اپنے آپ کو تاریخ کا ایک نیا باب سمجھنے لگتا ہوں۔''

لیکن ۲۷۔مئی ۲۰۲۰ء کو بستر سے ایسے اٹھے کہ ادب کی تاریخ کا ایک باب ہی بند کر دیا۔انہوں نے ادبی سفر کے دوران اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ قہقہے کے پیچھے سے انسان کی ہنسی آنسو بن کر نہ ٹپکے۔افسوس، ایسے ہمدرد، روشن خیال اور طرح دار ادیب کو ہم نے کھو دیا۔لیکن ایک بات تو طے ہے کہ ہنس ہنس کے اپنی آہوں کی چھپائے رکھنے والے مجتبیٰ حسین اپنی تحریروں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور قاری کو قہقہے ایڈونچر کی جانب مائل کرتے رہیں گے۔

مر بھی جاؤں تو کہاں، لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے ہونے کی گواہی دیں گے

کوئی یوں مرتا ہے؟

محمد حمید شاہد
(اسلام آباد)

جب اندر بیٹھا پڑھتے لکھتے اکتا گیا تو کچھ دیر کے لیے یاسمین اور بچوں کے ساتھ باہر گیٹ پر اس پہاڑی نما پلاٹ کو دیکھنے کھڑا ہو گیا تھا جسے بڑی بڑی مشینوں سے ہموار کیا جا رہا تھا۔ زمین سخت تھی، محض سخت نہیں سنگلاخ، دن بھر ایک قوی ہیکل مشین اپنی نوکدار چونچ سے پتھروں کو یوں ٹھونگتی رہی تھی جیسے ہدہد درختوں کے تنے ٹھونگتا ہے، پتھریلی زمین کے ٹوٹ ٹوٹ کر علیحدہ ہونے والے ٹکڑے اسی مشین نے یہاں وہاں دھکیل گھسیٹ کر ایک جگہ ڈھیر کر دیے تھے۔ پھر وہاں ایک اور مشین آ گئی تھی، پہلی جتنی بڑی۔ یہ پتھر توڑتی نہیں، ٹوٹ چکے پتھروں کی ڈھیریوں کو جناتی مٹھی میں بھر بھر اٹھاتی اور ٹریکٹر کے پیچھے بندھی ٹرالی میں ڈالے جاتی تھی، کہیں اور لے جانے کے لیے۔ ٹریکٹر ٹرالی کے کئی پھیرے لگ چکے تھے۔ میں شاید وہی پھیرے گن رہا تھا کہ میری بہو بیٹی اندر سے میرا فون اٹھائے'' بابا، بابا '' کہتی باہر آئی، کہنے لگی۔ آپ کا فون کب کا بجتے بجتے خاموش ہو گیا ہے۔

میں نے فون تھام لیا، جھانک کر دیکھا۔ سرخ ہو چکے وہاں کئی نام تھے۔ دو سب سے اوپر تھے کشور ناہید اور نجیبہ عارف۔

کشور ناہید سے دن میں تین چار بار بات ہو چکی تھی۔ ایک کتاب کی پی ڈی ایف کا تبادلہ ہوا تھا۔ نجیبہ کا فون کئی دنوں کے بعد آیا تھا، سوچا کشور ممکن ہے کتاب کے حوالے سے بات کرنا چاہ رہی ہوں، کھڑے کھڑے نجیبہ کی بات سن کر انہیں فون کرتا ہوں اور مفصل بات کریں گے اور نجیبہ کا نمبر ملا لیا۔ نجیبہ نے لگ بھگ روتےہوئے پوچھا تھا۔

''پتہ چلا؟''

میں بوکھلا گیا، یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ پوچھا۔

''کیا؟''

''ہائے اللہ۔۔۔ آصف فرخی''

''کیا ہوا آصف کو؟''

پتہ نہیں اس کے بعد نجیبہ نے کیا کہا تھا مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، جیسے'' ٹھک ٹھک'' ہو رہی تھی میرے اندر اور سب کچھ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا اور وہیں ڈھیر ہو رہا تھا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔

کشور ناہید سے بات ہوئی تو ہم دونوں کی چیخیں نکل گئیں، میں فون کے اس طرف تھا وہ فون کے اس طرف۔ یاسمین اور بچے مجھے دلاسا دینے پاس آئے اور پھر یوں اداس ہو کر چپ چاپ بیٹھ گئے تھے جیسے ہم سب کا اپنا کوئی یہیں پاس سے اٹھ کر اچانک چلا گیا تھا، ہمیشہ کے لیے، اور جہاں سے وہ اٹھ کر گیا تھا وہاں ایک خلا کا سناٹا گونج رہا تھا۔

فون مسلسل بج رہا تھا۔ سب مجھے پرسہ دے رہے تھے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی، عابدہ تقی، ڈاکٹر زاہد چغتائی، رحمٰن عباس، امر شاہد اور اور بہت سارے۔۔۔ ناصر عباس نیر تو بات کرتے کرتے رو دیے تھے۔ آصف سے ہماری آخری ملاقات ایک ساتھ کراچی میں ہوئی تھی۔ ہم کراچی لٹریچر فیسٹیول میں شرکت کے لیے وہاں تھے۔ آصف اس فیسٹول کے بانیوں میں تھے مگر جس طرح الگ ہوئے تھے یہاں کسی پروگرام میں ملاقات ممکن نہ تھی۔ آصف کا فون آ گیا۔ ملاقات طے پا گئی۔ افضال احمد سید اور تنویر انجم نے ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھایا اپنے گھر لے گئے۔ وہیں آصف منتظر تھے، وہاں سے نکلے تو کھانا کھانے نکل گئے خوب گپ شپ رہی، ہماری گپ شپ بھی کیا تھا کیا لکھا جا رہا ہے، کیا پڑھا جا رہا ہے کچھ تخلیق کے بھید بھنور، کچھ تنقید کے پینترے، اور رات گئے ہوٹل واپسی ہوئی تھی۔

ناصر عباس نیر کا فون آیا تو ایک ایک بات یاد آ گئی تھی۔ جب ہم وہاں جدا ہونے لگے تو آصف نے کہا تھا:

''یہ ہمارا مل بیٹھنا ہی ہمارا فیسٹول ہے۔''

ایس ایم ایس اور واٹس ایپ پیغامات کا الگ سے سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ سب مجھے پرسہ دے رہے تھے۔ مجھے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا تھا۔ مجھے بھی کندھا چاہیے تھا جس پر سر رکھ کر رو سکوں۔ احمد شاہ کو فون کیا۔

''سچ سچ بتائیں ہوا کیا تھا۔''

''کیا ہونا تھا، بس چلا گیا، مر گیا ہمارا یار آصف فرخی۔ اور کیا بتاؤں۔ چلا گیا۔''

جیسے احمد شاہ خود نہیں بول رہے تھے، ان کا دکھ بول رہا تھا۔

ڈاکٹر شیر شاہ سید نے کہا؛

''شدید دل کا دورہ پڑا۔ بخار سے پہلے ہی کمزور پڑ گئے تھے۔ سنبھل نہ سکے۔ لاش یہاں ہسپتال کے سرد خانے میں رکھوا دی ہے جنازہ کل ہوگا کراچی یونیورسٹی میں۔''

وہ بولتے چلے گئے، جیسے وہ بھی خود نہیں بول رہے تھے۔

انور سن رائے، افضال احمد سید، تنویر انجم ایک ایک کر کے سب سے بات کی۔ سب دکھ سے کناروں تک بھرے ہوئے تھے، بات کرتے ہی جیسے چھلکنے لگے تھے۔

انتظار حسین مر گئے تو آصف جنازے میں شریک ہونے کے لیے کراچی سے فلائٹ لے کے لاہور پہنچے تھ۔ ادھر اسلام آباد سے میں اور کشور ناہید وہاں پہنچے تو آصف پہلے سے پہنچ گئے تھے۔ مجھے دیکھا، لپک کر آئے اور میرے گلے لگ کر یوں دھاڑیں مار مار کر روئے کہ میرے دل کا بوجھ بھی اتر گیا تھا۔ مجھے اپنے دل کا بوجھ اتارنا تھا کسی سے گلے لگ کر اور اُسی طرح دھاڑیں مار کر رونا تھا جیسے

آصف اور میں انتظار حسین کی موت پر روئے تھے۔

''آصف فرخی تو آپ کو زندگی کی طرف لائے تھے۔ اب آپ کیا کریں گے۔ کر بھی کیا سکتے ہیں، رونے اور دعا کرنے کے علاوہ۔''

جب میں رونے کے لیے کوئی کندھا تلاش کر رہا تھا مجھے اپنے سیل پر شاہد اعوان کا یہ میسیج ملا تھا۔

میں نے آصف کے اس احسان کا ذکر اپنی کسی گفتگو میں کیا تھا، جی، ایک سوال کے جواب میں، جب مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ وبا کے دنوں میں، میں نے کیا لکھا۔ تالا بندی کے ابتدائی دنوں میں مجھ پر ڈپریشن کے دورے پڑے تو لکھنا پڑھنا سب چھوٹ گیا تھا۔ تب آصف کا فون آیا تھا۔ کہا:

''پڑھنا لکھنا نہیں چھوڑنا۔ لکھیں اور مجھے بھیج دیں ارادہ ہے دنیازاد کا وبا اور ادب کے حوالے سے خاص شمارہ مرتب کروں۔''

اس فون کے بعد میں نے ڈپریشن کو جھٹک دیا کہ جینے کی امنگ جاگ اٹھی تھی، بس پھر کیا تھا اوپر تلے کئی تحریریں ہو گئیں۔ لکھنے والے نے درست لکھا تھا کہ مجھے آصف زندگی کی طرف لائے تھے۔

جتنے دکھ آصف نے سہے تھے اور جس اذیت میں وہ تھے، بہ طور خاص اپنی عائلی زندگی کی ناکامی کے بعد، وہ سب میرے علم میں تھے۔ وہ بہت اکیلے ہو گئے تھے اور اکیلے ہی زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہے تھے کتاب کتاب اور بس کتاب۔ مگر میں جانتا تھا وہ اندر سے روز تھوڑا تھوڑا کر کیمر رہے تھے۔ عید اور اس کی موت کے درمیانی وقفے میں ہماری تین بار فون پر بات ہوئی تھی۔ آصف بیمار تھے، انہیں تیز بخار تھا، شوگر لیول زیادہ تھا، ڈپریشن بھی تھا مگر وہ ایسا ظاہر کر رہے تھے جیسے سب کچھ ٹھیک ہونے والا تھا مگر کچھ بھی تو ٹھیک نہیں ہوا اور ان کا دِل دغا دِے گیا۔

ڈاکٹر شیر شاہ سید نے بتایا تھا:''ہارٹ اٹیک بہت شدید تھا، سنبھل ہی نہ پائے تھے۔''

مجھے یاد آتا ہے کہ آصف نے اپنی ایک کتاب کافکا کو منسوب کی تھی۔ کافکا کو یاد کرنے کا سبب انتساب کا حصہ ہونے والا ایک بہت قیمتی مشورہ ہے، جی، دم سادھے اپنی لکھنے والی میز کے سامنے بیٹھ جانے کا مشورہ؛ یوں جیسے کوئی شکاری پانی میں کانٹا پھینک، دم سادھ کر بیٹھ رہتا ہے۔ میں نے آصف کی لگ بھگ سب تحریریں پڑھ رکھی ہیں، اور بہ سہولت ایسی تحریریں (بہ طور خاص افسانے) نشان زد کر سکتا ہوں جہاں پوری دنیا کی سرمستی اُن کے تخلیقی وفور کے سپرد ہوئی ہے مگر اپنے عہد کی نہایت فعال ادبی شخصیت، افسانہ نگار، تنقید نگار، مترجم، منتظم، اور''دنیازاد'' کے مدیر کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں وقار پانے والے آصف فرخی کے بارے میں یہ گمان باندھنا کہ وہ ٹک کر کہیں بیٹھے رہتے تھے، میرے لیے بہت مشکل تھا۔ تاہم ڈاکٹر اسلم فرخی اور محترمہ تاج بیگم کے اس فرزند کی گھٹی میں ادب سے محبت پڑی ہوئی تھی اور یہ ان کی زندگی کی ترجیحات میں رہا۔ آصف کے دادا محمد احسن ادیب تھے اور چچا انور احسن صدیقی بھی۔

?? آصف کی والدہ ڈپٹی نذیر احمد کی پڑپوتی اور شاہد احمد دہلوی کی بھتیجی ہیں۔ ایسے میں سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اگر دنیا کی سرمستی کو آنکنے پر وہ قادر ہو گئے تھے تو یہ مختلف بات ضرور تھی انہونی نہیں۔ اور اگر یہ انہونی تھی بھی تو ہم اس انہونی کو ہوتے دیکھ رہے تھے۔

ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی سے ایم بی بی ایس کیا، ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ سے ماسٹرز کی ڈگری لی، آغا خان یونیورسٹی کراچی، اقوام متحدہ کے ادارے یونیسف اور حبیب یونیورسٹی کراچی میں عملی زندگی کی جدوجہد میں حصہ لیا، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس والوں کے لیے ادبی میلوں کا اہتمام کیا، ملکی و غیر ملکی کانفرنسوں میں شرکت کی، ادبی جریدے''دنیازاد'' کی ادارت اور ایک اشاعتی ادارے''شہرزاد'' کی انتظامی ذمہ داریوں کو بہ خوبی نبھایا اور ساتھ ہی ساتھ افسانے لکھے، تراجم کیے، تنقید کی، اخبارات میں کالم لکھے وبا اور تالا بندی کا زمانہ آیا تو کئی وڈیو کالم دیے۔ زندگی کے جس شعبے میں بھی انہوں نے قدم رکھا پوری کمٹ منٹ سے رکھا اور ہر فرض اخلاص نیت سے سرانجام دی اور نام کمایا۔

''آتش فشاں پر کھلے گلاب''،''اِسم اعظم کی تلاش''،''چیزیں اور لوگ''،''شہر بیتی''،''شہر ماجرا''،''میں شاخ سے کیوں ٹوٹا''،''اِیک آدمی کی کمی''، ''میرے دِن گزر رہے ہیں'' آصف فرخی کے افسانوں نے مجموعے ہیں تنقید اور ترجمے کی کتب الگ۔ جتنا انہوں نے لکھا، ترجمہ کیا یا مرتب کیا، اتنا تو عام آدمی زندگی بھر پڑھ بھی نہیں پاتا۔ آخری دنوں میں تو وہ بہت عجلت میں تھے، سب کام ہو گئے ابھی دو باقی تھے، دنیازاد مرتب ہونا تھا اور بیٹی سے ملنے باہر جانا تھا۔ یہی انہوں نے مجھے بتایا تھا مگر وبا کے سبب یہ کام موخر ہو رہے تھے۔ وہ لوگوں کو وبا میں مرنے سے بچنے کی تلقین کرتے کرتے موت کی نظر میں آ گئے۔ موت، جس کا فیصلہ اٹل تھا ملتوی نہیں ہو سکتا تھا۔ عید آئی اکیلے میں بیمار پڑے اور ادھر کراچی میں مر گئے۔

کوئی یوں بھی مرتا ہے پیارے دوست۔ کاش میں کراچی پہنچ سکتا آپ کی چارپائی کو کندھا دیتا، خود قبر میں اتارتا اور کسی کا کندھا تلاش کر کے خوب روتا تو دل کا بوجھ بھی اتر جاتا۔ کاش، اے کاش مگر سب کچھ ہماری مرضی اور خواہش سے کہاں ہوتا ہے۔

علامہ اقبال

علامہ اقبال بچپن ہی سے بذلہ سنج اور شوخ طبیعت واقع ہوئے تھے۔ ایک روز جب ان کی عمر گیارہ سال کی تھی انہیں اسکول پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ ماسٹر نے پوچھا:''اقبال تم دیر سے آئے ہو؟''

اقبال نے بلاتوقف اور بے ساختہ جواب دیا:

''جی ہاں، اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔''

درویش کی صدا

حسن منظر
(کراچی)

برنگِ غالب

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
دُلکی چلنے کا مدعا کیا ہے
موت کا دن اگر معیّن ہے
اس سے پہلے یہ خرخشہ کیا ہے
پھونک دو پڑھ کے کچھ بھلا ہوگا
میں نہیں جانتا دوا کیا ہے
گر نہ دے دھاگا وپڑھا پانی
رب سے بی بی کا واسطہ کیا ہے
چھپنا حوروں کا داڑھی والوں سے
ہم ہیں حیراں یہ ماجرا کیا ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہوں
پاس عاشق کے اور بچا کیا ہے
چومنے دو تم اپنی پرچھائیں
اور درویش کی صدا کیا ہے
مٹ گئے جب ہلا کو اور ہٹلر
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
خوں بہا جن کو دینا بھول گئے
اُن سے کہتے ہو مدعا کیا ہے!
سب کو اُن سے چلن کی امید
صدق جانیں نہ اور صفا کیا ہے!
پاس ان کے کہاں سے آیا ہے
کتنا ظاہر ہے اور چھپا کیا ہے؟
ان کا کفارہ کیا اور کیا فطرہ
غیر کے مال پر زکوٰۃ کیا ہے!
میں نے مانا کہ کچھ نہیں ح میم
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

برنگ خواجہ میر درد

کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے
ملک کو تم ننگا بُچّا کر چلے

دیس ہے یہ یا کوئی شمشان ہے
جن میں خودداری تھی یاں، سب مر چلے

بہتی گنگا ہے یہاں سب کے لیے
جن کو پینی تھی وہ ساغر بھر چلے

دوستو یاں لگ رہی ہے دھر پکڑ
تم نکل لو یاں سے بس جیدھر چلے

منہ دکھانا ہے تمہیں ابلیس کو
اُس کی کُل امّت کا حصہ ہَر چلے!

یہ بھی کوئی قید ہے اے قائدو
ایک دم اک آئے اِیدھر، اُودھر چلے!

شاہ سے نیچے تلک سب نیک ہیں
آخرت کا ڈر بھلا اِن پر چلے!

سامنے ان کے ہیں کیا قاضی فقیہہ
ان کے آگے اُن کی میّا مر چلے

کس کے ذمّے کیا لکھیں منکر نکیر
کس لیے آئے تھے یہ کیا کر چلے

○

ایک صدی کا قصّہ

شکیلہ

دیپک کنول (ممبئی)

ایک لڑکی جس کے اجداد افغانستان اورایران کے شاہی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے بیچ اقتدار کی رسہ کشی بہت دنوں سے چل رہی تھی۔اقتدار کے حصول کے سبب اُنکے بیچ اتنی تلخی بڑھ گئی کہ وہ آپس میں ہی برسر پیکار ہوگئے۔ایک بچی جو اس جنگ وجدل کے میدان سے بہت دور اپنی ماں کے لوٹنے کا انتظار کررہی تھی۔تقدیر کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ ماں کبھی لوٹ کرنہیں آئی۔اقتدار حاصل کرنے کی ہوس میں اُسکی ماں کا ہی نہیں بلکہ اُسکے نانا نانی کا بھی قتل ہوا۔تب وہ بچی بہت چھوٹی تھی۔اُسکی دو اور بہنیں تھیں۔ایک اُس سے بڑی تھی اور ایک چھوٹی۔ان بچیوں کے بقا کے لئے اُنکا باپ اور اُنکی خالہ ان تینوں کو لے کر ہندوستان آگئے۔وہ ہندوستان کے شہر بمبئی میں پناہ گزین ہو گئے۔شومئی قسمت کہ یہاں آکر بھی اس بچی کو سکھ دیکھنے کو نہیں ملا۔یہاں پہنچنے کے تھوڑے دن بعد اُن کے باپ کا انتقال ہوگیا۔بس ایک خالہ رہ گئی جو ایک شاہی خاندان میں بیاہی جانے والی تھی۔اُسکی منگنی ایک شہزادے سے ہوئی تھی۔وہ شاہی محل میں دلہن بن کے جانے والی تھی۔ایک طرف اُسکی اپنی زندگی اور دوسری طرف ان معصوم زندگیوں کا سوال۔کیا وہ اپنی زندگی ان بچیوں کے لئے قربان کر دے گی؟ یہ ایک سوال تھا جس کے جواب کا سب کو انتظار تھا۔مرحبا ہو اُنکی خالہ کو جس نے ان بچیوں کی خاطر اپنا سنہرا مستقبل قربان کر دیا۔اُسنے زندگی بھر کنواری رہنے کا فیصلہ کیا۔

یہ کہانی بادشاہ بیگم کی ہے جو یکم جنوری 1935 کو مشرق وسطی میں پیدا ہوئی۔اسکی دوسری بہن کا نام نور جہاں جسے پیار سے سب نور کہہ کر بلاتے تھے اور سب سے چھوٹی بہن کا نام نسرین تھا۔شروع شروع میں اُنہیں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔یہ شہر اُنکے لئے اجنبی تھا۔آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔تین بچیوں کو پالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔وہ کام کی تلاش میں نکلتے تھے اور رات کو تھکے ماندے لوٹ آتے تھے۔خالہ ہندی فلموں کی دیوانی تھی۔محبوب خان اور کاردار کے ساتھ اُنکے خاندانی مراسم تھے۔وہ بادشاہ بیگم کو لے کر گھر سے نکلتی تھی اور پھر اسٹوڈیوز کا طواف کرنے لگتی تھی۔ایک دن وہ کاردار سے ملی۔اے آر کاردار اُسوقت فلم ''داستان'' بنا رہا تھا جس میں ثریا اور راج کپور کام کر رہے تھے۔بادشاہ بیگم نے اُسے اپنا دکھڑا سنایا۔کاردار نے اُنکی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔اُسنے بادشاہ بیگم کو پہلا بریک دیا۔بطور بال کلاکار کے۔اُسی نے اُسکا نام بادشاہ بیگم سے بدل کر شکیلہ رکھ دیا۔''داستان'' کے ساتھ ہی اُسے ایک اور فلم میں کام کرنے کا موقع ملا جس کا نام ''دنیا'' تھا۔اسمیں بھی ثریا ہیروئن تھی۔یہ دونوں فلمیں 1949 میں ریلیز ہوئیں۔

شکیلہ سن طفولیت سے بلوغت میں قدم رکھ چکی تھی۔اب اُسے فلموں میں دوسرے درجے کے رول ملنے لگے تھے۔اُسنے دھڑا دھڑ فلمیں سائن کیں۔1951 میں اُسکی فلم ''گماشتہ'' ریلیز ہوئی۔1952 میں ''سند باد دی سیلر'' اور ''راج رانی دمینتی'' ریلیز ہوئیں۔شکیلہ کا کہنا تھا کہ اُسکی پہلی فلم ''علی بابا'' تھی جو کہ 1953 میں ریلیز ہوئی جس میں اُسکا مختصر سا رول تھا جو بہت چلی غلط ہے۔اس سے پہلے وہ کئی فلموں میں کام کر چکی تھی۔اسی سال اُسکی چار فلمیں ریلیز ہوئیں۔''آغوش''، ''شہنشاہ''، ''راج محل'' اور ''ارمان''۔ان فلموں سے اُسے کوئی خاص پہچان نہیں ملی۔گورودت جو کہ فلم ''آر پار'' بنا رہا تھا۔اُسے ایک ہیروئن کی تلاش تھی۔وہ کسی بڑی ہیروئن کو لینے کی پوزیشن میں نہیں تھا کیونکہ فلم کا بجٹ اس بات کی اجازت نہیں دے رہا تھا اسلئے اُس نے ایک ایسی ہیروئن کی تلاش کی جو نئی بھی نہ ہو اور اسٹار بھی نہ ہو۔شکیلہ اس معیار پر پوری اُترتی تھی۔اُسنے شکیلہ کی کئی فلمیں دیکھیں۔اُسے یہ لڑکی پسند آگئی۔اُسنے اُسے اپنی فلم کے لئے سائن کیا۔اس فلم میں اسکے علاوہ خود گورودت، شیاما اور جانی واکر بھی کام کر رہے تھے۔اس فلم میں اُسکی چھوٹی بہن نور کو بھی ایک چھوٹا موٹا رول کرنے کا موقع ملا۔اس فلم کے بیشتر گانے شکیلہ پر فلمائے گئے۔فلم سپر ہٹ رہی اور شکیلہ کو پہلی بار پہچان ملی۔اسی فلم میں اُسکی چھوٹی بہن نور جہاں کا جانی واکر پر دل آگیا اور اُسکے بعد پیار اتنی تیزی سے پروان چڑھا کہ اُنہوں نے چھپ کے شادی کر لی۔

گورودت شکیلہ کے کام سے اتنا خوش تھا کہ جب اُسنے فلم ''سی آئی ڈی'' بنانے کا فیصلہ کیا تو اسمیں ہیروئن کے رول کے لئے شکیلہ کو سائن کیا گیا جب کہ منفی کردار کے لئے وحیدہ رحمان کو پہلی بار ہندی اسکرین پر پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔اس فلم میں ہیرو دیو آنند تھا اور موسیقی او پی نیر کی تھی۔گورودت اس فلم کا فلمساز تھا اور ہدایت کار راج کھوسلہ تھا مگر گورودت کی ہر کام میں مداخلت رہتی تھی۔چونکہ وحیدہ کو دیکھتے ہی گورودت پر اس حسینہ کا جادو ایسا چل گیا تھا کہ وہ اُس کے کام میں نکھار لانے کے لئے پس پردہ کافی محنت کرتے تھے۔شکیلہ پر تو کوئی دھیان ہی نہیں دے رہا تھا۔چونکہ وحیدہ گورودت کی منظور نظر تھی اسلئے وہ ہدایت کار راج کھوسلہ کو ٹھینگے پر لیتی تھی۔وہ گورودت سے شکایت کرتا تھا تو گورودت وحیدہ کو کچھ کہنے کی بجائے راج کھوسلہ کو ہی گیان دینے لگتا تھا۔شکیلہ بیچاری چپ چاپ اپنا کام کر کے نکل جاتی تھی۔دیو آنند اس فلم کا ہیرو تھا مگر شکیلہ کافی شرمیلی تھی۔وہ اپنے ہیرو کے ساتھ گھل مل نہیں پائی۔دیو آنند بھی خاموش طبع کا آدمی تھا۔دونوں ساتھ میں کام کرتے تھے۔کام ختم ہوتا تھا تو دونوں اپنی اپنی راہ پکڑ لیتے تھے۔دھیرے دھیرے وہ وحیدہ سے گھل مل گئی۔وہ فلم کی ہیروئن تھی جب کہ وحیدہ ایک ویمپ کے رول میں تھی یعنی کہ ایک منفی رول میں۔اُسنے کبھی اُسے یہ احساس نہیں

ہونے دیا کہ وہ نئی ہے۔وہ اُسے ایک لمحے کے لئے اکیلے نہیں چھوڑتی تھی اور بار بار اُسکی ہمت بندھاتی تھی۔حالانکہ اس فلم میں وحیدہ رحمان کے ساتھ اُسکا ایک بھی شاٹ نہیں تھا پھر بھی وہ اُس سے ملتی تھی۔اُس سے بیٹھ کر باتیں کرتی اور اُسے مفید مشوروں سے نوازتی رہتی۔اُن کی یہ فلم بھی کاروباری لحاظ سے بیحد کامیاب رہی۔

شکیلہ پر قسمت کی دیوی مہربان ہوئی تھی۔ایک فلم ساز نے شکیلہ کو سائن کرنا چاہا۔فلم کا نام ''علی بابا چالیس چور'' تھا۔شکیلہ کی خالہ نہیں چاہتی تھی کہ اسطرح کی فلمیں کر کے اُس پر سی گریڈ فلموں کا ٹھپہ لگ جائے اسلئے فلمساز کو بھگانے کے لئے اُسنے دس ہزار کا معاوضہ مانگا جو کہ اُس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔اُس نے سوچا کہ فلم ساز دس ہزار سن کے بھاگ کھڑا ہو گا مگر ہوا اسکے اُلٹ۔وہ فلم ساز دس ہزار دینے کے لئے تیار ہو گیا۔فلم بنی اور 1954 میں ریلیز ہوئی۔خدا کا کرنا دیکھئے کہ یہ فلم بھی ہٹ ہوئی۔فلم تو کامیاب ہوئی مگر شکیلہ کا قد اور چھوٹا ہو گیا۔اس فلم سے شکیلہ کو اے گریڈ کی فلموں کے لائق نہیں سمجھا گیا اور اُسے بی گریڈ فلموں کے زمرے میں رکھا گیا۔جس ہیروئن نے ''سی آئی ڈی'' اور ''آر پار'' جیسی سپر ہٹ فلموں میں کام کیا تھا وہ اب چھوٹی چھوٹی فلمیں کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔فلمی پنڈتوں نے اُسے عربی چہرے کا نام دیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ اس فلم کے بعد اُسکے حصے میں بی گریڈ فلمیں ہی آنے لگیں۔جیسے 1954 کی ''لال پری''1955 کی ''ویر راجپوتانی''1956 کی ''آگرہ روڑ''۔اس فلم میں نندہ بھی اُسکے ساتھ کام کر رہی تھی۔ایک دن وہ جب اسٹوڈیو سے نکلی تو تیز دھوپ تھی۔اُسنے سر پر اسکارف باندھا تھا اور آنکھوں پر کالا چشمہ لگایا تھا۔وہ کار میں بیٹھی تھی اور کار اُسکے گھر کی طرف دوڑ رہی تھی۔اُسکے پیچھے نندہ کی کار تھی۔ایک جگہ کار رکی اور نندہ کی کار اُسکے پاس آ کے ٹھہر گئی۔وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کار میں یہ کونسی خوبصورت لڑکی بیٹھی ہے۔نندہ نے اُسے فوراً پہچان لیا اور وہ اپنی کار سے اُتر کر اُسکی کار میں جا کر بیٹھ گئی۔انڈسٹری میں شکیلہ کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ چپ کی مورت ہے کسی سے بولتی نہیں۔ہمیشہ چپ رہتی ہے جیسے چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہو۔جب نندہ اُس کے ساتھ بیٹھ گئی تو اُسنے بیٹھتے ہی اُس سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تم سیٹ پر کسی سے بات نہیں کرتی ہو۔لوگ یہاں تک کہتے ہیں کہ شکیلہ نہ کسی سے بولتی ہے اور نہ کسی کو اپنا دوست بناتی ہے۔شکیلہ ہنسی اور اُسنے اُس سے کہا کہ نہ بولنے کی وجہ اُسکا شرمیلا پن ہے جس کے سبب وہ لوگوں سے گھل مل نہیں پاتی۔اُسکے بعد دونوں نے کھل کے باتیں کیں۔اس ملاقات میں دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ روز ملا کریں گے۔ایک دن شکیلہ نے نندہ سے کہا کہ وحیدہ اکیلی رہتی ہے۔انڈسٹری میں ابھی اُسکی کوئی سکھی سہیلی نہیں ہے۔کیوں نہ اُس کے گھر پر جا کر اُس سے ملا جائے۔نندہ فوراً راضی ہو گئی۔وہ وحیدہ سے ملیں۔تینوں میں ایسی دوستی ہو گئی جس کی مثالیں دی جاتی تھیں۔اس تکڑی میں ایک اور سہیلی شامل ہو گئی جس کا نام جبین تھا۔وہ بھی سی گریڈ فلموں کی ہیروئن تھی۔ان میں ایسی دوستی رہی جس کی نظیر ملنا مشکل تھی۔یہ چاروں سہیلیاں اپنا بیشتر وقت ایک ساتھ گزارتی تھیں۔ساتھ میں فلمیں دیکھنے جایا کرتی تھیں۔

1957 میں شکیلہ کی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''حاتم طائی'' تھا۔یہ پریوں کی کہانی تھی جس میں وہ ایک پری بنی تھی۔یہ فلم رنگین تھی۔کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ چھوٹی سی فلم بڑی بڑی فلموں کو پچھاڑ دے گی۔ہوا یہ کہ کمائی کے لحاظ سے یہ اے گریڈ کی فلم ثابت ہوئی۔اس نے کامیابی کے ہر طرف جھنڈے گاڑ دئے اور فلمساز کے گھر میں ہن برسنے لگا۔

وہ ایک بار پھر اس منجدھار سے نکل آئی۔اس فلم کی کامیابی کی بدولت اُسے ایک بڑی فلم ملی۔اسی فلم کا ہیرو کشور کمار تھا۔اُسے کشور کمار کے ساتھ پہلی بار کام کرنے کا موقع ملا۔اس فلم کا نام ''بے گناہ'' تھا۔کشور کمار نے انڈسٹری میں ایک خاص مقام بنایا تھا۔اُس کے ساتھ کام کرنے میں کوئی بھی ہیروئن فخر محسوس کرتی تھی۔شکیلہ بھی ان خوش بختوں میں سے ایک تھی۔کشور کمار ایک زندہ دل انسان تھا۔وہ اپنی حرکتوں سے اپنے ساتھ کام کرنے والے اداکاروں کو ہر دم ہنساتا رہتا تھا۔وہ جب سیٹ پر آجاتا تو سیٹ پر افراتفری مچ جاتی تھی۔وہ آتے ہی اُلٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگتا تھا۔کبھی اُچھلنے لگتا تھا تو کبھی سیٹ پر چھلانگیں مارنے لگتا تھا۔شکیلہ کا کہنا تھا کہ اس فلم میں سب نے کشور کمار کی وجہ سے پورا پورا تعاون کیا۔ساتھی کلاکاروں کو پتا ہی نہیں چلا کہ وقت کیسے گزر گیا اور فلم کیسے بن گئی۔اُنہوں نے ہنستے کھیلتے یہ فلم مکمل کی۔اس فلم کی شوٹنگ کے دوران اُس نے ایک دن شکیلہ سے کہا کہ وہ اپنی پہلی بیوی ریما کو طلاق دینے والا ہے کیونکہ اُس نے اُس کا کھانا میز پر رکھ دیا اور خود اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔وہ جب گھر پہنچا تو اُسنے دیکھا کہ اُسکا کھانا گھر میں پل رہی بلیاں چٹ کر رہی ہیں۔اُسمیں جو کچھ جھوٹا بچا تھا اُسے کھانا پڑا۔

''بے گناہ'' فلم بنی اور بڑے دھوم دھڑکے سے ریلیز ہوئی۔شکیلہ جس فلم پر اُمیدیں لے کے بیٹھی تھی اُسکی بدنصیبی دیکھئے کہ ریلیز کے دس دن بعد اس فلم پر روک لگ گئی۔ہوا یوں کہ ہالی وڈ کے ایک پرڈیوسر ڈینی کایا کو کسی نے خبر کر دی کہ اُسکی فلم کی کاپی کی گئی ہے۔وہ بمبئی چلا آیا۔اُسنے فلم ''بے گناہ'' دیکھی۔فلم دیکھ کے وہ اپنا سر پیٹنے لگا۔یہ فلم تو اُسکی انگریزی فلم ''KNOCK ON WOOD'' کی ہو بہو کاپی تھی۔بغیر کوئی اجازت لئے، بنا کہانی کے حقوق خریدے انہوں نے یہ فلم بنائی تھی۔اُس نے ''بے گناہ'' کے فلم ساز کے خلاف عدالت میں کیس ٹھونک دیا۔عدالت نے دونوں فلمیں دیکھیں اور ڈینی کایا کی شکایت کو صحیح پایا۔عدالت نے ڈینی کایا کے حق میں فیصلہ دیا۔ہالی وڈ کا فلمساز کیس جیت گیا جب کہ ہندی فلمساز کیس ہار گیا۔فلم کو سینما ہالوں سے اُتارا گیا۔فلم اب کسی کام کی نہیں رہی تھی۔فلمساز نے کیا یہ کہ اس فلم کے تمام نگیٹو ریلیوں کو تلف کر دیا۔شکیلہ کے لئے یہ واقعہ کسی صدمے سے کم نہ تھا کیونکہ وہ مہی پال اور راجیت جیسے سی گریڈ ہیروں کے چنگل سے نکل کر اے گریڈ ہیرو کے ساتھ بہت دنوں کے

بعد جلوہ افروز ہو رہی تھی کہ فلم کا یہ حشر ہوا۔ وہ بہت دنوں تک اُداس اور پریشان رہی۔ دل سے بار بار ایک آہ نکلتی تھی کہ اس فلم کے ساتھ یہ کیا ہوا۔

اُسکی آہ نے بہت جلد اپنا اثر دکھایا۔ اُسے سنیل دت کے ساتھ سسپنس تھرلر فلم ''پوسٹ بکس 999'' میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس فلم کا ہدایت کار رویندر دوے تھا۔ موسیقار کلیان جی آنند جی۔ اس کے گانے کافی مقبول ہوئے تھے۔ ہیمنت کمار اور لتا منگیشکر کی آواز میں یہ دوگانا ''نیند نہ مجھ کو آئے'' کل بھی جتنا مقبول تھا آج بھی اُتنا ہی مقبول ہے۔ فلم 1958 میں ریلیز ہوئی۔

اسکے بعد اُسے شکتی سامنت کی فلم ''چائنا ٹاؤن'' میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس فلم میں اُسکا ساتھی کلاکار شمی کپور تھا۔ شمی کپور شہرت پا چکا تھا۔ وہ بھی کشور کمار کی طرح زندہ دل انسان تھا۔ اس فلم کا فلمساز اور ہدایت کار شکتی سامنت ہی تھا۔ موسیقار روی تھا۔ اس فلم کے گانوں نے خوب دھوم مچائی، خاص کر محمد رفیع کے اس گانے نے ''بار بار دیکھو ہزار بار دیکھو'۔ فلم نے زبردست کامیابی حاصل کی۔

کشور کمار اور مدھو بالا کے حوالے سے اُس نے اپنے ایک انٹرویو کے دوران ایک قصہ سنایا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب وہ محض پندرہ سال کی تھی۔ اُسے مشہور عکس کار فلی مستری کی فلم ''ارمان'' میں ایک چھوٹا سا رول کرنے کو موقع ملا تھا جس میں ایک گانا اور دو سین تھے۔ اس فلم کی ہیروئن مدھو بالا تھی جو کہ اُس وقت کی بہت بڑی ہیروئن تھی اور ہیرو دیو آنند تھا۔ اُسے ایک گانے کے دوران بھاگ کے آنا تھا اور کیمرہ کے سامنے تالی بجا کر نکل جانا تھا۔ مدھو بالا کیمرے کے پاس ہی کرسی لگا کر بیٹھی تھی۔ مدھو بالا کو دیکھ کر شکیلہ گھبرا رہی تھی۔ وہ جب بھی کیمرہ کے قریب پہنچ جاتی تھی تو مدھو بالا کو دیکھ کر بدحواس ہو جاتی تھی۔ مدھو بالا ہر ری ٹیک پر اُسکا مذاق اُڑایا کرتی تھی۔ اُسکی حالت یہ ہو گئی کہ کیمرہ کے پاس پہنچتے ہی وہ تالی بجانا تک بھول گئی۔ وہ فلم چھوڑ کر جانا چاہتی تھی۔ وہ اتنی دل برداشتہ ہو چکی تھی کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی تھی اور فلموں میں کام کرنے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توبہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ اُسکی مدھو بالا کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔ اُسکے بعد دونوں نے کسی بھی فلم میں ایک ساتھ کام نہیں کیا۔

مدھو بالا نے کشور کمار کے ساتھ شادی کر لی۔ ایک دن شکیلہ کو مدھو بالا نے فون کیا۔ فون پر اُس نے اُسے فوراً ملنے کے لئے کہا مگر شرط یہ رکھی کہ وہ اکیلی آئے کسی کو بھی اپنے ساتھ لے کے نہ آئے۔ اُسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اُسکے گھر میں کسی کا داخلہ نہیں ہے۔ اُسنے اُس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ ابھی تک وہ ذلت اور بے عزتی نہیں بھولی تھی جو فلم ''ارمان'' کی شوٹنگ کے دوران مدھو بالا کے ہاتھوں اُسکی ہوئی تھی۔ مدھو بالا کا جو پیر بابا تھا، شکیلہ بھی اُسی کی مرید تھی۔ جب مدھو بالا کو لگا کہ شکیلہ ایسے نہیں آئے گی تو اُسنے پیر بابا سے رجوع کیا۔ بقول شکیلہ پیر بابا بڑا ذی عزت آدمی تھا۔ اُسنے شکیلہ کو پیغام بھیجا کہ وہ جا کر مدھو بالا سے مل کر آئے۔ شکیلہ پیر بابا کے کہنے پر اُس سے ملنے چلی گئی۔

پیر بابا کے کہنے پر جب شکیلہ مدھو بالا کے گھر پہنچی تو گیٹ پار کرتے ہی اُس نے دیکھا کہ کوئی اوپری منزل کے کواڑ سے جھانک رہا تھا۔ یہ اور کوئی نہیں بلکہ مدھو بالا تھی۔ اُس نے شکیلہ سے پوچھا کہ کیا وہ اکیلی آئی ہے تو اُس نے ہاں میں جواب دیا۔ مدھو بالا نے کہا اوپر آ جاؤ۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی تو اُس نے دیکھا کہ مدھو بالا اوپر کھڑی تھی۔ وہ جب قریب پہنچی تو اُسے دھکا سا لگا۔ مدھو بالا سفید لباس میں ملبوس تھی۔ اُسکے چہرے پر کوئی میک اپ نہیں تھا۔ اُس کا چہرہ اُس کے کپڑے کی ہی طرح لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس چہرے پر سپیدی پھری گئی ہو۔ جس مدھو بالا کو اُس نے سیٹ پر دیکھا تھا وہ تو حسن کی دیوی تھی جس کے کروڑوں لوگ دیوانے تھے وہی عورت آج اُسے ایک سفید سنگ مرمر کے بت کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ اُسکا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے کمرے میں لے گئی اور دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ مدھو بالا اُس دن بڑی بیمار اور پریشان لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اُسکا ہاتھ تھام کر اُس سے بولی کہ وحیدہ رحمان اُسکی بہت قریبی سہیلی ہے۔ وہ جا کر اپنی سہیلی سے کہے کہ وہ اُسکے شوہر کشور کمار کا پیچھا کرنا چھوڑ دے اور آگے کوئی بھی فلم اُس کے ساتھ سائن نہ کرے۔ شکیلہ یہ بات سن کر بھونچکی رہ گئی۔ اُس نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ مدھو بالا جیسی عورت اُسے وحیدہ کی برائی کرنے کے لئے بلائے گی۔ اُسے یہ بات سن کے بڑا دکھ ہوا۔ اُس نے مدھو بالا سے کہا کہ وحیدہ اتنی گری ہوئی عورت نہیں کہ وہ اس طرح کی حرکت کرے گی۔ اُسنے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وحیدہ کو کشور کمار میں کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ اُسنے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وحیدہ رحمان بے شک اُسکی قریبی سہیلی ہے مگر اُس کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اُسکی ذاتی زندگی میں دخل دے۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔

اُس نے چاہا کہ وہ وحیدہ کو ساری بات بتا دے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی وحیدہ نے اُس سے کہا کہ مدھو بالا نے اُسے بھی فون کیا تھا اور وہی ساری باتیں دہرائی تھیں۔ وہ کوئی جواب نہیں دے پائی۔ اسکے بعد اُس نے شکیلہ کو فون کر کے دوبارہ ملنے کے لئے کہا۔ اُس نے اُس سے ملنے سے انکار کر دیا اور وہ بنگلور چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر اُسے یہ خبر ملی کہ مدھو بالا کا انتقال ہو گیا۔ شکیلہ کو یہ خبر سن کر زبردست دھچکا لگا۔ وہ اس بات کے لئے افسوس کرنے لگی کہ اُس نے مدھو بالا سے ملنے سے انکار کیوں کیا۔ کیا پتا وہ اُس سے کیا کہنے والی تھی۔

شکیلہ نے اپنے فلمی کیریئر میں پچاس سے زیادہ فلمیں کیں۔ کچھ فلمیں بڑے ہدایت کاروں کے ساتھ کیں تو کچھ سی گریڈ فلمیں تھیں۔ اُسنے راج کپور، اشوک کمار اور پران کے ساتھ بھی کام کیا۔ دادا منی اشوک کمار اور پران کے ساتھ کام کرتے وقت وہ سیٹ چھوڑ کے نہیں جاتی تھی بلکہ سیٹ پر ہی بیٹھ جاتی تھی اور بڑے غور سے ان دونوں باصلاحیت کلاکاروں کو کام کرتے دیکھتی تھی۔ اُسکا ماننا تھا کہ اشوک کمار بہت ہی ذہین اور باکمال اداکار تھا۔ اسی طرح کے خیالات پران کے بارے میں بھی تھے۔ وہ جب بھی پران سے ملتی تھی اُس میں وہی گرمجوشی پاتی

تھی۔دلیپ کمار کے ساتھ اُسنے کوئی فلم نہیں کی مگر جب بھی وہ اُس سے ملی دلیپ صاحب کسی بھی ہیروئن کو کسی ملکہ کی طرح استقبال کرتے تھے۔یہ اُن ہی کا انداز تھا۔وہ اپنے مدمقابل بیٹھے شخص کو یہ احساس دلاتے تھے کہ وہ اُنکے لئے کتنا انمول ہے۔

شکیلہ نے ہر طرح کی فلمیں کیں۔دیوآنند سے لے کے اجیت تک اُس نے ہر چھوٹے بڑے کلاکار کے ساتھ کام کیا۔اُسکی فلموں کی فہرست خاصی لمبی ہے۔ چند فلموں کے نام میں یہاں گنواتا ہوں۔''گیسٹ ہاؤس''،''کالی ٹوپی لال رومال''،''برات''،''شریمان ستیہ وادی''،''ریشمی رومال''،''نقلی نواب''،''ٹاور ہاؤس''،''ملزم'' اور 1963 کی اُس کی آخری فلم ''اُستادوں کے اُستاد''۔

وہ جب مقبولیت کی سیڑھیاں تیزی سے چڑھتی جارہی تھی تو اُسنے فلمی دنیا کو تیاگنے کا ایک انوکھا فیصلہ لیا۔اُسنے فلموں کی چکاچوند کو الوداع کہہ کے پہلی شادی ایک انگریز کے ساتھ کی جس کا نام جان ببر تھا۔وہ اُسکے ساتھ جرمنی چلی گئی۔یہ شادی زیادہ دنوں تک نہیں چلی۔وہ اپنے شوہر سے الگ ہوکر جرمنی سے واپس لوٹ کر بمبئی آگئی۔ یہاں پر اُسکی ملاقات افغانستان کے کونسلیٹ جنرل سے ہوئی جسکا نام ابراہیم تھا۔دونوں نے شادی کرلی۔ان کے یہاں ایک بیٹی نے جنم لیا جس کا نام اُنہوں نے مہناز رکھا اور وہ لنڈن چلے گئے۔1991ء میں شکیلہ کے سر پر اُسوقت بجلی گری جب اُسکی بیٹی نے ٹیرس سے کود کر خودکشی کرلی۔اُسکے سر پر دکھوں کا آسمان ٹوٹ پڑا۔وہ اس صدمے سے باہر آنے کے لئے واپس وطن لوٹ آئی۔

وہ بمبئی میں اکیلی رہ رہی تھی۔نندہ کا انتقال ہو چکا تھا۔وحیدہ بنگلور میں رہتی تھی۔یہاں اُسکی بہن اور اُسکے بچے اُسکی دیکھ بھال کرتے تھے۔وہ اپنا زیادہ تر وقت اکیلے گزارتی تھی۔وہ اپنے گھر سے بہت کم باہر آتی تھی۔اُسکے بھانجے بھانجیاں اُس سے کبھی کبھار ملنے آجایا کرتی تھیں۔وہ بہت دنوں سے بیمار رہنے لگی تھی۔اُسے کئی فلموں اور ٹیلی ویژن سیریلیز میں کام کرنے کی پیشکش ہوئی مگر اُسنے سبھی پیشکشیں ٹھکرا دیں۔وہ اپنی خوبصورت شبیہہ کو اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں بنائے رکھنا چاہتی تھی۔اُسنے فلمی دنیا میں صرف دس سال گزارے۔اس مختصر عرصے میں اُسنے پچاس کے قریب فلموں میں کام کیا۔

شکیلہ پر دل کا دورہ پڑ گیا۔اُسکے بھانجے ناصر خان نے جو کہ جانی واکر کا بیٹا ہے اُسے اسپتال میں بھرتی کر کے آیا۔وہ دو دن اسپتال میں رہی۔ تیسرے دن یہ دورہ جان لیوا ثابت ہوا اور شکیلہ 82 سال کی عمر میں 20 ستمبر 2017 کو اس جہاں فانی کو الوداع کہہ گئی۔

فیچر آپریٹنگ سسٹم

ایپل نے حال ہی میں متعارف کردہ فیچر آپریٹنگ سسٹم ورژن آئی۔او۔ایس 13، آئی پیڈ او۔ایس۔13، میک او۔ایس۔کیٹلینا، واچ او۔ایس۔6 اور ٹی۔وی۔او۔ایس 13 متعارف کرایا تھا جس میں تھرڈ پارٹی ایپلی کیشن اور ویب سائٹس استعمال کرتے وقت صارفین کو زیادہ سے زیادہ پرایویسی دینے کی کوشش کی گئی۔اس فیچر کے ذریعہ صارفین اپنے ای میل کی بجائے ایپل کی آئی ڈی سے لاگ اِن ہوتے ہیں۔اس فیچر کا نتیجہ یہ نکلا کہ صارفین تھرڈ پارٹی ایپس میں خصوصی سیکورٹی کے ساتھ لاگ ہوتے تھے چاہے وہ ایپل یوزر ہوں یا نہ ہوں۔تاہم اس میں خرابی پیدا ہوگئی جس کی نشان دہی اتر پردیش کی ٹیکنیکل یونیورسٹی میں بی ٹیک الیکٹرانکس اور کیمونیکیشن انجینئرنگ کے طالب علم بھاوک جین نے نشان دہی کی جسے تسلیم کرتے ہوئے ایپل نے نہ صرف مستقبل میں اپنی پراڈکٹ کی خرابی دور کرنے کی نشان دہی کی بلکہ بھاوک جین کو انعام کے طور پر ایک لاکھ ڈالر پیش کیے۔یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ بھاوک جین گذشتہ تین سال سے مختلف ایپس کی خامیاں تلاش کر کے فیس بک، گوگل، گریب، اسٹیک اور فلورین جیسی بڑی کمپنیوں سے انعام وصول کر چکے ہیں۔

☆

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

برادرِ محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

آپ کا بغیر کسی ذاتی شناسائی اور ربط کے اردو کے ایک معمولی سے طالب علم کی طرف متوجہ ہونا اور اسے یہ اعزاز دینا منجانب اللہ ہے میں آپ کی اس نظرِ التفات کے لئے شکر گذار ہوں میرے بڑوں نے اور میرے دوستوں نے جو اپنے قیمتی الفاظ میرے لئے خرچ کئے ہیں یہ میرے لئے افتخار بھی ہے اور میرا سرمایہ بھی! میں ہمیشہ کہتا ہوں مجھے میرے بڑوں کی شفقت، دوستوں کی محبت اور چھوٹوں کی عزت میسر ہے اور شاید یہی میری شناخت ہے۔ میرے لیے یہ امر بھی باعث اعزاز ہے کہ مشہور قلم کار ڈاکٹر الف ناظم نے میری شاعری اور ذاتی زندگی پر دنیا کے تقریباً ایک سو سے زائد صاحبانِ علم وفن کے مضامین یکجا کر کے ’’ذرہ نوازی‘‘ کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی ہے جو انشاء اللہ عنقریب منظرِ عام پر آئے گی۔ مدیرِ چہارسو کی بے پناہ اور مخلصانہ محبت کے زیرِ اثر چند اشعار سرزد ہوئے ہیں جو میں بصد عاجزی وانکسار قارئین چہارسو کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔

قرار کیوں نہیں مجھ کو قرار ہوتے ہوئے
یہ کیسا غم ہے خوشی بے شمار ہوتے ہوئے
وہ میرے بھیجے ہوئے پھول اسکے جوڑے میں
میں خود کو دیکھ رہا تھا بہار ہوتے ہوئے
ذرا سا غور کیا تھا خود اپنی سانسوں پر
کچھ اختیار نہیں اختیار ہوتے ہوئے
نہ کوئی سمت نہ منزل میں اک بگولہ ہوں
وہ مجھ کو چھوڑ گیا تھا غبار ہوتے ہوئے
مرے بغیر کبھی گن کے دیکھ لے خود کو
تو کم پڑے گا بہت بے شمار ہوتے ہوئے
تمہاری جیت میں شامل ہوں میں برابر کا
میں خوش ہوا تھا بہت اپنی ہار ہوتے ہوئے
تمہیں تو خوف نہیں کیسے دیندار ہو تم
خدا سے ڈرتا ہوں میں دنیادار ہوتے ہوئے
یہ کتنے سخت ہیں پروردگار کے بندے
وہ کتنا نرم ہے پروردگار ہوتے ہوئے

ڈاکٹر نواز دیوبندی (سہارنپور)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

ابھی ابھی وھاٹس ایپ پر رینو جی نے تازہ شمارہ بھیجا۔ اس مشکل ترین وقت میں بھی آپ نے شمارہ شائع کیا ہے جو حیران کن بھی ہے اور قابل تعریف بھی۔ سب لوگوں کے لئے زنداں کی تاریکیوں میں تازہ ہوا، قید سے رہائی کا احساس اور روحانی غذا آپ نے مہیا کی ہے، لاکھوں دعائیں۔ اس کارنامے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اذیت کے عالم میں یہ قیمتی تحفہ بہت بڑا کارِ خیر ہے۔

آپ کو بہت مبارک باد کہ چہارسو کی وجہ سے اتنا بہترین کلام پڑھنے کو ملا کیا کہوں۔۔۔ ہر شعر لاجواب ہے۔ غزلیں بہت کم کم ہوا کرتی ہیں جن کے سب اشعار بے چین کر دیں، جھنجھوڑ دیں اور دل میں بیٹھ جائیں ہمیشہ کے لئے۔ ڈاکٹر صاحب کا کلام ایسا ہی پر اثر ہے۔ بہت اعلیٰ۔ ہمیشہ یاد رہ جانے والا۔

پروین شیر (نیویارک)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

’’چہارسو‘‘ شمارہ مئی جون ۲۰۲۰ء ایک بھر پور ادبی اور عملی زندگی گزارنے والی شخصیت ڈاکٹر نواز دیوبندی سے منسوب کیا گیا ہے۔ اردو ادب میں خدمات اور شاعری میں ایوارڈ یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا امتیازی وصف ان کا وہ کارنامہ ہے جس کے تحت انہوں نے اپنے ملک کے مختلف شہروں میں لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے تعلیمی اور تربیتی ادارے قائم کر رکھے ہیں جہاں لاتعداد نوجوان علم و ہنر کی تربیت حاصل کر کے باعزت روزگار کے ذریعہ اپنی اور اپنے خاندانوں کی کفالت کر رہے ہیں۔ وہ ہمہ وقت مختلف تعمیری سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں اخلاقی اور مذہبی اقدار نمایاں ہوتی ہیں۔

قارئین ’’چہارسو‘‘ کو ایسے گوہر نایاب کی شخصی اور عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ’’براہِ راست‘‘ میں روشناس کرایا جانا قابلِ تحسین ہے۔ اس عنوان کے تحت ادبی شخصیت سے آپ کا مکالمہ مشہور شاعر اور مقبول ادیب ناصر علی سید کے الفاظ میں (جو ان کے ۲۱۔ مئی ۲۰۲۰ء کے روزنامہ ’’آج‘‘ میں ’’چہارسو‘‘ میں حوالہ سے شائع ہوئی) ’’ایک معتبر ادبی دستاویز اور بہت عمدہ، دلکش، پڑھنے کے لائق اور خاصے کی چیز ہوتا ہے۔‘‘

شمارہ میں اچھے افسانے شائع کیے گئے ہیں۔ شموئل احمد نے ’’ظلم کدے میں‘‘ کے عنوان سے ایک تحریر رقم کی ہے۔ انہوں نے ماضی کے آئینے میں جھانک کر اور غالباً موجودہ صورت حال کے زیر اثر اپنے تصورات اور خیالات کو ایک منظر نامہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔

رضیہ اسماعیل کا افسانہ ’’چیچہ وطنی‘‘ قاری کے دل کی دھڑکن کو تیز سے تیز تر کرتی جاتی ہے اور وہ سب کچھ اپنے سامنے وقوع پذیر ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایک ٹریجڈی جو دیر تک ذہن پر اثر انداز رہتی ہے۔

مشتاق اعظمی نے ’’اینڈ تھنگ ایلس‘‘ کے عنوان سے ایک سبق آموز کہانی دلچسپ انداز میں رقم کی ہے جس میں یہ پیغام پنہاں ہے کہ وقتی اور ظاہری

جذباتی ماحول کے تحت کوئی اہم فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ بچار کر کے ہی قدم اٹھانا چاہیے۔

ڈاکٹر فیروز عالم کا طبی معاملات پر مفید معلوماتی مضامین کا سلسلہ جو سادہ اور عام فہم اصطلاحات کی صورت میں قارئین کی رہنمائی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے قابلِ تحسین ادبی خدمات کے زمرے میں آتا ہے۔اس بار ڈاکٹر صاحب نے کرونا وائرس جو ایک خوفناک اور تباہ کن عالمی وبا کا باعث بن چکا ہے پر سیر حاصل مضمون لکھا ہے۔مضمون میں بتایا گیا ہے کہ کرونا وائرس کے علاج یا بچاؤ کے لیے تا حال نہ تو کوئی دوا دستیاب ہے اور نہ کوئی ویکسین۔ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان اپنے جسمانی مدافعتی نظام (Body Immone System) کو مضبوط بنانے پر بھرپور توجہ دے اور تمام احتیاط تدابیر پر من وعن عمل کرے۔

''دلتوں کی اندھیری رات'' میں ندیم راعی نے ہندوستان میں دلت طبقہ کے ساتھ جو غیر انسانی، غیر اخلاقی اور انتہائی تکلیف دہ سلوک کیا جارہا ہے اس کا منظر نامہ پیش کیا ہے جسے پڑھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔افسوس کی بات ہے کہ اس ظالمانہ اندھیری رات کے خاتمہ کے دور دور تک کوئی نشانات نظر نہیں آتے۔

''اک گمشدہ شناخت'' میں رؤف خیر صاحب نے انل ٹھکر پر تفصیل کے ساتھ عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔

شاعر میں اس بار زیادہ تر کرونا وائرس سے متعلق کلام لکھا گیا ہے۔ جو کافی دلچسپ ہے۔ پروین شیر، علی ارمان، سیمیں کرن، سبیلہ انعام صدیقی، تصور اقبال، شگفتہ نازلی، یوگیندر بہل تشنہ، پریم ناتم بسمل، عبداللہ جاوید، انیس الرحمان، افتخار حیدر، نثار ترابی، یونس شرر، رومانہ رومی، آصف ثاقب، اقبال عظیم اور رینو بہل کا ترجمہ شدہ کلام خصوصی طور پر قابلِ تعریف ہے۔

موجودہ وبائی صورت حال کے تناظر میں گو کہ شمارہ ترتیب دے کر منتظر قارئین تک پہنچانا آسان کام نہیں تھا لیکن آپ نے اپنی لگن جہدِ مسلسل کی وجہ سے اس میں وقفہ نہیں آنے دیا جس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کا مارچ/اپریل ۲۰۲۰ء کا شمارہ ملا جس پر خدا کا شکر ادا کیا کہ ڈاک کی کسمپرسی کے عالم میں یہ وصولیابی بھی غنیمت ہے۔اس شمارے کا قرطاس اعزاز آپ نے ہماری دیرینہ دوست، شناسا، ادیبہ کے نام نذر کیا ہے۔خوشی اور بہت زیادہ خوشی کی بات ہے محترمہ سے نہ صرف میرے ذاتی مراسم ہیں بلکہ اُن کا خلوص ہمیشہ میرے لیے تقویت کا باعث رہا۔ براہِ راست میں اُن کو جان کر بہت کچھ وہ سب معلوم ہو گیا جس سے میں اب تک لاعلم رہا۔ان کی صاحبزادی بھی اب نہ صرف ایک شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں بلکہ سفر نامہ نگاری میں بھی یکتا و منفرد ہیں۔ہیڈ کوارٹر بہت پسند آیا۔خدا انہیں ایک طویل عمر عطا فرمائے۔آمین۔

''بشرطِ استواری'' آپ کے اسٹائل میں لکھا ہوا افسانہ جسے پسند نہ کرنا جرم ہوگا۔

دیپک کنول جی میرے بہت پرانے دوست ہیں ان کی دو کتابوں پر میں نے تبصرے بھی کیے تھے پھر انہوں نے میری درخواست پر اپنی ''دلیپ کمار'' پر لکھی کتاب مجھے بھارت سے اعزازی طور پر بھی بھجوائی تھی۔اب اُن کے خط میں اُن کی درد بھری شکایت میرے حوالے سے ہے۔ بھائی دیپک کنول! میں آپ کی تحریروں سے کبھی نہیں ''اوبا'' یہ ''احسان'' بھی گلزار جاوید صاحب کا ہے کہ میرا ایک خط جو آپ کے کسی مضمون پر میں نے آپ کے بھول کی نشاندہی کی تھی انہوں نے شائع نہیں فرمایا۔ مجھے یقین ہے وہ خط اگر آپ کی نظر سے گزرتا تو شاید آپ کو بھی اپنی بھول کا احساس بروقت ہو جاتا۔ دیپک صاحب سرحد پار بسنے والے آپ واحد غیر مسلم ہیں جنہیں میں نے ہمیشہ چاہا ہے، چاہتا رہوں گا۔ میرے لائق کبھی کوئی خدمت ہو تو ضرور حکم کیجیے۔

غالب عرفان (کراچی)

محترم گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ ''وبا کے دنوں میں موسمِ شفا'' محسوس ہوا۔ خطوط کے بعد ''براہِ راست'' کے مکالمہ سے محظوظ ہوا۔آپ کے سوالات اور محترمہ عذرا اصغر کے جوابات نے خوب لطف دیا۔ اگر محترمہ ہجرت کے دنوں کو ذرا تفصیل سے بیان کرتیں تو مزید اچھا ہوتا۔عذرا صغر کی افسانہ اور ناول نگاری کے فکر و فن پر جن اہل علم و فن نے تحریر کیا ہے وہ اپنے عہد ہی کے نہیں بلکہ اردو ادب کے بڑے اور باوقار نام ہیں۔علامتی افسانے کے متعلق محترمہ نے ایک جگہ کہا کہ:

''تجرید کے دور میں بھی میں اپنے راستے پر ہی چلتی رہی ہوں'' ص۔۱۰

صفحہ نمبر ۱۱ پر فرمایا:

''میرے کچھ افسانے علامتی بھی ہیں جیسے ''گدلا سمندر''، ''کفن کے تھیلے''

ڈاکٹر انور سدید، سید مشکور حسین یاد، محترمہ الطاف فاطمہ، ڈاکٹر صابر لودھی کے مضامین سے جہاں محترمہ عذرا اصغر کے فکر و فن کی تفہیم ہوتی ہے وہاں اُن کے لیے اعزاز بھی ہے ان احباب سے میرے بھی مراسم تھے ملاقاتیں تھیں بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔محترمہ نے ناول، افسانے، مضامین کے علاوہ بہت اچھے افسانچے بھی تحریر کیے ہیں۔ محترمہ اور شبہ طراز کو بھی مبارک ہو گوشہ لاجواب ہے۔

غالب عرفان، آصف ثاقب، واصف حسین واصف، رضیہ اسماعیل، اشرف جاوید، شہلا نقوی، شہباز راجا، جنید آزر، شاداب صدیقی اور تصور اقبال کی غزلوں کے اشعار ایک بانکپن، سادگیِ بیان اور حقیقت نگاری کی جھلکیاں ہیں۔ ڈاکٹر ریاض احمد اور ہارون الرشید کی غزل تصوف اور دنیا کی بے ثباتی کی تصویر ہے۔

تری جب تک اطاعت کر رہا تھا

تو ہی میری حفاظت کر رہا تھا
(ہارون الرشید)

تصویر بن رہی ہے عمل کی بھی دم بدم
سب کو دکھائی جائے گی محشر میں ایک بار
(ڈاکٹر ریاض احمد)

قرۃ العین طاہرہ کی فارسی غزل کا ترجمہ (تابش دہلوی) خوب تلاش کیا ہے۔فیصل عظیم کی نظم ''رسی کا پل'' کا عنوان ہی معاشرے میں انسان کی بے قدری کو ظاہر کر رہا ہے۔فیصل نظم کو آغاز سے انجام تک بڑے توازن سے لے کر چلتے ہیں۔پروین شیر کی نظم ''نیم منہدم مکاں'' ایک اچھی نیم علامتی تخلیق ہے۔نظم کی معنویت آخر تک برقرار رہتی ہے۔''یہ جبر کب تک ہوتا رہے گا'' یہ مصرع کتنے ہی سوال چھوڑے جا رہا ہے۔محمود شام صاحب کی نظمیں بھی متوجہ کرتی ہیں۔ابنِ انشاء کی آخری نظم ''عمر کی نقدی'' کی قرأت نے خوب لطف دیا۔

ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کی زندگی میں پڑھنا بہت سنجیدہ معاملہ ہے۔ان کی تحریروں کے مطالعے سے ان کا ادب،فنون،نفسیات اور طبعیات کے گہرے مطالعے کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''گھروندے انا کے'' افسانہ مضبوط بنت کے ساتھ محبت اور انا کے دائرے میں گردش کرتا نظر آتا ہے۔شہناز خانم عابدی کا افسانہ ''ہم دیکھیں گے'' ہمارے سماج میں جاگیردارانہ اور زمین دارانہ سوچ رکھنے والے اپنی گھٹیا سوچ اور جائیداد کو بچانے کے لیے لڑکی کا قرآن پاک،کانی (لکڑی) یا کپڑے کے گڈے سے نکاح کر کے اُس پر زندگی کے روشن دروازے بند کر دیتے ہیں یہ رسم ہمارے معاشرے پر بدنما داغ ہے۔یہی کچھ افسانے میں ہے محترمہ سے ایک دو جگہ چوک ہو گئی مثلاً:

''یہ کمپیوٹر انجینئرنگ کر رہا تھا حیدر آباد جا کر یہ اس کا دوسرا سال تھا'' (ص۔۴۹) جبکہ حیدر آباد میں انجینئرنگ یونیورسٹی نہیں ہے پھر اسی صفحے پر ''اُس کا امریکہ میں ایڈمیشن ہو گیا تھا''

عامر بیگ نے بڑی چالاکی سے ''گرین کارڈ'' کو افسانے بنانے کی کوشش کی ہے۔''جینٹل مین ڈرنکس'' جدید سوچ پر طنز ہے پیش کش اچھی ہے۔

گلزار جاوید صاحب آپ بصورت افسانہ زندگی کا ایسا رخ دکھاتے ہیں کہ قاری دیر تک انتخابِ موضوع اور طرزِ تحریر میں گم رہتا ہے۔''بشرطِ استواری'' معاشرے کی وہ کہانی ہے جو عام سی بات ہونی چاہیے تھی مگر اب خاص ہو گئی ہے اور ایسے کردار تلاش کے باوجود نہیں ملتے۔آپ نے فنی مہارت سے ایک فرض شناس سرکاری ملازم کی مدتِ ملازمت ختم ہونے کی تقریب میں مختلف کرداروں اور مکالموں سے کتنے ہی چہروں سے نقاب اتارے ہیں۔کچھ فقروں میں تو نیک و بد کی پوری داستان موجود ہے۔مثلاً ''جو ملازمت کے آغاز میں جس گھر میں قیام رکھتا تھا آج بھی اُسی گھر میں مقیم ہے۔'' (ص۔۱۴۷) ایک جگہ مشینی کتابت نے اپنا کمال دکھایا ہے معذرت کے ساتھ ذرا غور کیجیے۔

''آپ ترجماً رشوت،ملاوٹ،اقربا پروری،دھوکہ دہی،وعدہ خلافی اور کمزور اور نادار کے حقوق کی نگہبانی کرتے رہے۔'' (ص۔۱۴۷)

ملکیت سنگھ مچھانا کا افسانہ ''پاکستانی'' پڑھ کر ایسا لگا کہ خواب میں خوش گوار احساس ہو رہا ہے اور زبان سے بے اختیار دعا نکلی کہ مصنف کے لفظ پورے ہوں اور اہلِ پاکستان پوری دنیا کے لیے ایسے مخلص مہمان نواز اور بااعتبار ہو جائیں۔یہ تحریر سوانح حیات کا باب معلوم ہوتی ہے۔حسن منظر صاحب کا مضمون ''خاص ملک،خاص لوگ،خاص علاج'' موزے ڈونگ (ماورے تنگ) جدید چین کے بانی اور موجودہ روس کے پہلے صدر بورس یلتسن کی بیماری،اپنے ملک میں علاج پھر ضرورت کے تحت بیرونی ماہر معالج کو اپنے ملک میں بلانا، تشخیص اور علاج وغیرہ،اتنے بڑے راہ نما نہ علاج کی غرض سے ملک سے باہر گئے نہ قوم کا پیسہ برباد کیا۔ملک کے اشرافیہ کو آئینہ دکھایا ہے۔دیپک کنول اس بار ذرا سست نظر آئے۔طلعت محمود کی داستانِ حیات میں اُن کا رنگ پھیکا پھیکا رہا۔رینو بہل کی ''مہندر پرتاپ چاند'' کی شخصیت پر محبت اور عقیدت کی خوشبو میں بسی خوب صورت تحریر ہے۔حمید شاہد صاحب نے ''تنقید کا کردار'' میں بے باکی اور ادبی سچائی کے ساتھ کچھ نئی مفید باتیں کی ہیں۔

نوید سروش (میر پور خاص)

گلزار صاحب،تسلیمات۔

چہار سو کی پی ڈی ایف ملی۔اس عنایت کا شکریہ۔مشکور ہوں کہ آپ نے میری کہانی نمایاں طور پر شائع کر کے ایک طرح سے مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خراجِ عقیدت پیش کر دیا۔آج کے تالہ بندی کے دور میں بھی چہار سو اپنی روایت نبھا رہا ہے یہ بڑی بات ہے۔

ڈاکٹر دیو بندی کا گوشہ پسند آیا ڈاکٹر صاحب کے شعری نقوش واضح ہوئے ہیں،کچھ نئی باتیں بھی معلوم ہوئیں۔مسلم فنڈ ٹرسٹ کے متعلق جانکاری ملی۔ڈاکٹر صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے کئی گوشے منور ہوئے۔افسانے سبھی پسند آئے۔شعری حصہ بھی خوب تر ہے۔رس رابطے تو ہمیشہ کی مانند ہوتے ہی چٹک ہیں۔

شموئل احمد (پٹنہ)

برادرم گلزار جاوید،السلام علیکم۔

اللہ تعالیٰ کے حضور آپ کی،اپنی،،اور تمام عالمِ انسانیت کی صحت و عافیت کے لیے دعا گو ہوں۔کرونا کی وبا نے پوری دنیا کا سکون اور نظامِ زندگی درہم برہم کر دیا ہے،اور اچانک فیس بک پر یا میڈیا پر جب کسی کی وفات کی خبر آتی ہے تو جی دہل جاتا ہے۔

ابھی کچھ دن قبل چہار سُو کی اشاعت کی خبر واٹس ایپ پر دیکھی، دوسرے دن اسے ڈاؤن لوڈ کرنے کی کوشش کی،ناکام رہا تو ایک مرتبہ پھر آپ سے رجوع کیا اور آپ نے لنک دوبارہ بھیجا تو کہیں میں چہار سو کا نواز دیو بندی نمبر دیکھ سکا۔چونکہ میں کمپیوٹر کی سکرین پر پڑھنے کا عادی نہیں ہوں اور پورا شمارہ

پرنٹ کرنا بھی مشکل تھا اس لیے صرف چنیدہ صفحات کاغذ پر منتقل کر سکا جن میں ''زہریلا انسان''، آصف فرخی کا افسانہ ''قرنطینہ''، غزلیں، رس رابطے اور کرونا وائرس کے موضوع پر ڈاکٹر فیروز عالم کا اہم مضمون شامل ہے، چنانچہ یوں سمجھیں کہ چہارسُو کے اس شمارے کے جزوی مطالعے کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔

سب سے پہلے تو انتہائی عمدہ افسانہ نگار، دنیا زاد کے مدیر اور بیشمار ادبی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنے والے ادیب جناب آصف فرخی کی وفات پر اظہارِ افسوس، جن کی وفات کی خبر تو کئی دن ہوئے مل گئی تھی، مگر جن کا غم اس شمارے میں شامل ان کا افسانہ 'قرنطینہ' پڑھ کر تازہ ہو گیا، ان کی اچانک وفات کی خبر پڑھ کر پہلے یہی خیال آیا کہ سببِ مرگ کرونا ہے، مگر بعد میں علم ہوا کہ وہ دل کے مریض تھے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ان کا جو افسانہ اس شمارے میں شائع ہوا ہے وہ بھی کرونا اور قرنطینہ کے بارے میں ہے اور اسے عمدہ ادبی اسلوب میں آصف فرخی جیسا ادیب ہی لکھ سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

''زہریلا انسان'' کی اب کتنی اور کیا تعریف کی جائے کہ ہر قسط میں کہانی اپنی دلچسپی کے مزید اونچے گراف پر پہنچ جاتی ہے اور اختتامیہ جملوں میں اگلی قسط میں ایک نیا پہلو اور نیا موڑ سامنے آنے کی سمت نمائی ہوتی ہے۔ اب اگلی قسط میں پتہ چلے گا کہ یورپی عورت ڈالمیا سے مناسہ دیوی کا کیا تعلق ہے۔ فی الحال تو مجھ سمیت قارئین حیرت اور تجسس میں رہنے پر مجبور ہیں۔

ڈاکٹر فیروز عالم کا مضمون کرونا وائرس کے بارے میں بے حد معلوماتی ہے، اب تک میں نے انٹرنیٹ پر اور پریس میں اس وائرس کے بارے میں جتنا کچھ پڑھا ہے ان کے مقابلے میں یہ مضمون زیادہ اہم تھا کہ اتنی تفصیل کے ساتھ اس وائرس کے بارے میں اتنا کچھ کہیں نہیں ملا تھا۔ ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کی خودنوشت اور افسانوں کا فین تو میں تھا ہی، ان کے یہ طبی مضامین بھی کچھ کم مفید نہیں، اور میں ہر مضمون بڑی توجہ سے پڑھتا ہوں، انہوں نے اپنے مضمون میں بتایا کہ اس کی ویکسین تیار کرنے میں ڈیڑھ سے دو سال لگ سکتے ہیں، گویا تب تک ہم سب ریڈ ایریا میں مقیم رہیں گے۔ اس ویکسین کی تیاری میں عالمی سیاست اور بل گیٹس جیسے سرمایہ کار کی دلچسپی نے بھی بہت سے سوالات کھڑے کر دیے ہیں جن میں سے ایک یہ بات بھی سنی جا رہی ہے کہ اس ویکسین کے ذریعے انسانی جسم کے اندر ایک ''نینو چپ'' لگانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں جس سے ساری دنیا کے انسان ذہنی طور پر ایک مخصوص طاقت کے غلام بن جائیں گے۔ اللہ جانے حقیقت کیا ہے۔

خط کچھ طویل ہو رہا ہے اس لیے غزلوں کے کچھ اشعار پر، جن پر نشان لگایا ہوا تھا، تبصرہ چھوڑتا ہوں، اور صرف اتنا کہنے کے بعد خط کا اختتام کرتا ہوں کہ یہ شمارہ بھی مجموعی طور پر کرونائی ماحول کا ترجمان ہے، جس کی جھلک غزلوں میں بھی واضح ہے، خاص طور پر برادرم علی ارمان کی غزل تو حقیقتِ حال سے قریب ترین لگی، ان کے دو شعر لکھ کر اجازت:

ماتم یہ ہے کہ جرم ہے ماتم کی بھیڑ بھی
روتے ہیں سب اکیلے، عزا خانہ بند ہے
ارمان پھر رہی ہے کھلی موت شہر میں
اور زندگی کا نعرۂ مستانہ بند ہے

نسیم سحر (راولپنڈی)

محترم المقام گلزار صاحب، السلام علیکم۔

قرنطینہ کے اس دور میں کیسے ہیں آپ؟ پوچھنا محض رسمی تکمیل ہے حالانکہ ایسی کوئی قید و بند نہیں ہے۔ ہر کوئی اپنے اپنے گھروں اور خاندانوں میں محفوظ اور شاید زندگی میں پہلی بار (اس ترقی یافتہ دور میں) اپنے بال بچوں سے اتنے قریب ہیں۔ سورج اور چاند کی رفتار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دن وہی ہیں اور راتیں وہی۔ پھر بھی ہر شخص اپنی روح کے اندر قید اور آزاد فضا میں پرواز کے لیے بے چین ہے۔ میں خود سے ہزار بار سوال کرتی ہوں کہ آخر کیا چیز ہے جو بے چینی کا باعث ہے؟ جواب خود کو شرمندہ کر جاتا ہے۔

ایسے میں ''چہارسُو'' رحمت کی بوندوں کی طرح ہمدست تو نہیں بصر نواز ہوا۔ آپ کی احسان مند ہوں ساتھ ہی رینو بہل کی جو نہایت دیانت داری سے ترسیل کرتی ہیں۔ اس شمارے (مئی جون ۲۰۲۰ء) میں آپ نے میرا افسانہ ''واپسی'' چھاپ کر مجھے بے پناہ خوشیوں سے ہمکنار کیا۔ واقعی مایوسیوں کی لہر میں خوشی کی ایک لہر نصیب ہوئی۔ دل کو راحت اور سکون میسر آیا، خنکی کا احساس ہوا۔ میں آپ کی احسان مند ہوں، دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں ساتھ ہی دعا گو ہوں کہ خدا آپ کو عمرِ دراز اور صحت و سکونِ قلب سے سرفراز کرے۔ آمین۔

زیرِ نظر شمارے کیا ہے مخزنِ علم و حکمت اور راحتِ جاں ہے۔ سب سے پہلے میں نے حسبِ معمول آپ کا قرطاسِ اعزاز پڑھا۔ نواز دیوبندی کے بارے میں پڑھ کر احساس ہوا کہ آپ کیسے کیسے ہیروں کو چن کر ہمارے لیے پیش کرتے ہیں۔ آپ کے اندر علاقائی تعصب نام کو نہیں ہے۔ آپ ہرگز نہیں دیکھتے کہ یہ ہیرا کون سی سرزمین کی پیداوار ہے۔ اب آپ جیسے لوگ تو قال قال ہی ہیں وہ بھی بے غرض۔ شاید ہی کوئی ہو۔ اردو ادب کی ترقی و ترویج میں آپ کا وژن بے مثال ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔

شموئل احمد کا افسانہ ''ظلمت کدے میں'' دستنبو کے تناظر میں پڑھا تو محسوس ہوا شموئل احمد نے غالب کی کشمکشِ حیات کا احاطہ کیا تو کوئی نئی بات نہیں کی کیونکہ اس سے پہلے ایسی کئی تحریریں موجود ہیں مگر دلی تاراخ ہونے کے بعد جو قرطبیہ جیسے روز و شب کا ذکر کر کے شموئل صاحب نے ثابت کر دیا کہ ایک بڑا فنکار اپنے عہد کو کس طرح جیتا ہے۔ بہت اچھا لگا۔ رضیہ اسماعیل کا ''چیچہ وطنی'' پڑھ کر ایک نئی تہذیب میں گھوم پھرنے کا موقع ملا مگر ''چیچہ وطنی'' ایکسپریشن سمجھ

میں نہیں آیا۔ڈرائیورمیت لے جانے پوچھتاہے کہ کہاں جاناہے تو جواب ملتاہے ''چیچہ وطنی'' یہ اُٹ پٹالگا کیوں کہ جب ڈرائیورکو بلایا جاتاہے تب ہی معاملہ طے ہو جاتا ہے کہ کہاں؟ کب؟ کتنی اجرت وغیرہ۔ ہاں جناب آصف فرخی کا ''قرطبیہ'' دل کو چھوگیا۔یہ غالباً موصوف کی آخری تحریر ہے۔ایک مشہور ڈاکٹر، دانشوراورعظیم ہستی کے قلم سے نکلے کرب کو پڑھ کر لگا کہ انسان خواہ چاند پر پہنچ جائے مگر اپنی خاک قباء کے اندر بالکل ایک جیسا ہی ہے۔رؤف خیر صاحب کا ''ایک گمشدہ تلاش'' پڑھ کر تکلیف ہوئی۔اگر چہ جناب انل ٹھکر کی شخصی کبھی گم ہونے والی نہیں ہے۔ان کا نگارشات رہتی دنیا تک ادبی تاریخ کے اوراق میں تابندہ رہیں گی۔رؤف صاحب نے انل ٹھکر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی صراحت سے پیش کیا ہے۔قابل مبارک باد نہیں رؤف صاحب کہ انہوں نے بھر پورخراج عقیدت پیش کی ہے اور بہت اہم معلومات فراہم کی ہیں۔''ماریا'' اور ''ٹھنگ ایلس'' اچھے افسانے ہیں۔دیپک کنول صاحب نے فلمی ہیرو پردیپ کمار کی زندگی کے ہر پہلو کو قارئین کے لیے آئینے کی طرح پیش کیا۔میں مبارک باد پیش کرتی ہوں یہ سلسلہ چلنا چاہیے۔

قمر جمالی (حیدرآباد، دکن)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب۔

چہارسو کے تین دہائیوں کے کامیاب سفر میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہوگا کہ رسالے کی ہارڈ کاپی منظر عام پر نہ آسکی لہٰذا ہمیں سافٹ کاپی پر ہی گزارا کرنا پڑا۔بہرحال، پھر بھی شکر ہے کہ ایسے حالات میں بھی رسالہ وقت پر منظر عام پر آ گیا یقیناً اس میں آپ کی محنت اور عقیدت شامل ہے۔

ایک عرصے سے ڈاکٹر نواز دیوبندی صاحب کو سنتے آئے ہیں۔پسندیدہ شاعر ہیں مگر اُن کے کام کی تفصیلات قرطاسِ اعزاز سے ہی حاصل ہوئیں۔براہِ راست کے دلچسپ سوالات نے اُن کی زندگی اور اُن کے خیالات سے آگاہ کیا۔بے حد شکریہ۔

افسانے سبھی دلچسپ ہیں۔شموئل احمد کا افسانہ ظلمت کدے میں بہت ہی زبردست افسانہ ہے۔دیر تک اس کے سحر میں جکڑی رہی۔رضیہ اسماعیل صاحبہ کا افسانہ بھی دلچسپ ہے۔اندازِ بیاں بہت پسند آیا۔آصف خورشید صاحب نے کورونا پر عمدہ افسانہ لکھا۔موجودہ صورت حال کی عکاسی خوب کی۔''ماریا'' افسانہ پسند آیا حقیقت کے قریب ہے مگر اس کا اختتام صرف احساس پر مبنی اور حقیقت سے دور محسوس ہوا۔مشتاق اعظمی صاحب کے افسانے کے اختتام نے کہانی کو اور خوبصورت بنا دیا۔قمر جمالی صاحبہ، ڈاکٹر ذاکر فیضی صاحب اور ندیم صاحب کے افسانے زندگی کی تلخ حقیقت کا خوبصورت بیان ہیں۔''ذلتوں کی اندھیری رات'' کا اختتام بھی سماج پر زبردست تھپڑ ہے۔

''اور سب چاند ہو گئے'' بالکل الگ کیٹگری میں آتا ہے۔افسانہ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مغربی افسانہ ہم سے بہت آگے ہے۔اُن کے معیار پہنچنے کے لیے ہمیں بڑا وقت لگے گا۔بہت عمدہ کہانی اور ترجمہ بھی زبردست۔ایک گمشدہ شناخت میں رؤف خیر نے انل ٹھکر صاحب کے ادبی کارناموں کا تفصیل سے ذکر کر کے بہترین ادیب اور سچے انسان کو اچھی خراجِ عقیدت پیش کی ہے۔

ایک صدی کا قصہ پڑھ کر تشنگی رہ گئی۔پردیپ کمار کی زندگی کے اُن پہلوؤں سے دیپک جی وابستہ نہیں کرا سکے جنہیں لوگ جانتے نہیں تھے۔اُن کی ذاتی زندگی کے متعلق اُن کی شریک حیات کے بارے میں بھی کچھ ذکر ہونا چاہیے تھا۔فلرز کا آپ کا انتخاب اچھا ہوتا ہے۔رومی کے اقوال پسند آئے۔

اس بار نظموں کے حصے میں کورونا کا درد زیادہ آیا۔یہ اس صدی کا سب سے بڑا سانحہ ہے اور موجودہ وقت پر اس پر قلم اٹھانا بنتا ہے۔حسبِ معمول غزلوں کو تو گھونٹ گھونٹ پی کر اُس کا لطف لیا جا رہا ہے۔دعا کرتی ہوں کہ آئندہ شمارے تک صورت حال ٹھیک ہو جائے اور رسالہ پہلے کی طرح ہمارے ہاتھوں میں ہو۔پرماتما اہل دنیا کو اور آپ کو بھی اس نامراد وبا کے عذاب سے پاک رکھے۔(آمین)

رینو بہل (چنڈی گڑھ)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کے ''ڈاکٹر نواز دیوبندی نمبر'' میں آپ نے ڈاکٹر صاحب کی نسبت اس قدر عمدہ معلومات، کلام اور انٹرویو کے ذریعے قاری کو نایاب تحفہ فراہم کیا ہے۔میری خوشی دو چند ہونے کا سبب یہ بھی ہے کہ میرے افسانے ''ذلتوں کی اندھیری رات'' کا نہ صرف قارئین چہارسو نے نوٹس لیا بلکہ ڈاکٹر رؤف خیر، ڈاکٹر عارفہ مسرور، الیاس انجم، ڈاکٹر ذاکر فیضی، ڈاکٹر رینو بہل، مشیر امروہوی، ناصر امروہوی، سرسعید ایڈیٹر ادبی محاذ، ڈاکٹر عبید اللہ چودھری، اثر ٹانڈوی، ڈاکٹر قمر علی، قمر قدیر ارم، اویس شمسی دیگر بہت سے محبان اردو نے افسانہ ہذا کی پسندیدگی کا اظہار کیا۔۔۔

ندیم راعی (مرادآباد)

مکرمی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کا عذرا اصغر نمبر نظر نواز ہوا۔کڑے حالات میں آپ نے اہل ادب کو چہارسو کی شکل میں جو حوصلہ اور توانائی بہم پہنچائی ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔مجھے یقین ہے کہ اسی وجہ سے کسی بھی شاعر اور ادیب نے کرونا جیسے خطرناک دشمن سے شکست نہیں کھائی۔خدا سب کو محفوظ رکھے (آمین)۔براہِ راست میں پوچھے گئے بعض سوالات تاریخی نوعیت کے تھے جن کے جوابات کی وساطت سے تقسیم سے قبل اور فوراً بعد کے حالات سے آگاہی ہوئی۔زیرنظر اشاعت میں عذرا صاحبہ کا افسانہ لائق توجہ ہے میں اُن کی تحریر بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔مقالہ نگاروں نے بھی اُن کی شخصیت اور فن کو بھرپور طریقے سے موضوعِ سخن بنایا ہے جس کی اُن کی شخصیت نمایاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

...... عالمی کہانیاں ......

ظفر قریشی پاکستان کے ایک ممتاز ادیب اور صحافی ہیں جو کم وبیش تین عشروں سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ان کی ایک خوبی انگریزی،اردو تراجم کی ناقابلِ تقلید صلاحیت ہے۔زیرِ تبصرہ کتاب ''عالمی کہانیاں'' اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ پندرہ افسانوں،ناولٹس پر مشتمل ہے جن کا تعلق مختلف ممالک سے ہے لیکن ظفر قریشی صاحب نے انہیں انگریزی سے ترجمہ کیا ہے اور اتنی مہارت سے کیا ہے کہ پڑھتے ہوئے ترجمے کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔کہانیوں کا انتخاب بھی خوب ہے۔ یہ زیادہ تر سماجی اور معاشرتی مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔ان میں رومانس کی لہر بھی ہے اور جنس (Sex) کے جلوے بھی۔لیکن کہیں کہیں سیاست کا رنگ بھی ہے اور تجسس کا عنصر تو اکثر کہانیوں میں غالب ہے۔مترجم کی زبان صاف،سادہ اور پاکستانی محاورے کی ہے جس سے ان کی جڑوں (Roots) کا اندازہ ہوتا ہے۔اگرچہ یہ بین الاقوامی کہانیاں ہیں لیکن بیشتر میں فضا مشرقی ہے اور مکالمے بھی مانوس لہجے کے ہیں۔اس لیے انہیں دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ان کہانیوں کی ایک اہم خوبی ماحول سازی ہے۔پلاٹ کا ہر اہم موڑ ایک مکمل اور قابلِ فہم تناظر میں قاری کے سامنے آتا ہے۔چنانچہ اس کا انہاک برقرار رہتا ہے۔

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

اشاعت:۲۰۲۰ء، قیمت:۱۰۰۰روپے، دستیابی:فضلی سنز،اردو بازار،کراچی۔

...... شہرِ ہزار در ......

رومانہ رومی خاص طور پر رومانی غزل کی شاعرہ ہیں۔محبوب کا جذباتی تصور اور ہجر و وصال کے منظر جیسی کیفیات کو شعروں کی تصویر میں ڈھال دینا جان جوکھوں کا کام ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں اس لیے ذہانت،تخلیقی صلاحیت اور قوتِ متخیلہ ہونے کے ساتھ عرق ریزی کے اوصاف بھی درکار ہوتے ہیں۔انہوں نے جدید روایت کا خیال رکھتے ہوئے نہایت پر اثر الفاظ میں مشرقی حسن اور حیا کے دائرہ میں رہتے ہوئے عورت کے جذبات و احساسات اور مسائل کو اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے۔رومانہ رومی کی شاعری رومانی اور نسائی جذبات سے عبارت ہے اور منفرد اندازِ بیان میں صنفِ نازک کے جذبۂ محبت، وفا، ایثار کے ساتھ ساتھ ہجر اور وصال کی کیفیات کو جس شگفتگی سے تحریر کیا گیا ہے قابلِ تحسین ہے۔رومانہ رومی نے جہاں اپنے احساسات، جذبات اور تخیلات کو شاعری کے رنگ میں پیش کیا ہے وہاں اُن کی اس خوبی کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ وہ جگ بیتی کو آپ بیتی کے روپ میں پیش کرنے کے ہنر سے بخوبی آشنا ہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد

اشاعت:۲۰۲۰ء، قیمت:۵۰۰، دستیابی:الحمد پبلی کیشنز،کراچی۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
اقبال کے عرفانی زاویے
مجموعۂ مضامین
ڈاکٹر سید تقی عابدی